تاریخ حدیث و محدثین

تالیف

الاستاذ محمد محمد ابو زہرہ

ناشران قرآن لمیٹڈ لاہور

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیثِ مصطفیٰ بر جانِ مسلم داشتن

العلم ما کان فیہ قال حدثنا
وما سوی ذاک وسواس الشیاطین

تاریخ حدیث و محدثین

حدیث پر قیمتی مباحث ○ مقامِ حدیث ○ حدیث بحیثیت تفسیرِ قرآن
تاریخِ تدوینِ حدیث ○ منکرینِ سنت کے شبہات کا ازالہ

محدثینِ کرام کی خدماتِ جلیلہ

تالیف: الاستاذ محمد محمد ابوزہو، از علمائے جامعہ ازہر
کلیہ اصول الدین قاہرہ

ترجمانی وتفہیم: غلام احمد حریری ایم اے (عربی) ایم اے علومِ اسلامیہ
ایم اے، او، ایل (عربی) فاضل السنہ شرقیہ، فاضل درسِ نظامی

ناشران قرآن لمیٹڈ ـ اردو بازار، لاہور

تالیف	استاد محمد محمد ابو زھرہ
ترجمہ	پروفیسر غلام احمد حریری لائل پوری
مطبع	مسلم پرنٹنگ پریس لاہور
ناشر	ناشران قرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 114161
MAILSI

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
تقدمۃ التعارف (مترجم)	۱۱	مسلک کے خلاف پائے تو وہ	
مقدمہ (مصنف)	۱۸	کیا کرے۔	
سُنّت کا لغوی مفہوم	۱۸	ترک تقلید سے متعلق ائمہ اربعہ کے اقوال	۵۰
سُنّت کا اصطلاحی مفہوم	۱۹	اتباعِ حدیث و ترک اقوالِ ائمہ	۵۴
سُنّت وحی پر مبنی ہے	۲۱	حدیث تفسیر قرآن ہے	۵۸
وحی اور اقسام وحی	۲۲	حدیث کی اقسام اربعہ	۵۸
وحی مَتْلُوّ	۲۵	آیا حدیث مستقل ماخذ تشریع ہے؟	۶۱
وحی غیر مَتْلُوّ	۲۶	بیان بطریق الحاق	۶۲
حدیث قدسی	۲۸	بیان بطریق قیاس	۶۴
سنت کی شرعی حیثیت	۳۲	بیان بطریق استنباط	۶۵
حدیث کا وجوب اتباع	۳۲	حدیث نبویؐ مختلف ادوار میں	۷۰
منکرینِ حجیتِ حدیث کی تردید	۳۴	حفاظتِ حدیث میں صحابہ کا کردار	۷۰
اخبار آحاد کے منکرین پر نقد و جرح	۳۹	سرور کائناتؐ کی علمی مجالس	۷۶
ثقہ راوی سے منقول خبر واحد واجب العمل ہے	۴۰	اخذ حدیث کے سلسلہ میں صحابہ کا طرز	۷۹
بعض احادیث پر ترکِ عمل کے وجوہ	۴۳	و انداز	
جب ایک مسلم کسی حدیث کو اپنے	۴۹	اشاعت حدیث میں خواتین کا حصہ	۸۱

حدیث کی اشاعت میں قبائلی وفود کا کردار — ۸۳
مدینہ پہنچنے والے قبائلی وفود — ۸۵
اشاعتِ حدیث میں حجۃ الوداع کے اثرات — ۹۱

دوسرا دور — ۹۲

حدیث نبوی خلافت راشدہ میں — ۹۲
خلافتِ راشدہ کے سیاسی حالات — ۹۲
روایت حدیث میں صحابہ کا طرز و منہاج — ۹۴
صحابہؓ کو تقلیل روایت کا حکم — ۹۶
روایت حدیث میں حزم و احتیاط — ۹۹
عسیر الفہم احادیث روایت کرنے کی ممانعت — ۱۰۳
صحابہؓ کے طرز روایت پر اعتراض اور اس کا جواب — ۱۰۶
اس بات کی تردید کہ صحابہ خبر واحد پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ — ۱۱۲

تیسرا دور

حدیث خلافت راشدہ کے بعد تا اختتام پہلی صدی ہجری۔ — ۱۱۵

اسلامی فرقوں کا ظہور و شیوع — ۱۱۵
خوارج شیعہ و جمہور — ۱۱۷
خوارج کے عام نظریات — ۱۱۹
فقہ الخوارج — ۱۲۳
خوارج اور وضعِ حدیث — ۱۲۴
شیعہ اور ان کے افکار و معتقدات — ۱۲۵
حدیث نبویؐ پر تشیع کے اثرات — ۱۲۹
شیعہ کی دروغ بافی — ۱۳۱
حضرت علیؓ کی جانب سے شیعی اکاذیب کی تردید — ۱۳۳
شیعہ کی ملمع سازی — ۱۳۷
حدیث کی جمع و تدوین میں صحابہ و تابعین کی مساعی جمیلہ — ۱۴۰
اسلامی فتوحات کی وسعت — ۱۴۳
بلاد مختلفہ میں دار الحدیث — ۱۴۴
دار الحدیث مکہ مکرمہ — ۱۴۵
دار الحدیث کوفہ — ۱۴۶
دار الحدیث بصرہ — ۱۴۷
دار الحدیث شام — ۱۴۸
دار الحدیث مصر — ۱۵۰
طلب حدیث میں علما کے سفر — ۱۵۲

طلب حدیث کے لیے سفر کی ضرورت	۱۵۳
حدیث کی چھان بین پر رحلت کے اثرات	۱۵۴
روایت حدیث کی اشاعت پر رحلت کے اثرات	۱۵۹
حدیث میں دروغ گوئی کا آغاز	۱۶۰
کتابتِ حدیث	۱۶۷
رسول کریمؐ اور اشاعتِ کتابت	۱۶۹
کیا قرآن کی طرح حدیث کی کتابت بھی عہدِ رسالت میں ہی شروع ہو گئی تھی؟	۱۷۰
منع و جوازِ کتابت کی احادیث میں تطبیق	۱۷۲
عہدِ رسالت کے بعد کتابت حدیث	۱۷۴
اولین خلیفہ جس نے تدوین سنت کا آغاز کیا	۱۷۷
مشاہیر صحابہ کا تعارف	۱۸۰
صحابی کون ہے؟	۱۸۰
صحابی کی پہچان	۱۸۱
عدالت صحابہؓ پر اجماع	۱۸۲
صحابہؓ کی تعداد	۱۸۳
حضرت ابوہریرہؓ	۱۸۴
حضرت ابوسعید خدریؓ	۱۸۷
حضرت انس بن مالکؓ	۱۸۹
حضرت عائشہ صدیقہؓ	۱۹۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۱۹۱
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۱۹۴
حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ	۱۹۶
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	۱۹۸
روایت حدیث میں صحابہ میں فرق مراتب	۲۰۱
کثیر الروایۃ صحابہؓ	۲۰۳
عدالت صحابہؓ میں وارد شدہ اعتراضات	۲۰۵
اور ان کا جواب	
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور حضرت ابوہریرہ	۲۲۱
اتہامات کی حقیقت	۲۲۲
محدث حاکم و ابوہریرہ	۲۳۰
اکابر تابعین کا تعارف	۲۳۴
تابعی کی تعریف	۲۳۴
تابعین مدینہ	۲۳۵
ابن شہاب زہریؒ	۲۳۶
عکرمہ مولیٰ ابن عباسؒ	۲۳۷
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ	۲۴۲

کعب الاحبار ۲۴۴
وہب بن منبہ ۲۴۸
اسرائیلیات ۲۵۱
سعید بن المسیب ۲۶۱
عروہ بن زبیر ۲۶۲
نافع مولیٰ ابن عمر ۲۶۳
ابراہیم نخعی ۲۶۷
علقمہ ۲۶۸
پہلی صدی ہجری میں کتابتِ حدیث ۲۷۰
پر اعتراضات اور ان کی تردید
روایت بالمعنیٰ پر اعتراض ۲۷۰
سید رشید رضا کا موقف ۲۹۶
ابوہریرہ کی روایات پر اعتراض ۳۰۱
صحیفہ علی و کتاب عمرو بن حزم ۳۰۲
چوتھا دور ۳۲۴
حدیث دوسری صدی ہجری میں
اس عصر میں تدوین حدیث اور ۳۲۴
مشہور کتب مؤلفہ
موطا امام مالک ۳۲۷
احادیث موطا کا درجہ ۳۲۸
احادیث موطا کی تعداد ۳۳۰
شروح موطا ۳۳۳
موطا کی اہمیت ۳۳۵
امام مالکؒ محدث نہ تھے؟ ۳۳۶
اس بات کی تردید کہ موطا حدیث کی ۳۳۷
کتاب نہیں
اس عصر میں وضع حدیث کا آغاز ۳۴۵
وضاعین سے علما کا مقابلہ ۳۵۴
دوسری صدی ہجری میں حجیتِ ۳۶۱
سنت میں نزاع
امام شافعی اور منکر حدیث کا مناظرہ ۳۶۲
حجیتِ خبرِ واحد پر امام شافعی کا استدلال ۳۷۰
خبرِ واحد کے قبول کرنے میں احتیاط ۳۷۳
قبولیتِ خبرِ واحد کے شرائط ۳۷۴
امام ابوحنیفہؒ کی حدیث دانی ۳۷۷
دوسری صدی ہجری کے محدثین کا تعارف ۳۸۲
امام مالک ۳۸۲
یحییٰ بن سعید القطان ۳۸۷
وکیع بن الجراح ۳۸۸
سفیان ثوری ۳۸۹
سفیان بن عیینہ ۳۹۱
شعبہ بن الحجاج ۳۹۲

اوزاعی	۳۹۵
امام شافعی	۳۹۸
حدیث نبوی سے امام شافعی کا شغف	۴۰۰
مستشرقین کی فریب کاری کا ابطال	۴۰۴
پانچواں دور — حدیث نبوی تیسری صدی ہجری میں	۴۲۳
خلق قرآن کا ابتلا	۴۲۸
عقیدہ خلق قرآن سے خلیفہ واثق کا رجوع	۴۳۰
خلیفہ متوکل ناصر السنّۃ	۴۳۱
متکلّمین کی جانب سے اہل الحدیث کی تحقیر	۴۳۲
مستشرقین کی علمی خیانت	۴۳۶
مسئلہ خلق قرآن کی حقیقت	۴۴۳
عقیدہ خلق قرآن کے اثرات و نتائج	۴۴۵
وضع حدیث میں گمراہ فرقوں کی چابکدستی	۴۴۸
قومی تعصب اور وضع حدیث پر اس کے اثرات	۴۴۹
شعوبیت کے حدیث پر اثرات	۴۵۰
امام ابوحنیفہ کی مدح میں احادیث وضع	۴۵۲
زندقہ اور وضع حدیث پر اس کے اثرات	۴۵۳
زنادقہ کی احادیث موضوعہ	۴۵۴
عباسی خلفا کی زنادقہ کے خلاف معرکہ آرائی	۴۵۶
قصہ گوئی کا فن اور حدیث پر اس کے اثرات	۴۵۷
اس دور کے مشہور ائمہ حدیث کا تعارف	۴۶۱
علی بن المدینی	۴۶۱
یحییٰ بن معین	۴۶۲
ابوبکر بن ابی شیبہ	۴۶۴
ابوزُرعہ رازی	۴۶۵
ابوحاتم رازی	۴۶۶
محمد بن جریر طبری	۴۶۶
ابن خزیمہ	۴۶۷
محمد بن سعد کاتب الواقدی	۴۶۹
اسحاق بن راہویہ	۴۷۱
امام احمد بن حنبل	۴۷۳
امام بخاری	۴۷۵
ترمذی	۴۸۵
امام ابن ماجہ	۴۸۷

امام ابن قتیبہ	۴۷۴
امام مسلم بن حجاج	۴۸۰
امام نسائی	۴۸۱
امام ابوداؤد	۴۸۴
تدوین حدیث میں محدثین کی سرگرمی	۴۹۰
تاویل مختلف الحدیث	۴۹۵
مسند امام احمد	۴۹۸
احادیث مسند کا درجہ	۵۰۱
مسند احمد کے ساتھ امت کا اعتنا	۵۰۶
صحیح بخاری	۵۰۹
صحیح مسلم	۵۱۴
صحیح بخاری و مسلم کے شروط	۵۱۶
کیا صحیحین کی احادیث یقین سے ثابت ہیں یا ظن سے ؟	۵۳۲
شیخین پر نقد و جرح	۵۳۵
صحیحین کے مستخرجات	۵۴۲
مستخرجات صحیح بخاری	۵۴۳
مستخرجات صحیح مسلم	۵۴۳
کتب مستخرجہ سے روایت کا حکم	۵۴۴
مستخرجات کے فوائد	۵۴۵
مستخرج علی الصحیحین کی زیادت کا حکم	۵۴۶
مستدرکات علی الصحیحین	۵۴۷
سنن نسائی	۵۵۰
نسائی کے شرائط	۵۵۰
سنن ابی داؤد	۵۵۱
ابوداؤد کی احادیث کا درجہ اور شرائط	۵۵۳
شروح و مختصرات	۵۵۶
جامع ترمذی	۵۵۷
جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد اور نسائی کا موازنہ	۵۵۹
ترمذی کی شروح	۵۶۰
سنن ابی ماجہ	۵۶۱
چھٹا دور	۵۶۵
اس دور کے سیاسی حالات	۵۶۵
سنت چوتھی صدی ہجری میں	۵۶۷
امام حاکم	۵۶۸
دارقطنی	۵۶۹
ابن حبان	۵۷۰
طبرانی	۵۷۳
قاسم بن اصبغ	۵۷۴
ابن السکن	۵۷۴

ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی	۵۷۵
سنت چوتھی صدی کے بعد تا	۵۷۶
سقوط بغداد	
جمع بین الصحیحین	۵۷۶
مجموعہ صحاح ستہ	۵۷۶
مجموعہ ہائے احادیث مختلفہ	۵۷۸
احادیث احکام پر مشتمل کتب	۵۷۹
کتب الاطراف	۵۸۱
ساتواں دور	۵۸۲
از سقوط بغداد تا عصر حاضر	
اس عہد کے سیاسی حالات	۵۸۲
اس دور میں روایت حدیث کا طرز و انداز	۵۸۴
بلاد اسلامیہ میں حدیث کے ساتھ مسلمانوں کا اعتنا	۵۸۶
حدیث نبوی کے سلسلہ میں مصر کی خدمات جلیلہ	۵۸۸
ارض ہند و پاک برائے اشاعت حدیث	۵۸۸
سعودی عرب میں علمی تحریک	۵۹۰
اس دور کے علما کا انداز تصنیف	۵۹۲
کتب الزوائد	۵۹۲
الجوامع العامۃ	۵۹۴
کتب جامع احادیث احکام	۵۹۵
علمی کتب میں مندرج احادیث کی تخریج	۵۹۶
زبان زد عام احادیث کی تخریج	۶۰۰
کتب الاطراف	۶۰۱
خاتمۃ الکتاب	۶۰۴
علم الجرح والتعدیل	۶۰۵
کتب الثقات	۶۱۳
کتب الضعفاء	۶۱۴
ثقات وضعفا پر مشتمل کتب	۶۱۵
علم معرفۃ الصحابۃ	۶۱۶
علم تاریخ الرواۃ	۶۱۸
نام کنیت اور لقب کی پہچان	۶۲۲
ان راویوں کے اسما پر مشتمل کتب جو اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں	۶۲۳
القاب پر مشتمل کتب	۶۲۴
المتفق والمفترق	۶۲۵
المؤتلف والمختلف	۶۲۵
المتشابہ	۶۲۷
علم تاویل مشکل الحدیث	۶۲۸
معرفۃ الناسخ والمنسوخ	۶۲۹

معرفۃ غریب الحدیث	۶۳۱	علم اصول الروایۃ	۶۴۹
معرفۃ علل الحدیث	۶۳۶	تعریف	۶۴۹
معرفۃ الموضوعات	۶۳۸	ابتدا و ارتقا	۶۵۰
موضوعات کا بیان و محاربہ وضاعین	۶۴۷	اصول الروایۃ پر مشتمل اہم کتب	۶۵۲

پیش لفظ

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

امّا بعد

اَرضِ پاک کا یہ ٹکڑا بڑے ارمانوں اور بڑی اُمنگوں کے ساتھ اس لیے حاصل کیا گیا تھا کہ اس کو دین اسلام کی تجربہ گاہ بنایا جائے گا۔ اور خلافت راشدہ کے زرّین دَور کے بعد ایک دفعہ پھر دین اسلام کو بحیثیت مجموعی اس کی اصلی صورت میں جلوہ گر ہونے کا موقعہ دیا جائے گا۔ مگر صد حیف کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ہر آنے والی حکومت اسلام کے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ مسندِ حکومت پر فائز ہوئی مگر آخر کار "طبلِ بلند بانگ و در باطن ہیچ" کے مصداق اقامتِ دین کے سلسلہ میں کچھ نہ کرسکی۔

انگریز کے دَور غلامی میں اسلامی شعائر و اقدار کی جو تکریم مسلمانوں میں موجود تھی، اگر قیام پاکستان کے بعد بھی مسلمانوں میں موجود رہتی تو بسا غنیمت تھی۔ مگر افسوس کہ وہ بھی رخصت ہوئی۔ اب تو عالم یہ ہے کہ دینی اقدار کا کھلا مذاق اڑایا جاتا ہے اور دین کے ساتھ تمسخر و تضحیک نے ایک فیشن کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ایسے میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کے مجموعہ "حدیث نبویؐ" کو بازیچۂ طفلاں نہ بنایا جاتا۔ یہ اسی لادینی ماحول کی دی ہوئی جرأت و جسارت کا نتیجہ ہے کہ ایسے لوگ بھی سُنّتِ رسولؐ کو نقد و جرح کے تیروں سے گھائل کرنے لگ گئے۔ جنہوں نے زندگی بھر حدیث کا ایک سبق کسی استاد الحدیث سے نہیں پڑھا تھا اور جن کی ساری عمر انگریز کی غلامی میں سیکرٹریٹ کے فائلوں کی ورق گردانی کی نذر ہوئی۔

منکرین حدیث کی انفرادی کوششیں ہی "تنقید حدیث" میں کچھ کم نہ تھیں۔ مگر

پاکستان میں قدم جمانے والی ہر حکومت بھی درمے دامے قدمے سخنے اس ٹولہ کا ساتھ دیتی رہی اور اس "کارِ خیر" میں برابر کی شریک و سہیم رہی۔ چنانچہ حدیث پر نقد و جرح کے لیے خصوصی ادارے قائم کیے گئے۔ اور ان پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے رہے۔ حتیٰ کہ مستشرقین کے ساختہ پرداختہ بڑے بڑے جغادری منکرین اسلام کو درآمد کرنے سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ کسی پاکستانی حکومت نے آج تک پاکستان میں کسی دینی ادارہ کی سرپرستی نہیں کی۔ مگر تخریبی اساس پہ استوار کیے جانے والے ان اداروں کو بدستور نوازا جا رہا ہے۔

الحمد للہ کہ حکومت کے ان عزائم قبیحہ کے عین برعکس ملّتِ اسلامیہ حبِ اسلام کے جذبہ سے سرشار رہی۔ اور حکومت کی ان مساعی کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔ چنانچہ اس درآمد کردہ برگشتۂ اسلام کے خلاف زبردست صدائے احتجاج اٹھی اور حکومت اس کو چلتا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ حکومت کی قائم کردہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نیم سرکاری ادارہ ثقافت اور طلوع اسلام لاہور نے انکار حدیث کی تائید میں جو لٹریچر شائع کیا تھا مسلمانوں میں اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ حدیث نبوی کی تائید و حمایت میں بڑی جاندار اور تحقیقی کتب شائع ہونے لگیں۔ مسلمان لاکھ بے عمل سہی مگر اپنی دینی اقدار و روایات کے خلاف کوئی بات سننا انہیں گوارا نہیں۔ اگر منکرین سنت حدیث نبوی پر نقد و جرح کا بیڑہ نہ اٹھاتے تو شاید ایسا قیمتی لٹریچر شائع نہ ہو سکتا۔

پروفیسر محمد محمد ابو زھو کلیہ اصول الدین الازہر یونیورسٹی کی کتاب "الحدیث والمحدثون" کا ترجمہ جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں وہ اسی بیش قیمت سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحب موصوف نے حدیث نبوی ؐ کی تائید و حمایت کا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ نے تاریخی ادوار کے اعتبار سے تدوین حدیث کی جو مفصل تاریخ بیان

کی ہے۔ اس سے ان تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے جو ہمارے ملک میں مستشرقین کے زلّہ ربا حدیث رسول پر وارد کرتے ہیں۔ اس میں ان کی اپنی محنت و کاوش کو کچھ دخل نہیں۔ یہ جملہ شکوک انہوں نے اپنے عیسائی اساتذہ سے اخذ کیے ہیں۔ اور ان تک یہ ہفوات پہنچانے میں مصر کے ڈاکٹر احمد امین علی حسن عبدالقادر اور محمود ابوریّہ نے وساطت کا فریضہ ادا کیا ہے۔

کتاب کا قاری اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر اپنے کو مجبور پائے گا کہ مصنف نے حمایت و صیانتِ حدیث کا حق ادا کر دیا ہے اور حدیث نبویؐ کے کسی گوشے کو زاویۂ خمول میں نہیں رہنے دیا۔ عہدِ رسالت سے لے کر عصرِ حاضر تک حدیث پر جو کام ہوا ہے مصنف نے اس کو تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ نے حدیث نبویؐ کے ساتھ کس حد تک اعتنا کیا ہے مسلمان اس پر جتنا فخر کریں، کم ہے کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے کسی لمحہ کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ کون ہے جو اس ضمن میں مسلمانوں کا حریف ہو سکے؟ مگر اس کا کیا علاج کہ اپنے ہی اس بلند پایہ قصر اسلام کو ڈھانے پر تل جائیں۔ وہ لاکھ سر ماریں، اپنی بد طینتی کے اظہار کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ۔

مصنف نے جو کچھ کہا میں نے اپنے الفاظ میں اس کو آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میرا نہیں۔ میری کاوش کا حاصل آپ کی نگاہ کے سامنے ہے۔ جو نیّت اس کام کی تکمیل میں کارفرما رہی ہے کچھ عجب نہیں، میری نجات کی موجب ہو جائے۔ نیک دُعا کی درخواست کے ساتھ آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ والسلام۔

خادم حدیث رسولؐ غلام احمد حریری — ڈی — ۶۱ پیپلز کالونی لائلپور ۳۱ $\frac{۳}{۶۵}$

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ بعثه الله رحمةً للعالمين وعلىٰ اٰله واصحابه والتابعين۔ الذين رفعوا منار الهدايته، وحملوا راية السنة، واعلوا شان الروايته واحاطوا احاديث نبيهم بسياج من الصيانته والرعايته فنفوا عنها تحريف الغالين، وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين۔

امّا بعد

خداوند کریم نے اپنے رسول جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسی کتاب مقدس نازل فرمائی جس میں آگے اور پیچھے کسی طرف سے بھی باطل کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اس عظیم کتاب کے ذریعے اللہ تعالیٰ رضائے الٰہی کے طالبوں کو امن و سلامتی کی راہ دکھاتا اور بحرِ ظلمات سے نکال کر نورِ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر گامزن کرتا ہے۔ اس کتاب کی شرح و توضیح کی ذمہ داری خداوند عزیز نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل ۴۴)

اور ہم نے آپ پر اس لیے قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لئے اس کو واضح کر دیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی شرح و توضیح کرتے ہوئے اپنی مرضی سے کام نہیں لیا۔

چنانچہ ارشاد فرمایا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ (النجم ۳) | وہ (ہمارا رسول) اپنی مرضی سے نہیں بولتا وہ تو صرف وحی ہے جو آپ کی طرف کی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی اطاعت کو ہمارے لیے واجب قرار دیا اور آپ کی نافرمانی سے ڈرایا۔ ارشاد فرمایا۔

وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (الحشر ۷) | اور (ہمارا رسول) جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس بات سے روکے اس سے رک جاؤ۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖ اَنْ تُصِیْبَھُمْ فِتْنَۃٌ اَوْ یُصِیْبَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (النور ۶۳) | جو لوگ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں انہیں اس بات سے ڈرتے رہنا چاہیئے مبادا وہ فتنہ کی لپیٹ میں آجائیں یا دردناک عذاب میں مبتلا ہو جائیں۔

خلاصہ یہ کہ کتاب و سنّت دونوں دین اسلام کی خشتِ اساس اور صراطِ مستقیم دکھانے والی مشعلِ نور ہیں۔

سنّتِ رسولؐ کے اسی منصب و مقام کے پیش نظر علمائے سلف اس کے قدر آشنا رہے۔ اس کی حفاظت و صیانت کا حق ادا کیا۔ اس کو سینوں اور سفینوں میں جگہ دی زندگی کے امور و افعال میں حدیث نبویؐ کو حکم قرار دیا۔ اس کو مضبوطی سے تھامے اور اس کی راہ پر رواں دواں رہے۔ ہر عہد و عصر کے علما نے علماً و عملاً حدیثِ رسول سے اعتنا کیا۔ آگے چل کر جب مسلمانوں میں ضعفِ ایمانی نمودار ہوا تو اِن اکابر کے جانشین ایسے نااہل لوگ ہوئے جنھوں نے حدیثِ رسول کو لائق اعتنا نہ سمجھا اور اس کی حفاظت سے قاصر رہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ حدیث نبوی کے فہم و ادراک سے بہرہ ور نہ ہو سکے۔ اور اس کی اسانید و متون سے یکسر بیگانہ تھے۔

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جن کا مذہب تحریف کی نذر ہو چکا ہے اور جو باطل کے پیرو ہیں، احادیث نبویہ پر طعن کرنے اور بھانت بھانت کی بولیاں بول کر ان کی تحقیر کا ارتکاب کرنے لگے۔ کسی نے یوں کہا کہ اب احادیث پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی سند کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ کسی نے کہا کہ سنت کو دائمی دین کی حیثیت حاصل نہیں۔ بعض نے کہا کہ اکثر احادیث واضعین کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ بعض نے صحابہ کو ہدفِ تنقید بنایا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے تاریخ کے مسلمہ حقائق کو مسخ کر کے حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا۔ بعض نے رُواۃ و رجال کی معمولی لغزشوں کو نمایاں کر کے رو ئی کا پہاڑ بنا دیا۔ اور اس طرح اس پاکیزہ ملت اور سنت مطہرہ کو اپنے زعمِ باطل سے رسوا کرنا چاہا۔ اور انواع و اقسام کے دیگر عیوب و مطاعن جو انہوں نے لوگوں میں پھیلائے۔

جب میں نے مستشرقین اور ان کے ہمنواؤں کے دجل و فریب اور بلا دلیل طعن و تشنیع کو دیکھا اور محسوس کیا کہ مسلمان خوابِ خرگوش میں مست ہیں اور اس کا کچھ نوٹس نہیں لے رہے تو میں نے حدیث و محدثین کی تاریخ پر ایک کتاب مرتب کرنے کی ٹھانی تاکہ اس بات کا پتہ چلے کہ کچھ فریب خوردہ لوگوں نے جس حقیقت کے حسن و جمال کو مسخ کر دیا ہے وہ دراصل ہے کیا چیز؟ اس طرح حق و باطل اور خطا و صواب نکھر کر سامنے آجائیں گے۔ اور میرا شمار — اِن شاء اللہ العزیز — ان لوگوں میں ہو گا جنہوں نے سنتِ رسول ؐ کا دفاع کر کے ایک عظیم جہاد میں حصہ لیا اور اس طرح نیکو کار مجاہدین کے زُمرہ میں شامل ہو گئے۔

چونکہ حدیث رسول ؐ مختلف و متباین مراحل و ادوار سے گزر چکی ہے اور اس کا تعلق متکثر و متعدد عصور و ازمنہ سے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر دور اور ہر عصر کی اپنی ایک جداگانہ خصوصیت ہے۔ اس لیے میں اس کتاب کو ایک مقدمہ،

ت ادوار ایک خاتمہ پر منقسم کرنا چاہتا ہوں۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مقدمہ:- اس میں بیان کیا جائے گا کہ سنّت کا معنی و مفہوم کیا ہے اور اس کو ن اسلام اور شرحِ قرآن کریم میں کیا مقام حاصل ہے۔

پہلا دور:- حدیث عہدِ رسالت میں۔

دوسرا دور:- حدیث خلافتِ راشدہ میں۔

تیسرا دور:- حدیث خلافت راشدہ کے بعد تا اختتام پہلی صدی ہجری۔

چوتھا دور:- حدیث دوسری صدی ہجری میں۔

پانچواں دور:- حدیث تیسری صدی ہجری میں۔

چھٹا دور:- حدیث چوتھی صدی ہجری کے آغاز سے تا سقوط بغداد (۶۵۶ھ)

ساتواں دور:- حدیث از ۶۵۶ھ تا عصرِ حاضر۔

خاتمہ:- انواع علم الحدیث۔

بارگاہِ ربانی میں دست بدعا ہوں کہ وہ ہمیں دین اسلام اور علم کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے۔ اور کتاب ہذا کو مقبول اور نافع بنائے۔ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلّم۔

مصنّف
پروفیسر محمد محمد ابو زہو
قاہرہ

مترجم
غلام احمد حریری
صدر شعبہ عربی و علوم اسلامیہ
اسلامیہ کالج لائلپور
یکم جنوری ۱۹۶۵ء

مقدمہ

یہ چار مباحث پر مشتمل ہے۔
مبحثِ اول :۔ سُنّت کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم۔
مبحثِ دوم :۔ سُنّت وحی پر مبنی ہے۔
مبحث سوم :۔ سُنّت کی شرعی حیثیت۔
مبحث چہارم :۔ سُنّت شارح قرآن ہے۔

۱۔ سُنّت کا لغوی مفہوم : سنت کے لغوی معنی طریقہ کے ہیں۔ خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا۔ اس کی دلیل رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد ہے۔

مَن سنّ سنۃً حسنۃً فلہ اجرھا واجر مَن عمل بھا اِلٰی یوم القیامۃ ومن سنّ سنّۃ سیّئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا الٰی یوم القیامۃ۔ (صحیح مسلم)

جس نے اچھا طریقہ رائج کیا تو اسے اس کا اجر ملے گا اور ان لوگوں کا اجر جو قیامت تک اس پر عمل کریں گے۔ اور جس نے بُرا طریقہ جاری کیا تو اس پر اس کا گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا گناہ جو قیامت تک اس پر عمل کرتے رہیں گے۔

لسان العرب میں ہے۔
سُنّت طریقہ کو کہتے ہیں اچھا ہو یا بُرا۔ عربی محاورہ میں بولتے ہیں "سنَنت لکم سنۃ فاتبعوھا" (میں نے تمہارے لیے ایک طریقہ رائج کر دیا ہے۔ اس کی پیروی کیجیے)۔ حدیث میں فرمایا۔ "من سنّ سنۃ حسنۃ" (جس نے اچھا طریقہ جاری

کیا، جو شخص بھی پہلے پہل کوئی کام کرے اور اس کے بعد کوئی قوم اس پر عمل پیرا ہو، اس کو سنت کہا جاتا ہے۔

عربی کا مشہور شاعر نُصَیب کہتا ہے۔ ؎

کانّی سننت الحبّ اوّل عاشق

من النّاس اذا احببت من بینهم وحدی

(میں نے اولین عاشق ہونے کے اعتبار سے گویا محبّت کی سنّت کو ایجاد کیا۔ اس لیے کہ سب لوگوں میں سے میں نے ہی محبت کی راہ اختیار کی۔)

حدیث نبوی میں لفظ سنت اور اس کے مشتقّات کا بکثرت ذکر آیا ہے۔ سُنّت کے اصل معنی طریقہ اور چال ڈھال کے ہیں جب سُنّت کا لفظ شریعت میں بدوں کسی قید و شرط کے بولا جاتا ہے تو اس سے وہ فعل مقصود ہوتا ہے۔ جس کے کرنے کا حکم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہو یا اس سے منع کیا ہو۔ اور اس کا ذکر قرآنِ کریم میں نہ ہو۔ بنابریں کہا جاتا ہے کہ کتاب و سنت شرعی دلائل میں سے ہیں کتاب و سنت سے قرآن و حدیث مراد لیے جاتے ہیں۔" (لسان العرب)

سُنّت کا اصطلاحی مفہوم: شرعی علوم و فنون کے ماہرین کے نزدیک سُنّت کا لفظ مختلف معانی و مطالب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اختلاف ان کے فنّی رجحانات و میلانات پر مبنی ہے۔ چنانچہ اصولِ فقہ کے علماء شرعی دلائل سے بحث کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں محدثین کا نقطۂ نظر رسولِ اکرمؐ کی جانب منسوب اقوال کی چھان پھٹک ہے۔ فقہا کا مطمحِ نظر شرعی احکام کی تفصیل بیان کرنا ہے کہ آیا وہ فرض و واجب ہیں یا مندوب اور حرام و مکروہ۔ واعظین کا کام تمام شرعی اوامر و نواہی پر روشنی ڈالنا ہے۔ اسی اختلاف کی اساس پر لفظ سنت ان کے یہاں مختلف معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

بلکہ بعض اوقات ایک ہی فن کے علماء کے نزدیک لفظ سنّت کے اطلاق میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ علمائے اصول لفظِ سنّت کا اطلاق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور تقریرات پر کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں بعض علمائے اصول صحابہ کرام کے تعامل پر بھی لفظ سُنّت بولتے ہیں، خواہ وہ قرآن کریم یا نبی کریمؐ سے ثابت ہو یا نہ ہو۔ مثلاً قرآن کریم کی جمع و تدوین کو انہوں نے سُنّت قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل میں وہ آنحضور کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔

علیکم بسنّتی و سنّة الخلفاء الراشدین من بعدی ۔ (صحیح مسلم) (میری اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت کا دامن تھامے رہو۔)

محدثین کا ایک گروہ بھی اسی کا قائل ہے۔

۲۔ فقہاء کے نزدیک سُنّت سے "الطریقة المسلوکة فی الدین" (وہ دینی طریقہ جس پر چلا جائے) مراد ہے۔ قطع نظر اس سے کہ فرض ہو یا واجب ہو۔

۳۔ علمائے وعظ و ارشاد کی رائے میں سُنّت کا لفظ بدعت کی ضد ہے۔ چنانچہ جو شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر گام زن ہو۔ اس کو وہ "سنت پر عامل" قرار دیتے ہیں۔ خواہ اس کے معمولات کی صراحت قرآن کریم میں ہو یا نہ ہو۔ جس شخص کا طرز عمل اس کے خلاف ہو اس کو وہ بدعتی کہتے ہیں۔

۴۔ جمہور محدثین کے نزدیک سنت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال، تقریرات آپ کے اخلاق و عادات مغازی اور بعثت سے قبل کے حالات مثلاً غارِ حرا کی خلوت نشینی وغیرہا مراد ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت خدیجہؓ کا یہ ارشاد "کلّا واللّٰہ لا یخزیك اللّٰہ ابداً انّك لتصل الرحم الخ" (اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو رسوا نہ کرے گا۔ اس لیے کہ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں)

بھی حدیث ہے۔ اسی طرح قبل از بعثت حضورؐ کے اخلاقِ جلیلہ مثلاً امانت و دیانت اور دیگر صفات سب حدیث میں شامل ہیں۔ سُنت کا یہ مفہوم ان کے نزدیک حدیث کا مترادف ہے اور دونوں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا۔

۲۔ سُنّت وحی پر مبنی ہے

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ سُنت آنحضور صلی اللہ وسلم کی جانب منسوب اقوال وافعال اور تقریرات کو کہتے ہیں۔ یہ اس وحی کی ایک قسم ہے جو حضرت جبریل امین آنحضورؐ کے پاس لائے تھے۔ وحی کی دوسری قسم قرآن عزیز ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سنت وحی کی ایک قسم ہے۔ قرآن کریم سے بھی یہی مُستفاد ہوتا ہے۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ (النجم ۳)

اور وہ (ہمارا پیغمبر) اپنی مرضی سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو کی جاتی ہے۔

حدیثِ نبویؐ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

۱۔ حضرت مقدام بن مَعدیکرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا "آگاہ رہو کہ مجھے قرآن عزیز دیا گیا ہے اور اسی جیسی ایک اور چیز۔ عنقریب ایک شکم سیر آدمی مسند سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوگا اور یوں کہے گا کہ قرآن کا دامن تھامے رکھو۔ جس چیز کو اس میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جس کو حرام پاؤ اس کو حرام خیال کرو۔ خبردار رہو کہ جس چیز کو رسولؐ اللہ نے حرام ٹھہرایا ہو وہ خدا کی حرام کردہ اشیا کی مانند ہے۔ (ابو داؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ)۔

۲۔ حضرت حسّان ابن عطیہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جبریلؑ امین حضورؐ پر سُنّت لے کر اسی طرح نازل ہوتے جیسے قرآن لے کر۔ اور آپ کو اسی طرح سُنّت کی تعلیم دیتے جیسے قرآن کریم کی۔ (مراسیل ابی داؤد)

۲۔حضرت مکحول رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
"مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن دیا ہے اور اس سے دوچند حکمت بھی عطا کی ہے۔"
(مراسیل ابی داؤد)

چونکہ کتاب و سنت دونوں جڑواں بھائیوں کی طرح باہم وابستہ اور وحی الٰہی ہونے میں مساوی ہیں۔ اس لیے ہم وحی اور اس کی اقسام پر مختصراً تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ اور کتاب و سنت کا فرق و امتیاز کھل کر سامنے آ جائے۔ ملاحظہ فرمائیے:

وحی و اقسامِ وحی: لفظِ وحی دو معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔
۱۔ وحی کرنا (مصدری معنیٰ میں)
۲۔ وہ احکام جو بذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں (مصدر بمعنی اسم مفعول)

قسم اوّل: لفظ وحی کے مصدری معنیٰ کسی چیز کی خفیہ اور جلدی اطلاع دینے کے ہیں۔ چونکہ وحی کے لفظ میں اخفاد کا مفہوم شامل ہے۔ اس لیے اہل لغت کے نزدیک کتابت رمز و اشارہ اور خفیہ کلام سب وحی ہیں۔

شرعی اصطلاح میں وحی سے اللہ تعالیٰ کا انبیا کو بطریق خفیہ ان احکام و اخبار سے مطلع کرنا مراد ہے جس سے ان کو قطعی و یقینی علم حاصل ہو جائے کہ یہ احکام من جانب اللہ ہیں۔

اسی طرح وحی کا اصطلاحی مفہوم اپنے لغوی معنی کی نسبت اَخص ہے۔ اس لیے کہ وحی کا مصدر و ماخذ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اور اس کا مَورد انبیائے کرام ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذات باری اور انبیاء دونوں خاص ہیں۔

وحی بمعنی اول کی قسمیں: وحی بمعنی اول کی تین قسمیں ہیں، جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاۗئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاۗءُ۔ (الشوریٰ ۵۱)

کسی بشر کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہو مگر وحی کے ذریعے سے یا پسِ پردہ یا ایلچی بھیج کر اور وہ اس کے حکم سے جو چاہے وحی کرے۔

اس آیت میں بیان کردہ اقسام وحی کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ الہام: الہام کے معنی یہ ہیں کہ نبی کے دل پر کسی بات کا القاء اس یقین کے ساتھ کیا جائے کہ وہ من جانب اللہ ہے۔ یہ الہام بعض اوقات خواب میں ہوتا ہے اور گاہے جاگتے وقت۔ مذکورہ صدر آیت میں "اِلَّا وَحْيًا" کے الفاظ سے وحی کی یہی قسم مراد ہے۔

۲۔ پسِ پردہ کلام: اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی بوقت کلام اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھتا مگر اس کا کلام سنتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آغازِ رسالت میں اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ اچانک آپ نے آگ ملاحظہ کی اور اہلیہ کو مخاطب کر کے کہا۔

اُمْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا۔

ذرا ٹھہرئیے میں نے آگ دیکھی ہے۔

پھر فرمایا۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ۔

جب آگ کے پاس آئے تو ندا آئی میں تیرا رب ہوں۔

دوسرے موقع پر فرمایا۔

وَلَمَّا جَاۗءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ۔ (الاعراف ۱۴۳)

جب موسیٰ وقتِ مقررہ پر آئے اور ان کے رب نے ان سے کلام کیا تو کہا اے رب مجھے اپنا آپ دکھا میں تیری زیارت کرنا چاہتا ہوں۔

۳- بذریعہ فرشتہ: تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی کو جس بات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں خواب یا بیداری میں فرشتہ کے ذریعے سے اس کو مطلع کرتے ہیں۔ فرشتہ کے ذریعہ باخبر کرنے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ نبی بعض اوقات فرشتہ کو اس کی اصلی صورت میں دیکھتا ہے اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ یا وحی کے وقت فرشتہ انسانی شکل و صورت میں متشکّل ہو کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ جبریل اکثر حضرت دِحیہؓ صحابی رضی اللہ عنہ کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے۔ بعض اوقات نبی وحی کے وقت فرشتہ کو نہیں دیکھتا۔ ہوتا یوں ہے کہ وحی کے وقت بھنبھناہٹ اور شدید کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی ہے۔ اس کی حقیقت اور اس کا مصدر و ماخذ خدا ہی کو معلوم ہے۔

اندریں حالت آپؐ پر ایک روحانی کیفیت طاری ہو جاتی جس کے آپ عادی نہ تھے۔ حاضرینِ مجلس کو صرف ظاہری آثار و علامات کا احساس ہوتا۔ بدن مبارک بوجھل ہو جاتا اور پیشانی پسینہ سے شرابور ہو جاتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حارث بن ہشام نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، گاہے وحی کے وقت گھنٹی کی سی آواز آتی ہے۔ یہ مجھ پر سخت گراں گزرتی ہے۔ جب وحی کا سلسلہ رک جاتا ہے تو اس کے الفاظ میرے نوکِ زباں ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات فرشتہ انسانی صورت میں آکر مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور میں اس کے الفاظ کو یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ میرے دیکھتے شدید سردی کے موسم میں حضورؐ پر وحی نازل ہوتی اور جب وحی کا سلسلہ رُکتا تو آپ کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا ہوتا۔ (صحیح بخاری)

بعض اوقات وحی کی آمد کے وقت حضورؐ کے چہرہ مبارک کے نزدیک شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرہ کے نزدیک شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ

سُنی جاتی تھی۔ (ترمذی)

وحی بمعنی مُوحیٰ بہٖ: لفظ وحی کے دوسرے معنی کے اعتبار سے اس سے وہ احکام مراد ہوتے جو بذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں۔ گویا وحی کے معنی موحیٰ بہٖ کے ہیں۔ اس اعتبار سے وحی کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وحیِ مَتْلُو

۲۔ وحیِ غیر مَتْلُو

۱۔ وحیِ مَتْلُو: اس وحی سے قرآنِ عزیز مراد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالتِ صادقہ کی زندہ دلیل ہے اور جس کی حفاظت وصیانت کی ذمہ داری خود خداوند کریم نے لی ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر ۹) — بے شک ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

جبریل امین قرآن کے الفاظ ومعانی کو لے کر آنحضور پر نازل ہوتے۔ رسول کریمؐ ہوں یا جبریل امین، قرآن میں دخل اندازی کا حق کسی کو بھی حاصل نہ تھا۔ بلاشبہ یہ خداوند عزیز وحکیم کا نازل کردہ ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (الشعراء ۱۹۳) — یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے روح الامین اس کو لے کر اُترے۔

اس بات پر علماء کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ قرآن عزیز رسول اکرمؐ پر بواسطہ جبریل حالتِ بیداری میں اُترا۔ حالت خواب میں قرآن کا کوئی حصہ آپ پر نازل نہیں ہوا اور نہ ہی وحی کے کسی دوسرے طریقہ سے قرآن کا کوئی حصہ حضورؐ پہ نازل کیا گیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی کے دوسرے طریقوں میں شک وریب یا خلط و التباس کی کوئی گنجائش ہے، ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ وحی کے جملہ انواع بشمول حالتِ

بیداری و خواب یقینی وحتمی علم کے موجب ہیں کہ یہ خدا کا نازل کردہ ہے۔ انعقادِ اجماع کی وجہ یہ ہے کہ اسبابِ نزول کے سلسلہ میں واردشدہ احادیث و آثار سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حالتِ بیداری میں نازل ہُوا۔

اگر سوال کیا جائے کہ مسلم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ اکرمؐ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ اچانک اونگھنے لگے۔ پھر مسکراتے ہوئے سر اُٹھایا۔ ہم نے عرض کیا حضورؐ ہنسی کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا ابھی ابھی مجھ پر ایک سُورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے سُورۂ کوثر تلاوت فرمائی۔ اس حدیث سے معلوم ہُوا کہ سورۂ کوثر حالتِ خواب میں نازل ہوئی۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ حدیث میں حضورؐ کی جس اونگھ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے نیند مراد نہیں۔ بخلاف ازیں اس سے وحی کی شدت مراد ہے جو حضورؐ پر طاری ہُوا کرتی تھی۔ علماء نے ذکر کیا ہے کہ نزولِ وحی کے وقت یہ کیفیت آپ پر اس لیے طاری ہو جایا کرتی تھی تاکہ آپ دنیا سے غافل ہو جائیں روحانیت آپ کی بشریت پر غالب آجائے۔

قرآنِ عزیز کی یہ عظیم خصوصیت ہے کہ اس کی تلاوت نماز اور خارج از نماز دونوں حالتوں میں عبادت ہے۔ اس کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں۔ قرآنِ حکیم الفاظ و معانی دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (الاسراء ۸۸)	کہہ دیجیے کہ اگر انس و جنّ اکٹھے ہو کر قرآن کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لاسکیں گے وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔

۲۔ وحیِ غیر متلُو: سُنتِ نبویؐ کا تعلق وحی غیر متلُو (وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی ہ) کے ساتھ ہے۔ اس کی دلیل آیاتِ قرآنیہ "وَمَا يَنْطِقُ

عَنِ الْھَوٰی" اور "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ" اور دیگر نصوص ہیں۔
البتہ حدیث نبوی قرآن کریم سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے۔ جن میں سے مندرجہ ذیل اہم ہیں۔

۱۔ حدیث کے معانی و مطالب آنحضورؐ پر نازل ہوتے ہیں اور آپ ان کو اپنے الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔

۲۔ اسی کے پیش نظر علم الحدیث کے ماہر علما کی ایک جماعت کے نزدیک روایت بالمعنیٰ کرنے کا مجاز ہے۔

۳۔ حدیث کے الفاظ معجزہ نہیں اور نہ ہی ان کی تلاوت شامل عبادت ہے۔

۴۔ حدیث بذریعہ وحی حضور پر نازل ہوئی۔ یہ وحی حالت خواب و بیداری دونوں میں فرشتہ کی وساطت یا اس کے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی رہی۔

سنت کے جمیع اقسام مثلاً اقوال و افعال اور تقریرات کو وحی قرار دینے پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضورؐ کے لیے اجتہاد بھی روا تھا۔ اور آپ نے غزوات اور دیگر بکثرت مواقع پر اجتہاد فرمایا۔ پھر یہ بات کیونکر درست ہے کہ سُنّت کی تمام قسمیں وحی ہیں؟ مزید برآں جمیع اقسام سُنّت کو وحی قرار دینے کا یہ نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ آپ نے اپنی رائے اور فہم ثاقب سے کبھی گویا کام ہی نہیں لیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس موقع پر وحی نازل نہ ہوتی تھی آپ بتقضائے فطرت وہاں اپنی عقل سلیم سے کام لیتے تھے۔ مگر خداوند کریم آپ کو اس گومگو کی حالت میں مذبذب نہیں چھوڑ دیتے تھے۔ بخلاف ازیں خداوند کریم آپ کو اجتہاد کی درستی و نادرستی سے آگاہ فرما دیتے تھے۔ اگر آپ کا اجتہاد درست ہوتا تو اس پر قائم رہتے۔ ورنہ حسب وحی اپنی رائے کو تبدیل فرما لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کا وہ اجتہاد جس کی تائید من جانب اللہ

ہو چکی ہو، وحی کا درجہ رکھتا ہے۔ بنابریں اجتہادِ نبوی اور سُنّت کے وحی ہونے میں کسی قسم کا تناقض و تضاد نہیں پایا جاتا۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی درست نہیں کہ سُنّت کے وحی ہونے سے آپ کے خصائل و فضائل میں کسی قسم کی کمی آتی ہے بلکہ اس سے آپ کی عظمت و فضیلت میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔

حدیثِ قدسی: احادیث نبویہ کی ایک قسم وہ بھی ہے جو بطریق آحاد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اور اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب ہیں۔ ان کو "احادیث قدسیہ" "احادیث الٰہیہ" اور "احادیث ربّانیہ" کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ احادیث خدا تعالیٰ کا کلام ہیں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا؟ اور اگر یہ احادیث کلامِ الٰہی ہیں، تو آیا ان میں قرآنی خصوصیات پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث قدسیہ کے بارے میں علما کے دو اقوال ہیں۔

پہلا قول: احادیث قُدسیہ کلام الٰہی ہیں اور نبی کریمؐ ان کو اللہ تعالیٰ سے نقل و روایت کرتے ہیں۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ یہ احادیث اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب ہیں۔ اسی لیے ان کو "احادیث قدسیہ" "احادیث الٰہیہ" اور "احادیث ربّانیہ" وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر ان کے الفاظ حضور اکرمؐ کے ہوتے تو باقی احادیث کے برخلاف ان کو خداوند کریم کی جانب منسوب کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

۲۔ ان احادیث میں متکلم کی ضمیریں اللہ تعالیٰ کی جانب لوٹتی ہیں۔ مثلاً فرمایا "یاعبادی اِنّی حرّمت الظلم علیٰ نفسی" (اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام ٹھہرایا)۔ یہ ان کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے گزر کر ان احادیث کی نقل و روایت اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً راوی کہتا ہے "قال رسولُ اللّٰہ فی مایرویہ عن ربہ"

(رسول اللہ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کر کے فرمایا)۔

بعض اوقات راوی یوں کہتا ہے "قال اللہ نی ما روا ہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" (رسول اللہ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کر کے فرمایا)۔

اگر احادیث قدسیہ کے الفاظ حضور اکرم کے ہوتے تو دیگر احادیث کی طرح یہاں بھی روایت کا سلسلہ آپ کی ذات تک پہنچ کر ختم ہو جاتا اور اس کے خداوند کریم تک پہنچنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

اگرچہ علما کے اس قول کے مطابق احادیث قدسیہ کلام الٰہی ہیں۔ تاہم ان میں قرآن کریم کی خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔ قرآن کریم بطریق تواتر نقل ہو کر ہم تک پہنچا ہے۔ اس کے الفاظ و معانی معجز ہیں۔ اس کی تلاوت عبادت ہے۔ بے وضو شخص اس کو چھونے کا مجاز نہیں۔ جنبی کے لیے اس کی تلاوت حرام ہے۔ نماز میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس کی روایت بالمعنیٰ درست نہیں۔ قرآن کریم کی تمام سُوَر و آیات بذریعہ جبریل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئیں۔

مگر احادیث قدسیہ میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی۔ یہ احادیث بطریق احادیث نبی اکرم سے منقول ہیں اور آپ ان کو اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں۔ احادیث قدسیہ میں خداوند کریم کی عظمت و جلالت اس کی رحمت کی وسعت اور اس کے جُود و کرم کا ذکر ہوتا ہے۔ دیگر احادیث کی احادیث قدسیہ پر بھی نقد و جرح کی جا سکتی ہے۔ محدثین نے ان احادیث کو دیگر احادیث کے زُمرہ میں شامل کر کے اپنی کتب حدیث میں نقل کیا ہے۔ احادیث قدسیہ اپنے الفاظ کے اعتبار سے معجزہ نہیں۔ ان کی تلاوت کو عبادت کا درجہ حاصل نہیں۔ ان کو قرآن کے نام سے یاد نہیں کیا جا سکتا۔ احادیث قدسیہ میں وحی کے خاص طریقوں کی پابندی نہیں کی گئی۔ جو شخص احادیث کے الفاظ و معانی سے بخوبی آگاہ ہو۔ اس کے لیے ان کی

روایت بالمعنیٰ درست ہے۔

احادیث قدسیہ کے بارے میں علماء کا دوسرا قول یہ ہے کہ دیگر

دوسرا قول: احادیث کی طرح یہ احادیث بھی آنحضورؐ کے الفاظ پر مشتمل ہیں۔ علامہ ابوالبقاء کلیات میں رقمطراز ہیں۔

"قرآن کے الفاظ و معانی وحی جلی کے ذریعہ آنحضورؐ پر نازل ہوئے۔ جہاں تک حدیث قدسی کا تعلق ہے۔ اس کے الفاظ نبی کریمؐ کے ہوتے ہیں اور اس کا معنیٰ و مفہوم بذریعہ الہام یا خواب میں آپ پر القا ہوتا ہے۔

علامہ طیبی فرماتے ہیں۔

جبریل امین قرآن کے الفاظ لے کر حضورؐ پر نازل ہوتا ہے۔ بخلاف ازیں اللہ تعالیٰ بذریعہ الہام یا خواب میں آپ کو حدیث قدسی کے مفہوم سے آگاہ کرتا، پھر نبی کریمؐ اپنے الفاظ میں اُمت کو اس سے آگاہ کرتے۔ احادیث قدسیہ کے علاوہ دیگر احادیث اللہ تعالیٰ سے منقول اور منسوب نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کرنے میں یہ حکمت مضمر ہے کہ ان کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا جائے۔ اور ان کے معانی و آداب کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کی جائے۔

اس بات کی حکمت و مصلحت کہ وحی محمدی کا کچھ حصہ الفاظ میں نازل ہوا اور کچھ معانی میں: خداوندکریم نے اپنی عنایت خصوصی سے تمام شرائع سابقہ میں سے شریعت محمدیہ کو یہ عظیم خصوصیت بخشی کہ وہ تاقیام قیامت باقی رہے گی۔ قرآن کریم تاقیامت ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ و مصئون رہے گا۔ اور اس کی تلاوت و قرائت جاری رہے گی اس اعتبار سے یہ کتاب عظیم رسالت محمدیؐ کی زندۂ جاوید دلیل ہے اور خداوندکریم شریعت محمدی کا بہترین محافظ ہے۔

جس طرح خداوند کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو ایک ایسی کتاب کے ذریعے محفوظ کر دیا، جس میں آگے اور پیچھے کسی طرف سے بھی باطل رہ نہیں پا سکتا۔ اسی طرح اس نے مخلوقات سے تنگی اور تکلیف کا ازالہ فرمایا اور قرآنِ عزیز کے ساتھ ساتھ اپنے نبی پر ایک دوسری قسم کی وحی نازل فرمائی، جس کو سُنّت کہتے ہیں۔ اس وحی کو آپ پر بالمعنی نازل کیا گیا۔ اور الفاظ کو ان معانی کی علامت ٹھہرایا اس سے اُمتِ مسلمہ کو سہولت پہنچانا مقصود تھا۔ نیز یہ کہ در اصل الفاظ مقصود نہیں اصلی مراد و مطلوب مضمون ہے۔ اس لیے صحابہ و تابعین کے لیے مبنی بر احتیاط پہلو یہ تھا کہ وہ آنحضورؐ کی احادیث کو حضورؐ کے بیان کردہ الفاظ میں لوگوں تک پہنچائیں اس لیے کہ آنجناب کے الفاظ سے نورِ نبوت جھلکتا ہے اور ایسی فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ تاہم عربی زبان کے ماہر صحابہ و تابعین کو اس بات کی بھی اجازت تھی کہ حضورؐ کے مافی الضمیر کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیں اس امر کی اجازت انہی لوگوں کو دی جا سکتی تھی جو عربی زبان کے اسالیب و اطوار سے آگاہ ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ شریعت کے معانی و مقاصد کے بھی ذوق آشنا ہوں۔ ناواقف شخص کی روایت بالمعنیٰ سے اس امر کا خدشہ ہے کہ وہ کہیں اصل مقصد کو ضائع نہ کر دے۔ اس میں جو خطرہ دامن گیر ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس لیے کہ حدیث شرحِ قرآن وحیِ الٰہی اور مصادرِ تشریع میں سے مصدرِ ثانی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں غلطی کے نتائج کس قدر خطرناک ہو سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من کذب علیّ متعمّداً	جس شخص نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ
فلیتبوء مقعدہ من النّار۔	اپنا گھر دوزخ میں بنا لے۔ (صحاح ستّہ)

خداوند کریم کی حکمت و رحمت کا تقاضا تھا کہ اس نے وحی کو دو قسموں میں منقسم کر دیا

ایک قسم وہ ہے جس کی روایت بالمعنیٰ درست نہیں بلکہ اصل نازل شدہ الفاظ کا التزام ضروری ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ دوسری قسم کی روایت بالمعنیٰ صرف ان لوگوں کے لیے جائز ہے۔ جو اس کی اہلیت سے بہرہ ور ہوں۔ وہ سنّت نبویہ مطہّرہ ہے۔

وحی کی دونوں قسموں میں تحفّظِ شریعت اور سہولتِ اُمّت کا راز مضمر ہے۔ اگر وحی بہر دو صنف میں قرآن کی طرح الفاظ کی پابندی ضروری ہوتی تو اُمّت بڑی دشواری میں مبتلا ہو جاتی۔ اور اس عظیم ذمّہ داری سے عہدہ برآنہ ہو سکتی۔ اور اگر وحی کی دونوں قسمیں سُنّت کی طرح ہوتیں اور ان کی روایت بالمعنیٰ جائز ہوتی تو شریعت میں شک و شبہ کی بڑی گنجائش ہوتی۔ اور ہر قسم کے معترضین بڑی آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ شریعت کی ادائیگی میں راویوں سے غلطی سرزد ہوئی ہوگی۔ اس لیے ہم اس پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ بنابریں خداوند علیم وخبیر کی مصلحت اس امر کی متقاضی ہوئی کہ اس نے قرآن کے ذریعے شریعت کو محفوظ کر دیا۔ اور قابل اعتماد لوگوں کو سنّت کی بالمعنیٰ روایت کی اجازت دے کر اُمّت کے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ تاکہ لوگوں پر اتمام حجّت ہو جائے اور اس میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

۳۔ سُنّت کی شرعی حیثیّت

۱۔ حدیث کا وجوب اتّباع:

حدیث نبویؐ وحیِ الٰہی پر مبنی ہے۔ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بھیجی گئی۔ یہ اصول دین میں سے ایک عظیم اصل اور اس کی عمارت کا مضبوط و مستحکم ستون ہے۔ حدیث نبویؐ کی پیروی واجب اور خلاف ورزی حرام ہے۔ اس امر

پرسب مسلمانوں کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں اس قدر نصوص و آیات وارد ہوئی ہیں کہ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ جو شخص حدیث کی حجیّت کا انکار کرتا ہے وہ قطعی دلائل کو ردّ کرتا اور کفار کی راہ پر گامزن ہے۔ اس سلسلہ میں وارد شدہ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر)

اور ہمارا رسولؐ جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس بات سے منع کرے اس سے باز رہو۔

۲۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء ۸)

جو شخص رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے۔ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

۳۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۲۱)

تمہارے لیے رسول کی ذات میں عمل کا بہترین نمونہ موجود ہے۔

۴۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳۱)

کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے لَو لگانا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمہیں دوست بنائے گا۔

۵۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب ۳۶)

کسی مومن مرد وعورت کو زیب نہیں دیتا کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لئے کوئی گنجائش باقی رہے اور جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی نافرمانی کرے تو گم راہ ہوا گمراہی ظاہر۔

۶۔ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (النور ۶۳)

جو لوگ آپ (رسول کریم) کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں انہیں ڈرتے رہنا چاہئے کہ مبادا فتنے میں مبتلا ہو جائیں یا دردناک عذاب ان کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

۷۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء ۶۵)

تیرے رب کی قسم لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو حکم نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس کے بارے میں اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اپنی گردن تسلیم خم کر دیں۔

۲۔ منکرینِ حجیّتِ حدیث کی تردید:

منکرین حدیث کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ متواتر و آحاد ہر قسم کی احادیث کا منکر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے حدیث کی مطلق ضرورت نہیں۔ قرآن پر غور کرنے سے اس کا مطلب خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور اس کی توضیح و تفسیر کے لیے حدیث کی حاجت نہیں۔ وہ حسب ذیل دلائل و براہین پیش کرتے ہیں۔ قرآن عزیز میں فرمایا۔

ا۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ۔ (النحل ۸۹)

اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر چیز کو واضح کرتی ہے۔

ب۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام ۳۸)

ہم نے کتاب میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ج۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو بات میں تم سے کہوں، اسے قرآن پر رکھ کر پرکھ لیا کرو۔ اگر وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو تو وہ میرا ہی قول ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو میرا قول نہیں ہیں۔ کتاب اللہ کی خلاف ورزی آخر کیسے کر سکتا ہوں۔ جب کہ اسی کے ذریعے خدا نے مجھے ہدایت عطا فرمائی ہے۔"

ایک گروہ نے اخبارِ آحاد کو اس بنا پر رد کر دیا ہے کہ خبر واحد کا راوی کذب سے

محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور اس سے خطاء و نسیان کا سرزد ہونا ممکن ہے۔

حجیتِ حدیث کے اثبات میں ہم نے جو دلائل پیش کیے ہیں۔ ان سے منکرین حدیث کے خلاف احتجاج کیا جا سکتا ہے۔ اگر قرآن کریم حدیث نبویؐ سے بے نیاز کر دینے والا ہوتا تو آیت قرآنی "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" کے کچھ معنی نہ ہوتے جب ہم حدیث سے احتجاج کرتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو یہ بھی کتاب اللہ کی پیروی ہے۔

مُطرِّف بن عبداللہ بن الشِّخِّیر سے کسی نے کہا "ہمیں قرآن کے سوا اور کچھ نہ سنایا کرو"۔ کہنے لگے "بخدا ہم قرآن کا بدل تلاش نہیں کرتے۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہم میں قرآن کا سب سے بڑھ کر عالم کون ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ ان عورتوں پر لعنت کرتا ہے جو دوسری عورتوں کے جسموں پر نقش و نگار بناتی ہیں، یا اپنے جسموں پر دوسروں سے نقش بنواتی ہیں، جو بال چُنتی ہیں یا دانت باریک کراتی اور اس طرح خدا کے پیدا کردہ جسم کو تبدیل کرنا چاہتی ہیں۔ بنو اسد کی ایک عورت کو جب یہ حدیث پہنچی، تو اس نے حضرت عبداللہ کو مخاطب کر کے کہا "مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ فلاں فلاں عورت کو ملعون ٹھہراتے ہیں"۔ کہنے لگے "جس کو حضورؐ نے ملعون ٹھہرایا ہو، میں اس پر کیوں لعنت نہ کروں۔ یہ بات تو خدا کی کتاب میں بھی موجود ہے"! وہ عورت بولی "میں نے پورا قرآن پڑھا ہے مگر یہ بات کہیں نہیں پائی"۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو یہ بات تمہیں مل جاتی۔ کیا تم نے یہ آیت پڑھی۔

"وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔" — ہمارا رسول جو چیز تمہیں دے وہ لے لو اور جس بات سے منع کرے اس سے باز رہو۔

وہ عورت بولی "میں نے یہ آیت پڑھی ہے"۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ صدر باتوں سے منع فرمایا ہے"۔

مروی ہے کہ مشہور تابعی طاؤسؒ نماز عصر کے بعد دو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا" ان کو ترک کر دیجیے"۔ طاؤسؒ کہنے لگے" ان دو رکعتوں کو سُنّت بنانے سے منع کیا گیا ہے مطلق پڑھنے سے نہیں"۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا تمہیں ان دو رکعتوں کا اجر ملے گا یا عذاب دیا جائے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔ (الاحزاب ۳۶)

کسی مومن مرد و عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ صادر کر دے تو انہیں اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی رہے۔

حضرت عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک شخص سے کہا، تم احمق ہو۔ کیا تم قرآن میں یہ بات پاتے ہو کہ ظہر کے چار فرض ہیں اور ان میں قرأت بلند آواز سے نہیں کی جاتی؟ پھر اسی طرح نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں سوال کیا کہ کیا قرآن میں ان کا ذکر کیا گیا ہے؟ پھر فرمایا قرآن نے ان باتوں کی تفصیل بیان کرنے سے خاموشی اختیار کی ہے اور سُنّتِ رسولؐ نے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ان تمام آثار و اقوال کے لیے دیکھیے جامع بیان العلم لابن عبدالبرؒ ج ۲ ص ۱۸۸۔

منکرین حدیث کے پیش کردہ دلائل کا جواب حسب ذیل ہے۔

۱۔ آیت کریمہ" تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" سے منکرین حدیث کا استدلال درست نہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے جملہ دینی اُمور پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں (۱) قرآن نے صراحۃً کسی چیز کو بیان کر دیا (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن نے خود تو بیان نہیں کیا بلکہ اس کی وضاحت حدیث پر چھوڑ دی۔ اس لیے کہ حدیث

شارح قرآن ہے اور آیت "لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ" میں اسی چیز کو واضح کیا گیا ہے۔

۲- آیت قرآنی "مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ" سے بھی منکرین حدیث کا احتجاج درست نہیں۔ اس لیے کہ "الکتاب" سے اس آیت میں لوح محفوظ مراد ہے۔ اس کی دلیل آیت ہذا کا سیاق و سباق ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ۔ (الانعام ۳۸)	اور زمین پر کوئی رینگنے والا جانور نہیں اور نہ ہی کوئی پرندہ جو اپنے دونوں پروں سے اُڑتا ہو مگر وہ بھی تمہاری طرح کی جماعتیں ہیں۔ ہم نے کتاب (لوح محفوظ) میں کسی چیز کا ترک نہیں کیا۔

آیت کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ "الکتاب" سے یہاں لوح محفوظ مراد ہے۔ اور اگر "الکتاب" سے قرآن مراد لیا جائے تو اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن نے ہر چیز کو یا تو خود بیان کر دیا اور یا اس کی وضاحت و صراحت حدیث نبوی کے سپرد کر دی ہے

۳- جہاں تک سابق الذکر حدیث کا تعلق ہے۔ جس سے منکرین سنت نے استدلال کیا ہے۔ آئمہ حدیث نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حدیث زنادقہ و خوارج کی وضع کردہ ہے۔

حافظ ابن عبدالبر رقمطراز ہیں۔

"خداوند کریم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا حکم علی الاطلاق بدوں کسی قید و شرط کے دیا ہے۔ بالکل اسی طرح کتاب اللہ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ کی اطاعت کے ساتھ یہ شرط کہیں بھی عائد نہیں کی گئی کہ حضور کی اطاعت اس وقت کی جائے کہ جب آپ کا حکم کتاب اللہ کے موافق ہو جیسا کہ کج رو لوگوں کا زعم ہے۔

چنانچہ عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں کہ زنادقہ و خوارج نے یہ حدیث وضع کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جب تمہیں میری کوئی حدیث ملے تو اسے پرکھ کر دیکھ لیا کرو۔ اگر اس کے موافق ہو تو میری حدیث ہے ورنہ نہیں۔" محدثین کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں۔ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اس حدیث میں جو اصول بیان کیا گیا ہے۔ اگر اس حدیث کو اس پر پرکھ کر دیکھا جائے تو یہ حدیث اس معیار پہ پوری نہیں اترتی۔ بلکہ مخالف قرآن ہے۔ اس لیے کہ ہم نے قرآن میں یہ بات کہیں نہیں پائی کہ صرف اسی حدیث کو تسلیم کیا جائے جو قرآن سے ہم آہنگ ہو۔ بلکہ قرآن نے علی الاطلاق حضورؐ کی پیروی کا حکم دیا اور آپ کی خلاف ورزی سے منع فرمایا ہے۔" (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۰)

صاحبِ کشف الخفاء نے امام صغانی سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ منکرین حدیث جو حجیتِ حدیث سے انکار کرتے اور قرآن کریم کے معانی و مطالب کو بلا دلیل بگاڑتے ہیں، صرف خواہشِ نفس کی پیروی کرتے ہیں۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (القصص ۵۰)	اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو بدون ہدایتِ خداوندی خواہش نفس کی پیروی کرتا ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خداوند کریم سے اطلاع پا کر منکرین حدیث کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ "وہ زمانہ کچھ دور نہیں جب تم میں سے ایک شخص مسند سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوگا۔ اسے میری حدیث سنائی جائے گی تو وہ کہے گا "ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔ جس چیز کو ہم نے اس میں حلال پایا، اس کو حلال ٹھہرایا اور جس کو حرام پایا اس کو حرام قرار دیا۔" حالانکہ جس چیز کو رسول اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ وہ خدا کی حرام کردہ اشیا کی مانند حرام ہے۔" (ترمذی و ابوداؤد)

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے خیال میں اس امت کو اس مومن سے کوئی خطرہ لاحق نہیں جس کا ایمان اس کو منکرات سے روکتا ہے۔ نہ ہی ایسا

فاسق اس کو کوئی نقصان پہنچا سکتا جس کا فاسق ہونا ظاہر ہے۔ بخلاف ازیں میں اس شخص سے خطرہ محسوس کرتا ہوں جو قرآن روانی سے پڑھتا ہے اور اس کے معانی کی غلط سلط تاویل کرتا ہے۔ (جامع بیان العلم لابن عبد البرؒ)

۳۔ اخبار آحاد کے منکرین پر نقد و جرح :

محدثین نے حدیث کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے۔

(۱) متواتر (۲) آحاد

خبر متواتر : متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کے نقل کرنے والے اتنے کثیر اشخاص ہوں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہو جانا عقلاً محال ہو۔ اور اس لیے انسان ان کی صدق بیانی کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہو۔ حدیث متواتر سے جو علم حاصل ہوتا ہے، اس کو علم ضروری کہا جاتا ہے۔ علم ضروری اس علم کا نام ہے، جس کو تسلیم کرنے کے لیے انسان مجبور ہو اور اس کا رد کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ حدیث متواتر کے رواۃ و رجال کے بارے میں نقد و جرح نہیں کی جاتی۔ اور اس میں راویوں کی کوئی خاص تعداد معین نہیں۔

حدیث متواتر کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) متواتر لفظی (۲) متواتر معنوی۔

۱۔ متواتر لفظی :۔ اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کے الفاظ متواتر ہوں، مثلاً حدیث "من كذب علي متعمداً" الخ

۲۔ متواتر معنوی :۔ وہ حدیث ہے جس کا قدر مشترک متواتر ہو۔ اس کی بکثرت مثالیں ہیں۔ مثلاً دعا کے موقع پر دونوں ہاتھوں کا اٹھانا۔ اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً ایک سو احادیث منقول ہیں۔ مگر یہ مختلف مواقع پر وارد ہوتی ہیں۔ ہر موقع اور ہر روایت بجائے خود متواتر نہیں۔ البتہ ان تمام روایات کا قدر مشترک یعنی رفع الیدین فی الدعاء متواتر ہے۔

خبرِ واحد: اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں متواتر کی شروط موجود نہ ہوں۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا راوی ایک ہو یا زیادہ۔

خبر واحد کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) مقبول (۲) مردود۔

۱۔مقبول: مقبول وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو۔ جس کے راوی از ابتدا تا انتہا سب کے سب عادل و ضابط ہوں اور اس میں شذوذ و علت نہ پائی جاتی ہو۔

۲۔مردود: جس حدیث میں یہ اوصاف موجود نہ ہوں۔ اس کو مردود کہتے ہیں۔

ثقہ راوی سے منقول خبر واحد واجب العمل حجت ہے: جمہور اہل اسلام صحابہ تابعین محدثین فقہا اور اصحابِ اصول کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ثقہ راوی سے منقول خبر واحد دیگر شرعی دلائل کی طرح ایک لازم العمل حجت ہے۔ البتہ خبر واحد سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے، قطعی و یقینی نہیں۔ اس کے مقابلہ میں دیگر نقطہ ہائے نظر حسب ذیل ہیں۔

۱۔روافض قدریہ اور بعض اہل الظاہر کے نزدیک خبر واحد پر عمل کرنا واجب نہیں۔

۲۔معتزلہ میں سے جُبّائی کا قول ہے کہ عمل اس روایت پر واجب ہے جس کو کم از کم دو راوی دو دوسرے راویوں سے نقل کریں۔

۳۔بعض علما کے نزدیک واجب العمل وہ روایت ہے جس کو کم از کم چار راوی دوسرے چار راویوں سے روایت کریں۔

مذکورہ صدر تینوں اقوال جمہور اہل اسلام کے خلاف اور اس لیے باطل ہیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سلاطین کے نام جو خطوط صرف ایک ایک قاصد کے ذریعے ارسال فرمائے تھے۔ ان کو واجب التعمیل قرار دیا تھا۔ اور ان پر عمل بھی کیا گیا تھا۔ بعد ازاں خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ و سلف و خلف ہمیشہ ایک شخص کی روایت

کو تسلیم کرتے رہے۔ وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتے اور اپنے قضایا و فتاوٰی میں اس کی طرف رجوع کرتے۔ اس حدیث کی روشنی میں وہ اس کے خلاف فیصلہ کو رَدّ کر دیتے خبر واحد کی بنا پر وہ مخالفین پر حجت قائم کرتے اور مخالف اس کو تسلیم کر لیتا۔ یہ ایسی طے شدہ بات ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ عقل انسانی بھی خبر واحد پر عمل کرنے کو محال نہیں سمجھتی۔ اور شریعت بھی اسی کی مؤید ہے۔ لہٰذا اس کو رَدّ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

بعض علما نے خبر واحد کے مقبول ہونے پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ جب کسی صحابی یا تابعی سے کوئی دینی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو سائل کو اس سے آگاہ کرتے وقت یہ شرط عائد نہیں کیا کرتا تھا کہ جب تک کسی اور شخص سے اس کی تصدیق نہ کر لے اس پر عمل نہ کرے۔ بخلاف ازیں سائل کو مسئولہ بات بتا دی جاتی۔ اور وہ اس کی تعمیل کرنے لگتا۔ اور کوئی شخص بھی اس کے طرز عمل پر معترض نہ ہوتا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سب صحابہ خبر واحد کو واجب العمل قرار دیتے تھے۔ اور اگر بعض اوقات کسی صحابی یا تابعی نے اس ضمن میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ خبر واحد کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ بلکہ اس کے وجوہ و اسباب کچھ اور تھے مثلاً یہ کہ وہ حدیث صحیح نہیں۔ اس کا راوی متہم بالکذب ہے یا اس حدیث کی مخالف کوئی اور حدیث ہے جو اس سے راجح ہے۔ و دیگر اسباب و وجوہ۔

امام ابن قیم فرماتے ہیں۔

"صحابہ کرام اور ائمہ ثقات کی احادیث کو صرف اس بنا پر رَدّ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا راوی منفرد ہے۔ اس لیے کہ بکثرت احادیث ایسی ہیں جن کو ایک ہی صحابی نے روایت کیا ہے اور اس کے باوصف محدثین نے ان کی مرویات کو قبول کر لیا ہے۔ اور کسی نے بھی رد نہیں کیا۔ اسی طرح بکثرت احادیث کی نقل و

روایت میں ایک ہی تابعی منفرد ہوتا ہے۔ مگر کوئی محدث ان کی روایت کو قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا۔ ہمارے علم کی حد تک سلف و خلف علماء میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے یہ بات کہی ہو کہ جب کسی حدیث کو ایک ہی صحابی روایت کرے تو اس کی روایت کردہ حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔ البتہ اہل بدعت اور غیر معروف لوگوں سے اس قسم کے اقوال مروی ہیں کہ خبر واحد حجت نہیں۔ امام زہری قریباً ساٹھ احادیث کے روایت کرنے میں متفرد ہیں۔ مگر بایں ہمہ وہ ائمہ کی معمول بہا ہیں۔ اور منفرد ہونے کی بنا پر ان کو مردود قرار نہیں دیا گیا۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ حدیث اور ان کے اتباع میں سے کسی نے بھی خبر واحد کو رد کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ ورنہ ان کے اکثر اقوال و فتاویٰ باطل ٹھہرتے۔ اگر سوال کیا جائے کہ حدیث شاذ کو قبول نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کے قبول و عدم قبول میں توقف سے کام لیا جاتا ہے اور حدیث شاذ بھی خبر واحد ہی کی مانند ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خبر واحد اور حدیث شاذ میں فرق ہوتا ہے۔ حدیث شاذ وہ ہوتی ہے۔ جس میں ایک راوی ثقہ راویوں کی مخالفت کرتا ہے اور ان کی روایات سے اختلاف کر کے ایک الگ روایت ذکر کرتا ہے۔ مگر خبر واحد اس سے مختلف ہے۔ جب ثقہ راوی ایک روایت کرنے میں منفرد ہو اور ثقہ راویوں نے اس کے خلاف حدیث روایت نہ کی ہو تو اس کو شاذ نہیں کہتے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ حدیث شاذ کے یہ معنی نہیں کہ ایک ثقہ راوی کسی حدیث کے روایت کرنے میں منفرد ہو۔ بخلاف ازیں شاذ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا راوی ثقہ راویوں کی مخالفت کرے۔ (اغاثۃ اللہفان ابن قیمؒ)

امام شافعیؒ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں خبر واحد کے مقبول ہونے کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کی اور ایک مستقل باب باندھا ہے۔ تفصیلات کے لیے اس کی جانب مراجعت فرمائی جائے۔

اگر سائل یہ کہے کہ آپ کے

ہم بعض احادیث پر ترکِ عمل کے وجوہ :

نزدیک حدیث بہر دو صنف متواتر و آحاد واجب العمل ہے اور اس کی خلاف ورزی کسی صورت میں بھی ممکن نہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین بعض مسائل میں احادیث کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کوئی بھی دانستہ حدیثِ رسول کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ تمام ائمہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو جملہ امور میں واجب قرار دیتے ہیں۔ جب کسی امام سے ایسا قول منقول ہو جو حدیثِ صحیح کے خلاف ہو تو اس کی خاص وجہ ہوتی ہے۔ ایسے وجوہ و اسباب متعدد ہیں۔ چند امثلہ ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ امام کو کسی مسئلہ سے متعلق حدیث نہیں ملتی اور اس لیے وہ خلافِ حدیث فتویٰ دے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی حدیث سے آگاہ ہی نہ ہو وہ اس پر عمل کیسے کر سکتا ہے۔ ائمہ مجتہدین کے جو اقوال احادیث نبویہ کے خلاف ہیں، اکثر و بیشتر اس کی وجہ یہی ہے۔ اس لیے کہ ائمہ میں سے کوئی بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ جملہ احادیث نبویہ سے آگاہ ہے۔ خواہ اس کا مرتبہ و مقام کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو۔

حضرات صحابہؓ کا طریق کار یہ تھا کہ آپ جو حدیث ارشاد فرماتے یا کوئی کام کرتے یا کوئی فیصلہ صادر فرماتے تو جو شخص آپ کو دیکھ رہا ہوتا یا آپ کی بات سن رہا ہوتا۔ وہ اس کو دوسروں تک پہنچا دیتا۔ اس طرح دوسرے صحابہ و تابعین و تبع تابعین حضورؐ کے ارشادات سے باخبر ہو جاتے۔ لیکن تنہا کوئی صحابی یا تابعی یا ائمہ میں سے کوئی امام بھی حضورؐ کی جملہ احادیث سے آگاہ نہ تھا۔ اور جو شخص اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اور ان کے بعد آنے والے علماء علم کی کثرت وجودت کے اعتبار سے متفاوت الدرجات ہیں۔ خلفائے راشدین ہی کو لیجیے، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال واقوال اور عادات واطوار کو سب لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔ مگر انہوں نے احادیث رسولؐ کے احاطہ واستیعاب کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جب دادی کی میراث کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے برملا فرمایا" میرے علم کی حد تک تمہارے لیے کوئی حصہ مقرر نہیں کیا گیا۔ مگر آپ دوسرے لوگوں سے بھی دریافت کرلیں۔ چنانچہ سائل نے جب دوسرے لوگوں سے پوچھا تو مُغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مَسلمہؓ نے کھڑے ہو کر شہادت دی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو میراث سے چھٹا حصہ (۱/۶) دلایا تھا۔

جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کسی کے گھر جاتے وقت اذن طلبی کے شرعی طریقہ سے آگاہ نہ تھے اور حضرت ابوموسیٰؓ اشعری نے آپ کو یہ طریقہ بتایا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ اس بات سے بھی واقف نہ تھے کہ عورت اپنے خاوند کی دیت سے حصہ پاتی ہے حتیٰ کہ حضورؐ کے عامل ضحاک بن سفیان نے خط لکھ کر آپ کو آگاہ کیا کہ رسول اکرمؐ نے اشیمؓ ضبابی کی بیوی کو اس کی دیت میں سے حصہ دلایا تھا۔ حضرت عمرؓ یہ بھی نہیں جانتے تھے۔ کہ مجوس (آتش پرست) سے اسی طرح جزیہ وصول کیا جاتا ہے جس طرح اہل الکتاب سے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے آپ کو یہ مسئلہ بتایا۔

جب ارض شام میں طاعون کی وبا پھیلی اور حضرت عمرؓ عازم شام ہوئے اور مقام "سرغ" میں پہنچ گئے تو مہاجرین وانصار میں سے کسی نے بھی آپ کو اس امر سے آگاہ نہ کیا۔ کہ ایسی سرزمین میں جہاں وبا پھیل چکی ہو، سرغ جانا چاہیے یا نہیں؟ حتیٰ کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کو حضورؐ کی یہ حدیث سنائی کہ "جب تم کسی علاقہ میں مقیم

ہو رہا وہاں وبا پھیل جائے تو وہاں سے مت نکلو۔ اور جب تمہیں پتہ چلے کہ فلاں علاقہ وبا زدہ ہے تو وہاں مت جاؤ۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ باایں ہمہ علم و فضل اس مسئلہ سے آگاہ نہ تھے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو چکا ہے وہ اس کے گھر میں عدت گزارے۔ حتیٰ کہ فُرَیعہ بنت مالک نے جو حضرت ابو سعید خدری رض کی ہمشیرہ تھیں۔ حضرت عثمان رض کو اپنا واقعہ سنایا کہ جب ان کا خاوند فوت ہو گیا تو نبی کریم ؐ نے انہیں حکم دیا کہ عدت پوری ہونے تک اپنے خاوند کے گھر ٹھہرو۔"

ایام حج میں ایک مرتبہ حضرت عثمان رض کی خدمت میں شکار کا گوشت ہدیہ کیا گیا جو ان ہی کی خاطر شکار کیا گیا تھا۔ آپ نے اس کے کھانے کا ارادہ بھی کر لیا۔ حضرت علی رض نے ان کو بتایا کہ مُحرم کے لیے جو شکار کیا جائے وہ اس کے لیے حرام ہے۔

حضرت علی رض فرماتے ہیں جو حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا اس سے امکانی حد تک مستفید ہوتا۔ جب کوئی دوسرا شخص مجھے حدیث سناتا تو میں اسے حلف دیتا جب وہ حلف اٹھاتا تو میں اس کی روایت کردہ حدیث کو تسلیم کر لیتا۔ حضرت ابوبکر رض نے مجھے حدیث سنائی اور انہوں نے سچ کہا۔ پھر حضرت علی رض نے صلوٰۃ التوبہ سے متعلق مشہور حدیث ذکر کی۔

حضرت علی ابن عباس اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ جب کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو وہ وضع حمل اور عدتِ وفات میں سے جو بعید تر ہو اس کے مطابق عدت گزارے۔ مگر ان کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ مشہور صحابیہ سُبَیعہ اسلمیہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس کی عدت وضعِ حمل ہے۔

حضرت علی عبداللہ بن عمر زید بن ثابت اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ فتویٰ

دیا تھا کہ جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کا خاوند فوت ہو تو اسے مہر بالکل نہیں دیا جائے گا۔ انہیں یہ بات معلوم نہ تھی کہ حضورؐ نے بِروَعْ بنت واشق کے حق میں مہر مثل کا فیصلہ صادر فرمایا تھا۔

بہر کیف ایسے مسائل کی تعداد بہت زیادہ ہے جو حضرات صحابہ کو معلوم نہ تھے۔ جہاں تک صحابہؓ کے علاوہ دیگر علماء و ائمہ کے نامعلوم مسائل کا تعلق ہے۔ ان کا احاطہ سرے سے ممکن ہی نہیں۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ تمام ائمہ جملہ احادیث صحیحہ سے آگاہ و آشنا تھے یا کوئی مخصوص امام اس قدر وسیع العلم تھا کہ کوئی صحیح حدیث اس کے علم سے خارج نہیں وہ بڑی فاش قسم کی غلطی میں مبتلا ہے۔

۲۔ حدیث پر عمل نہ کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کوئی حدیث دو طریق سے منقول ہو۔ ایک طریق صحیح اور دوسرا غیر صحیح۔ کسی امام کو یہ حدیث غیر صحیح سند سے پہنچے اور وہ اس پر عمل نہ کرے۔ بخلاف ازیں دوسروں تک وہ حدیث صحیح سند کے ساتھ پہنچے اور وہ اس پر عمل کریں۔ گویا اس امام کے اس حدیث کو معمول بہ نہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حدیث اس کو صحیح سند کے ساتھ نہیں پہنچی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ائمہ یوں کہا کرتے ہیں کہ "فلاں مسئلہ کے بارے میں میری یہ رائے ہے۔ اس مسئلہ کے بارے میں ایک حدیث بھی وارد ہوئی ہے۔ اگر وہ حدیث صحیح ہو تو میرا قول بھی وہی ہے۔ جو اس حدیث میں وارد ہوا ہے۔"

۳۔ ترک العمل بالحدیث کی تیسری قسم یہ ہے کہ حدیث ایک ہی سند سے مروی ہو مگر ائمہ اس کے بارے میں مختلف الرائے ہوں۔ بعض اس حدیث کو اس لیے صحیح سمجھتے ہوں کہ ان کے نزدیک اس کی سند و متن پر نقد و جرح کی کوئی گنجائش نہیں۔ بعض کے نزدیک اس پر نقد و جرح کا امکان ہے اور اس لیے ضعیف ہے۔

یہ ایک وسیع باب ہے اور فنّ اسماء الرجال کے علما کے یہاں حدیث کے فہم و ادراک

اور دلالت میں کثیر اختلاف پایا جاتا ہے۔

۴۔ ترکِ عمل کی چوتھی صورت یہ ہے کہ محدّث یا امام کو حدیث پہنچی ہو اور اس کے نزدیک ثابت بھی ہو۔ مگر اسے بھول گئی ہو۔ علمائے سلف و خلف میں اس کے اَن گنت شواہد ملتے ہیں۔ مثلاً یہ مشہور حدیث کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو حالتِ سفر میں جنبی ہو جائے اور اسے پانی نہ مل سکے تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا "جب تک اسے پانی نہ ملے وہ نماز نہ پڑھے۔" حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا کہ "امیر المومنین! کیا آپ کو یاد نہیں جب میں اور آپ اونٹوں کی نگرانی کر رہے تھے اور دونوں پر جنابت کی کیفیت طاری ہوئی۔ میں نے تو چوپائے کی طرح مٹی میں پلٹے کھا کر نماز پڑھ لی اور آپ نے نماز نہ پڑھی۔ جب میں نے یہ واقعہ آنحضورؐ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا "مٹی میں لیٹنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف یوں کرتے کہ دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مار کر اپنے چہرہ اور دونوں ہاتھوں پر پھیر لیتے"۔ جناب فاروقؓ نے فرمایا "عمارؓ خدا سے ڈرو"! عمار کہنے لگے۔ اگر آپ یہ بات پسند نہیں کرتے تو آئندہ میں اسے بیان نہیں کروں گا۔" حضرت عمر نے فرمایا "یوں نہیں تم بیان کرتے رہو اس کی ذمہ داری تمہاری ذات پر ہی عاید ہوتی ہے۔"

اس حدیث میں ایک ایسی سنّتِ نبوئی (تیمم) کا ذکر کیا گیا۔ جو حضرت عمر کو معلوم تھی، وہ بھول گئے اور انہوں نے اس کے خلاف فتویٰ دیا۔ حتیٰ کہ عمار کے یاد دلانے پر بھی انہیں یاد نہ آیا۔ تاہم آپ نے حضرت عمار کو جھٹلایا نہیں اور حدیث کو بیان کرنے کا حکم دیا۔

۵۔ حدیث پر عمل نہ کرنے کی پانچویں صورت یہ ہے کہ امام تک حدیث پہنچے مگر اس کا خیال یہ ہو کہ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں۔ اس لیے کہ حدیث کا معارض موجود ہے۔ مثلاً جب عام کا خاص معارض ہو یا مطلق کی مخالفت مقید سے کی جا رہی ہو۔ یا حقیقت

کا معارض مجاز کی صورت میں موجود ہو اور اس قسم کے دیگر انواعِ تعارض۔

۶۔ ترک العمل بالحدیث کی چھٹی قسم یہ ہے کہ امام کو حدیث پہنچے مگر وہ کسی اور دلیل کی بنا پر اس کو منسوخ تصور کرتا ہو۔ اس کی مثال حضرت شداد بن اوس رض اور دیگر صحابہ سے منقول یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پچھنے لگانے والے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ گیا" امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عباس کی اس روایت کی وجہ سے منسوخ ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی حالت میں پچھنے لگوائے۔ منسوخ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت شداد کی روایت میں ہے کہ جب مکہ فتح ہوا، وہ آنحضور کے ساتھ تھے۔ حضور نے ایک آدمی کو ماہ رمضان میں پچھنے لگواتے دیکھا اور فرمایا کہ پچھنے لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔" بخلاف ازیں حضرت ابن عباس رض کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضور نے احرام اور روزہ دار ہونے کے باوجود پچھنے لگوائے۔" اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شداد کی روایت کا تعلق ۸ھ کے ساتھ ہے جب کہ مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ جب کہ حضرت ابن عباس رض سے منقول واقعہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر ۱۰ھ میں پیش آیا۔ مزید براں اس کی مثال وہ حدیث بھی ہے جس میں مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص شراب کی شرعی سزا پانے کے باوجود چوتھی مرتبہ شراب پیئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ یہ حدیث اس لیے منسوخ ہے کہ اجماعاً متروک العمل ہے۔

مندرجہ صدر بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ مجتہدین جن احادیث کو متروک العمل قرار دیتے ہیں، عین ممکن ہے کہ ان کے یہاں اس کی کوئی دلیل موجود ہو۔ مگر ہمیں اس کا علم نہ ہو۔ اس لیے کہ علم کا احاطہ ناممکن ہے۔ مزید براں علما بعض اوقات ترکِ عمل کی وجہ ذکر کرتے ہیں اور گاہے نہیں کرتے۔ بصورت اظہار ہمیں اس کا علم حاصل ہوتا ہے اور بسا اوقات نہیں ہوتا۔ اور جب ہوتا ہے تو بعض اوقات ہم اس کی دلیل کو سمجھتے ہیں۔

اور گاہے نہیں سمجھتے۔ قطع نظر اس سے کہ دلیل و برہان بذاتِ خود صحیح ہے یا غلط بہر کیف حدیث پر عمل نہ کرنے کے جو اسباب و وجوہ ہیں ان میں سے نمایاں تر اسباب پر ہم نے روشنی ڈالی ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ بعض ائمہؒ کے حدیث پر عمل کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ سنت پر طعن کرتے ہیں یا یہ کہ وہ فنِ حدیث میں کم سواد ہیں۔

بہر حال ترک العمل بالحدیث کے نمایاں تر اسباب تین ہیں۔

۱۔ بعض ائمہ حدیث پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک سرے سے وہ حدیث نبوی ہوتی ہی نہیں۔

۲۔ ان کے خیال میں وہ حدیث زیر بحث مسئلہ پر مشتمل ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ اس حدیث کو معمول نہیں ٹھہراتے۔

۳۔ وہ حدیث منسوخ ہونے کی وجہ سے ان کے نزدیک متروک العمل ہوتی ہے

مندرجہ صدر بیانات کے لیے دیکھیے رسالہ رفع الملام عن الائمۃ الاعلام امام ابن تیمیہ۔

۵۔ جب ایک مسلم کسی حدیث کو اپنے مسلک کے خلاف پائے تو کیا کرے:

۱۔ کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض ٹھہرائی ہے۔ علاوہ ازیں امت پر رسول کریم کے علاوہ جملہ اوامر و نواہی میں کسی دوسرے کی اطاعت کو فرض قرار نہیں دیا۔ اس بات پر علما کا اتفاق ہے کہ سرور کائنات کے سوا کوئی شخص بھی اپنے اوامر و نواہی میں معصوم عن الخطا نہیں ہے۔

۲۔ صحابہ تابعین اور ان کے بعد آنے والے ائمہ اسی ضابطہ پر عمل پیرا

رہے۔ وہ پیش آمدہ مسائل کا حل کتاب و سنّت سے تلاش کرتے تھے۔ اگر کتاب و سنّت میں ان کا حل نہ ملتا تو اجتہاد سے کام لیتے اور ساتھ ہی اس بات کا اعتراف کرتے کہ ان کا اجتہاد درست بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ اگرچہ مجتہد کا ظنّ غالب یہ ہوتا ہے کہ اس کا اجتہاد اقرب الی الصواب ہے۔ ائمہ مجتہدین کا طرز عمل یہ تھا کہ جب ان کے اجتہاد کے خلاف انہیں کوئی حدیث مل جاتی تو اس کی طرف رجوع کرتے اور اجتہاد کو چھوڑ دیتے اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ (النساء ۵۹)

اگر کسی چیز میں تمہارے یہاں نزاع پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

نیز فرمایا۔

فَبَشِّرْ عِبَادِیَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ (الزمر ۱۷)

میرے ان بندوں کو خوش خبری سنا دو جو بات سنتے ہیں اور بہت اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔

اکثر ائمہ سے یہ فقرہ منقول ہے کہ "ہر شخص کی (صحیح) بات کو مانا جاسکتا ہے اور غلط بات کو رد کیا جاسکتا ہے مگر رسول کریمؐ کی ہر بات واجب التسلیم ہے۔"

۳۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ کرام کو جب حدیث صحیح مل جاتی تو اپنے قول سے رجوع کر لیتے۔ اسی طرح چاروں ائمہ مجتہدین نے لوگوں کو اپنی تقلید سے منع کیا اور فرمایا کہ جب ان کے قول کے خلاف کوئی دلیل ثابت ہو جائے تو اس کی پیروی کی جائے۔ ائمہ اربعہ سے یہ فقرہ منقول ہے کہ

اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَھُوَ مَذْھَبِیْ

حدیث صحیح ہی میرا مذہب ہے

ترکِ تقلید سے متعلق ائمہ اربعہ کے اقوال:

امام ابو حنیفہ کے تلمیذ رشید قاضی ابو یوسف رح جب مدینہ حاضر ہو کر امام مالک سے ملے اور ان سے "صاع" کی مقدار اور سبزیات کی زکوٰۃ کے بارے

میں سوال کیا تو امام مالک نے حدیث نبوی کی روشنی میں ان کو جواب دیا۔ یہ سن کر قاضی ابو یوسف رحمہ نے فرمایا "ابو عبداللہ! (امام مالک کی کنیت) میں نے آپ کے قول کو اختیار کر لیا۔ اور اگر میرے استاد محترم ابو حنیفہ موجود ہوتے تو وہ بھی میری طرح آپ کے موقف کو تسلیم کر لیتے۔"

امام مالک رحمہ اللہ اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

"میں تو ایک انسان ہوں، غلطی کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ میرے قول کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیا کرو۔"

امام شافعی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:۔

"جب میرے قول کے خلاف کوئی صحیح حدیث پاؤ تو میرے قول کو دیوار پر مارو۔ جب کوئی دلیل موجود ہو تو اسے میرا قول تصور کرو۔"

امام ابن قیم فرماتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ جب کوئی نص پاتے تو اس کے مطابق فیصلہ صادر کرتے اور اس کی مخالفت کرنے والے کی مطلقاً پروا نہ کرتے کہ وہ کون ہے اور کیا کہتا ہے۔ اس لیے مطلقہ عورت کی عدت کے بارے میں جب حضرت عمر رضہ نے فاطمہ بنت قیس کا قول سنا تو ان کے قول کی طرف بالکل توجہ نہ دی۔

اس قسم کی امثلہ کے لیے ملاحظہ فرمائیے اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۲)۔

ہم حیرت تو اس بات پر ہے کہ ائمہ مجتہدین کے ان تاکیدی نصائح کے باوجود ہم اکثر علمائے مقلدین کو دیکھتے ہیں کہ جب اپنے مذہب کے خلاف کوئی حدیث پاتے ہیں اور اس کا جواب نہیں دے سکتے تو اپنے فقہی مذہب پر عمل کرتے ہیں اور حدیث کو چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتے ہیں اور اپنے فقہی مسلک کو ثابت کرنے کے لیے مختلف قسم کے وجوہ ترجیح نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر یہ

بھی نہیں کر سکتے تو بلا دلیل حدیث کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یا اس کو مخصوص اور متروک العمل قرار دیتے ہیں۔

اگر مذکورہ صدر باتوں میں سے کوئی بات بھی ممکن نہ ہو تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارا امام تمام احادیث کا علم رکھتا ہے۔ اس لیے اس نے اس حدیث کو یونہی ترک نہیں کیا۔ اس حدیث کے متروک العمل ہونے کی کچھ وجہ ضرور ہوگی۔ بعض اوقات یوں کہتے ہیں کہ حدیث نبوی کا فہم و ادراک بازیچۂ طفلاں نہیں۔ ہم تو اسے سمجھ بھی نہیں سکتے، چہ جائے کہ اس پر عمل کریں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ حدیث کی تعظیم اس پر عمل کرنے میں ہے اور حدیث پر عمل نہ کرنا اس کی توہین و تذلیل کے مترادف ہے۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ ہم حدیث کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اگر احادیث نبویہ بالاتر از ادراک ہوتیں تو عام مسلمانوں کو ان کی تکمیل کے لیے مکلف و مامور نہ کیا جاتا۔ صرف ائمہ مجتہدین جیسے لوگ ہی ان کی تعمیل کرنے کے مجاز ہوتے۔

بکثرت علماء و مجتہدین نے مقلدین کی اس ستم ظریفی پر نقد و جرح کی ہے کہ وہ حدیث کے ہوتے ہوئے اپنے امام کے فقہی اقوال پر عمل کرتے ہیں۔ مشہور امام و محدث عزؒ بن عبدالسلام فرماتے ہیں۔

"یہ کتنی حیرت ناک بات ہے کہ فقہائے مقلدین یہ جانتے ہوئے کہ ان کے امام کا مؤقف کمزور ہے اور اس کا دفاع ممکن نہیں۔ مگر بایں ہمہ وہ اس مسئلہ میں امام کی تقلید کرتے ہیں اور کتاب و سنت اور قیاس صحیح کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ پھر اسی پر بس نہیں، وہ نصوص کتاب و سنت کو رد کر دیتے ہیں اور اپنے امام کا دفاع کرنے کے لیے باطل اور بعید از کار تاویلات کا سہارا لیتے ہیں۔ ادوار سلف میں کسی خاص فقہی مسلک کی پیروی نہیں کی جاتی تھی۔ جو عالم مل جاتا اس سے مسئلہ دریافت کر لیا جاتا۔ یہاں تک کہ فقہی گروہ پیدا ہوئے اور متعصب مقلدین آنمودار ہوئے۔ اب ان کی حالت

یہ ہے کہ امام کا مذہب اگرچہ کسی دلیل پر مبنی نہ ہو۔ تاہم وہ اسی کی پیروی کرتے ہیں۔ گویا وہ رسول ونبی ہے۔ جس پر آسمانی وحی اُتر رہی ہے۔ یہ بات حق وصواب سے بعید ہے اور کوئی دانشمند آدمی اس کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔" (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۵۵)

۵۔ مذکورہ صدر بیانات کی روشنی میں ہمارا خیال ہے کہ جو شخص کسی امام کی فقہ میں مہارت وبصیرت حاصل کرنے کے بعد علم حدیث میں مشغول ہو کر ان سے استنباطِ احکام کا ملکہ پیدا کرے اور اس کے علم میں ایسی احادیث صحیحہ آئیں جو اس کے امام کے مسلک کے خلاف ہوں اور ان احادیث کا کوئی ناسخ مخصّص اور معارض بھی نہ ہو تو اسے چاہیے کہ حدیث پر عمل کرے اور اپنے امام کا قول ترک کر دے۔ خصوصاً جب کہ کسی دوسرے قابل اعتماد امام نے اس حدیث کو معمول بہ ٹھہرایا ہو۔ کیونکہ اسی طریق سے نصوص کی پیروی ہو سکے گی۔ اور انسان راہ حق پر گامزن ہو سکے گا۔ جس پر ائمہ کرام اور صحابہ رضوان اللہ علیہم رواں دواں تھے۔

اندریں صورت ایسے شخص سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ "تم نے اپنے امام کی مخالفت کی ہے اس لیے تم ان سے بڑھ کر عالم ہو۔" بخلاف ازیں ایسی صورت میں حدیث پر عمل کرنا ناگزیر ہوگا۔ ورنہ وہ شخص اللہ ورسول کے احکام سے اعراض کرنے والا ٹھہرے گا اور حدیث کو چھوڑ کر جس امام کی پیروی وہ کر رہا ہے گویا اس کو وہی درجہ حاصل ہے جو کسی نبی کو اپنی اُمت میں ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک شخص نے حجِ تمتّع کے بارے میں مناظرہ کرتے ہوئے کہا "ابوبکرؓ وعمرؓ نے یوں کہا"۔ یہ سُن کر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر آسمان سے پتھر برسنے لگیں۔ میں کہہ رہا ہوں رسول اللہؐ نے یوں فرمایا اور تم ابوبکرؓ وعمرؓ کا قول پیش کر رہے ہو۔"

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب حجِ تمتّع (حج کی ایک قسم جس میں پہلے

عمرہ کر کے فارغ ہو جاتے ہیں اور پھر حج کا احرام باندھتے ہیں) کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ لوگوں نے ان کی مخالفت میں حضرت عمرؓ کا قول پیش کیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے کہا میرے والد کا وہ مطلب نہ تھا جو تم بیان کر رہے ہو۔ جب لوگوں نے اس پر اصرار کیا تو حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ”کیا رسول اللہ اتباع کیے جانے کے زیادہ حقدار ہیں یا عمرؓ؟ حالانکہ لوگ جانتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے بڑھ کر عالم تھے۔

۶۔ اتباعِ حدیث و ترکِ اقوالِ ائمہ :

اب ہم اس ضمن میں ائمہ اربعہ کے بعض مقلدین علماء کے اقوال ذکر کریں گے کہ حدیث کو چھوڑ کر ائمہ کی پیروی نہیں کرنا چاہیے۔

قولِ اول : محدث ابن الصلاح فرماتے ہیں۔

”شوافع میں سے جو شخص کوئی حدیث اپنے امام کے مسلک کے خلاف پائے اور اور وہ اصحابِ اجتہاد میں سے ہو تو اُسے حدیث پر عمل کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ اجتہاد کی صلاحیتوں سے بہرہ ور نہیں اور اندریں صورت حدیث کی خلاف ورزی اس کے لیے بڑی دشوار ثابت ہوئی ہے تو اسے حدیث پر عمل کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ امام شافعیؒ کے سوا کسی اور امام نے اس حدیث کو معمول بہ بنایا ہو۔ اندریں صورت امام شافعی کے مسلک کی خلاف ورزی میں اس کا عذر مقبول ہوگا۔ امام نوویؒ رحمہ اللہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۸)

قولِ دوم : امام شعرانی المیزان میں رقمطراز ہیں۔

”اگر سوال کیا جائے کہ ان احادیث کا کیا کیا جائے، جن کی صحت ہمارے امام کی وفات کے بعد ثابت ہو چکی ہے۔ اور امام نے ان پر عمل نہیں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان احادیث پر عمل کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر وہ احادیث امام مرحوم کو مل جاتیں

اور ان کی صحت بھی ثابت ہو جاتی تو لا محالہ وہ ان پر عمل کرتا۔ اور اپنے مقلدین کو ان کی پیروی کی تلقین کرتا۔ کیونکہ سب ائمہؒ شریعت کے پابند ہیں اور کسی کو بھی اس سے مجال انکار نہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس صورت میں حدیث کی پیروی کرتا ہے وہ دونوں ہاتھوں سے نیکیاں جمع کرتا ہے۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں تو حدیث پر اس صورت میں عمل کروں گا جب کہ میرا امام بھی اس کی پیروی کرتا ہو۔ وہ بہت سی نیکیوں کو رائگاں کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ائمہ اربعہ کے اکثر و بیشتر مقلدین کا برتاؤ حدیث کے ساتھ اسی قسم کا ہے۔ حالانکہ ان کے لیے موزوں بات یہ تھی کہ اپنے امام کی وفات کے بعد جو صحیح حدیث بھی ان کو مل جاتی اس پر عمل پیرا ہوتے اور اس طرح ائمہؒ اربعہ کی وصیت پر عمل کرتے۔ ائمہؒ کے بارے میں ہمارا نیک گمان یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے اور وہ احادیث ان کو مل جاتیں، جن کی صحت ان کی وفات کے بعد ثابت ہوتی ہے تو وہ ان پر عمل پیرا ہوتے اور اپنے تمام قیاسات کو بالائے طاق رکھ دیتے۔

بسندِ صحیح ہمیں امام شافعیؒ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ آپ نے امام احمد بن حنبلؒ کو یہ پیغام بھجوایا کہ جب کسی حدیث کی صحت آپ کے یہاں ثابت ہو جائے تو ہمیں بتا دیا کریں تاکہ ہم اس پر عمل کریں اور اپنے اور دوسروں کے اقوال کو خیر باد کہہ دیں۔ اس لیے کہ حفظِ حدیث میں آپ کا مرتبہ ہم سے بلند ہے مگر اس کے نکات و دقائق ہم آپ سے بہتر جانتے ہیں۔ (المیزان للشعرانی)۔

قول سوم : امام سندھی حنفی فرماتے ہیں۔

"یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ تمام صحابہ مجتہد نہ تھے۔ ان میں دیہاتی بھی تھے اور شہری بھی۔ اور ایسے بھی جنہوں نے آنحضورؐ سے صرف ایک ہی حدیث سُنی یا صرف ایک ہی دفعہ آپ کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ جس شخص نے آنحضورؐ یا کسی

صحابی سے ایک حدیث بھی سنی تھی وہ اس پر عمل پیرا تھا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مجتہد ہو یا نہ ہو۔ ایسا نہیں کہ غیر مجتہد شخص نے جو حدیث سُنی ہو وہ اس بات کا مکلف ہو کہ عمل کرنے سے پہلے کسی مجتہد کی جانب رجوع کرے۔ عہد رسالتؐ اور اس کے بعد عہد صحابہ میں کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ رسول کریمؐ کے اس طرز عمل اور اجماع صحابہ سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مجتہد مجتہد کی جانب رجوع کیے بغیر حدیث نبویؐ پر عمل کر سکتا ہے۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو خلفائے راشدین لازماً دیہاتی لوگوں کو حکم دیتے کہ احادیث نبویہ پر اس وقت تک عمل نہ کریں جب تک کسی مجتہد سے دریافت نہ کر لیں۔ مگر اس ضمن میں کوئی قول و اثر بالکل منقول نہیں۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر ۷)

اور (ہمارا) رسول جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس بات سے منع کرے اس سے باز رہو۔

اور اس قسم کی دیگر آیات۔ مگر کسی آیت میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اطاعت رسول سے قبل فقہا سے وہ حدیث سمجھ لو جس کی تعمیل کرنا چاہتے ہو۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ کسی شخص کو جب صحیح حدیث مل جائے تو اس کی فوری تعمیل کرے اور اس بات کا منتظر نہ رہے کہ آیا وہ حدیث منسوخ تو نہیں۔ یا یہ کہ اس حدیث کے خلاف اجماع تو منعقد نہیں ہوا یا دوسری کوئی حدیث اس کے معارض تو نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس حدیث پر عمل کیا جائے۔ البتہ جب موانع میں سے کسی کا ظہور ہو تو اس پر عمل ترک کر دیا جائے۔ اس لئے کہ موانع کا نہ ہونا اصل ہے اور حدیث پر عمل کرنے کے لیے یہی بات کافی ہے۔ فقہائے بہت سے شرعی احکام کی بنا اصالت پر رکھی ہے۔ جیسا کہ ماہرین فقہ پر واضح ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے دیہاتی لوگ بھی تھے جو زندگی بھر میں صرف ایک دو دفعہ آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چند مسائل سن کر اپنے وطن واپس لوٹ جاتے اور ان پر عمل پیرا رہتے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ وحی اس وقت جاری تھی اور احکام میں فسخ و تبدیلی کا امکان

باقی تھا۔ مگر آپ نے ان لوگوں میں سے کسی کو بھی اس بات کا حکم نہ دیا کہ ناسخ و منسوخ معلوم کرنے کے لیے دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ بخلاف ازیں جن لوگوں نے آپ کے بیان کردہ احکام سن کر یہ کہا کہ "نہ میں اس میں اضافہ کروں گا اور نہ کمی"۔ تو آپ نے ان کی تائید فرمائی اور یہ نہ فرمایا کہ احکام تو منسوخ بھی ہو سکتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ "اگر یہ شخص سچ کہتا ہے تو جنتی ہے"۔

اسی طرح آپ نے دیہاتی صحابہ کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ ناسخ و منسوخ معلوم کرنے کے احادیث پہلے کسی مجتہد کو سنا لیا کرو اور پھر ان پر عمل کیا کرو۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کوئی حکم کسی شخص کے حق میں لازم اس وقت ٹھہرتا ہے۔ جب اسے ناسخ کا علم ہو جائے۔ علم سے قبل صرف ناسخ کا پایا جانا اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کو کعبہ قرار دیا گیا تو مدینہ کے گرد و نواح میں اس کی خبر اس وقت پہنچی، جب وہ لوگ بیت المقدس کی جانب منہ کر کے نماز ادا کر چکے تھے بعض لوگوں کو یہ خبر حالت نماز میں پہنچی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تائید فرمائی۔ اور کسی کو بھی نماز دہرانے کا حکم نہ دیا۔ اس لیے یہ بات درست نہیں کہ حدیث پر اس وقت تک عمل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک یہ معلوم نہ کر لیا جائے کہ آیا وہ منسوخ تو نہیں یا کوئی حدیث اس کی معارض تو نہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس پر اجماع قائم کیا جا چکا ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کا اجماع اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت دوسروں کے اجماع کے مقابلہ میں راجح ہے حالانکہ اس ضمن میں اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں۔ جیسا کہ علامہ زرکشی نے بیان کیا ہے"۔

حدیث تفسیر قرآن ہے

قرآنِ عزیز لوگوں کی دینی و دنیوی رشد و ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ مگر اس کا اُسلوب و انداز مجمل ہے اور اس لیے خداوند کریم کا منشا جلدی واضح نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی شرح و توضیح کا کام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تفویض کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل ۴۴)
اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اس کو واضح کر دیں۔

قرآن کریم کی شرح و توضیح بھی حضورؐ اپنی طرف سے نہیں کرتے تھے بلکہ اس ضمن میں وحی کی پیروی کرتے تھے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ (النجم -۳)
وہ (ہمارا رسول) اپنی مرضی سے نہیں بولتا وہ تو وحی ہے جو آپ کی طرف کی جاتی ہے۔

نیز فرمایا

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (النساء ۸)
(اور جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

خلاصہ یہ کہ حدیث نبوی قرآن عزیز کے احکام و اوامر اور اسرار و رموز کی شارح و ترجمان ہے۔ جب ہم حدیث پر اس پہلو سے غور و فکر کرتے ہیں کہ وہ ان احکام پر دلالت کرتی ہے۔ جن پر قرآن کریم اجمالاً یا تفصیلاً مشتمل ہے تو اس کی مندرجہ ذیل چار قسمیں پاتے ہیں۔

حدیث کی اقسام اربعہ: ایسی احادیث جن سے کسی قرآنی حکم کی تائید و تاکید ہوتی

ہے۔ مثلاً

۱۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی مسلم کا مال اس کی مرضی کے بغیر حلال نہیں"
حضور کا یہ ارشادِ گرامی مندرجہ ذیل آیت کریمہ کے مطابق ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النسا ۲۹)	اے ایمان والو! اپنے مال ناروا طریقہ سے مت کھاؤ۔

۲۔ حضورؐ نے فرمایا "لوگو! عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ وہ تمہارے پاس قید ہیں۔ تم نے ان کو خدا کی امانت سمجھ کر لیا اور ان کی شرم گاہیں شرعی کلمات پڑھ کر حلال کی ہیں"۔
یہ حدیث مندرجہ ذیل آیت سے ہم آہنگ ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (النساء ۱۹)	اور عورتوں کے ساتھ مناسب طریقہ سے زندگی بسر کرو۔

۳۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو اسے چھوڑتا نہیں"۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِیَ ظَالِمَةٌ (ہود ۱۰۲)	اور تیرے رب کی گرفت اسی طرح ہے جب وہ ظالم بستیوں کو پکڑ لیتا ہے۔

قسم دوم :۔ دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جو قرآن کریم کے مطلب و مفہوم کو واضح کرتی ہے۔

۱۔ بیان مجمل : اس کی مثال وہ احادیث ہیں جن میں شرعی احکام مثلاً نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ اور حج کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

۲۔ تقیید مطلق : مثلاً وہ احادیث جن میں "اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا" کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یَدٌ سے دایاں ہاتھ مراد ہے۔ نیز یہ کہ یَدٌ (ہاتھ) کا اطلاق کندھے تک کیا جاتا ہے۔ کہنی تک نہیں۔

۳۔ تخصیصِ عام: مثلاً وہ حدیث جس میں بتایا گیا ہے کہ آیت کریمہ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ" میں لفظ "ظلم" سے شرک مراد ہے۔ بعض صحابہ نے اس کو عموم پر محمول کر کے یہ کہا تھا کہ ہم میں سے کس نے ظلم نہیں کیا۔ یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آیت میں شرک مراد ہے۔

۴۔ توضیحِ مشکل: مثلاً وہ حدیث جس میں بتایا گیا ہے کہ آیت قرآنی "حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ" سے بعض صحابہ نے سیاہ اور سفید دھاگہ سمجھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے رات کی سیاہی اور دن کی سفید دھاری مراد ہے۔

قسم سوم: تیسری قسم کی وہ احادیث ہیں، جو ان احکام پر مشتمل ہوتی ہیں جن سے قرآن خاموش ہے۔ اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سمندر کے بارے میں حضور کا ارشاد گرامی کہ "اس کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔"

۲۔ کسی گائے بھینس یا بکری وغیرہ کو ذبح کرتے وقت جو اس کے شکم سے نکلے، وہ مُردہ بھی ہو تو حلال ہے۔ کیونکہ حضورؐ نے فرمایا "اس کی ماں کو ذبح کرنا گویا اس کو ذبح کرنا ہے۔"

۳۔ وہ احادیث جن میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب ہم جنس اشیاء کا تبادلہ آپس میں کیا جائے۔ مثلاً گندم گندم کے عوض اور جَو جَو کے بدلے تو اندریں صورت کمی بیشی منع ہے۔ دونوں جنسوں کا برابر ہونا ضروری ہے۔ اس کو "ربا الفضل" کہتے ہیں۔

۴۔ وہ احادیث جن میں داڑھوں والے درندوں مثلاً شیر بھیڑیے اور پنجہ میں پکڑ کر کھانے والے پرندوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی طرح وہ احادیث جن میں پالتو گدھے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

قسم چہارم: چوتھی قسم کی وہ احادیث ہیں جو کسی ایسے حکم کی ناسخ ہوں جو قرآن سے ثابت شدہ ہو۔ مگر یہ ان علما کے نزدیک ہے جن کے نزدیک حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے۔

مثلاً حدیث میں فرمایا "لا وصیۃ لوارثٍ" وارث کے حق میں وصیت کرنا درست نہیں۔

یہ حدیث سورہ بقرہ کی اس آیت کی ناسخ ہے جس میں والدین واقارب کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا کہ "جب کنوارا مرد کنواری لڑکی کے ساتھ زنا کا مرتکب ہو تو ان کو سو کوڑے لگائے جائیں اور ایک سال کے لیے جلا وطن کیا جائے۔"

یہ حدیث سورۃ النساء کی آیت "وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَاءِكُمْ" کی ناسخ ہے۔ مگر حدیث کے ناسخ قرآن ہونے کا مسئلہ فقہا کے یہاں متنازعہ فیہ ہے۔ جیسا کہ اصول فقہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

دراصل نسخ بھی بیان کی ایک نوع ہے۔ کیونکہ نسخ میں کسی شرعی حکم کی مدت کے ختم ہو جانے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اصول فقہ کے بعض علماء اس کو "بیان تبدیل" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔

کیا حدیث مستقل ماخذِ تشریع ہے؟

معترض کہہ سکتا ہے کہ حدیث کی مندرجہ صدر اقسام اربعہ میں سے تیسری قسم سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث سے ایسے احکام بھی ثابت ہو سکتے ہیں جن کا ذکر اجمالاً یا تفصیلاً قرآن میں کسی طرح بھی نہیں کیا گیا اور یہ بات قرآن کریم کی اس آیت کے منافی ہے جس میں فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔ (النحل ٤٤)

اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں کے لئے واضح کردیں۔

اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ حدیث قرآن کی صرف شارح و ترجمان ہے مستقل مثبت احکام نہیں ہے اس کے دو جواب ہیں۔

پہلا جواب :۔ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ تیسری قسم کی احادیث میں جو احکام مذکور ہوتے ہیں۔ قرآن میں ان پر بالکل روشنی نہیں ڈالی گئی بخلاف ازیں قرآن میں ان کا ذکر بطریق اجمال کیا گیا ہوتا ہے اور حدیث ان کو واضح کر دیتی ہے۔

اس کی توضیح یوں ہے کہ حدیث جن احکام پر مشتمل ہوتی ہے اور قرآن ظاہراً ان سے خاموش ہوتا ہے۔ حدیث تین طریقوں سے ان کی وضاحت کرتی ہے۔

۱۔ بطریق الحاق۔
۲۔ بذریعہ قیاس
۳۔ بطور استنباط

بیان بطریق الحاق: قران عزیز بعض اوقات ایک چیز کی حلت اور دوسری کی حرمت پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان دونوں سے ملتی جلتی ایک تیسری چیز بھی ہوتی ہے مگر قرآن اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ تاہم اجتہاد میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ اس تیسری چیز کو ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہی کرتے ہیں۔ اور اس چیز کو کسی ایک کے حکم میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ گویا وہ چیز قبل ازیں ان میں شامل تھی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ خداوند ذوالجلال نے پاکیزہ اشیا کو حلال قرار دیا اور ناپاک کو حرام ٹھہرایا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو کسی ایک کے ساتھ شامل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی وضاحت فرما دی۔

اسی سلسلہ میں حضورؐ نے داڑھوں والے درندوں، پنجہ میں پکڑ کر کھانے والے پرندوں

اور پالتو گدھے کو حرام ٹھہرایا۔ گویا یہ سب جانور ناپاک اور خبائث میں سے ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے گندگی کھانے والے جانور کا دودھ اور گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ اس لیے کہ اس کے دودھ اور گوشت میں غلاظت کا اثر پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ان تمام جانوروں کو ناپاک تصور کر کے خبائث میں شامل کر دیا اور اس لیے حرام ٹھہرایا۔ اسی ضمن میں آپ نے گوہ خرگوش اور حباریٰ کو طیبات میں شامل کر کے حلال قرار دیا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے سدھائے ہوئے شکاری کتّے وغیرہ کے کیے ہوئے شکار کو حلال قرار دیا ہے بشرطیکہ اس نے اس میں سے کھایا نہ ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو کتّا سدھایا ہوا نہ ہو اس کا کیا ہوا شکار حرام ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے لیے شکار کیا ہے۔ اپنے مالک کے لیے نہیں۔ اب باقی رہی یہ بات کہ جب کتّا تربیت یافتہ ہو مگر اس نے شکار کر کے اس میں سے کچھ کھا لیا ہو۔ تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ تربیت دینے کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس نے مالک کے لیے شکار کیا ہے۔ جب کہ اس کے شکار میں سے کچھ کھا لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے لیے شکار کیا ہے۔ اسی طرح یہ دونوں پہلو آپس میں متصادم ہیں۔ اب سنّت نے اگر یہ فیصلہ صادر کیا "اگر کتّے نے اس میں سے کھا لیا ہو تو شکار حلال نہیں۔ اس لیے کہ کتّے نے وہ شکار اپنے لیے کیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

۳۔ خداوند کریم نے طیبات کے سلسلہ میں سمندر کے شکار کو حلال قرار دیا۔ مردار کو خبائث میں شمار کرتے ہوئے حرام ٹھہرایا۔ اب یہ سوال باقی رہا کہ جو جانور سمندر میں مر جائے اس کا کیا حکم ہے؟ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سمندر کا پانی پاک ہے اور اس میں مرا ہوا جانور حلال ہے۔" (ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

۴۔ اللہ تعالیٰ نے مُردار کو حرام اور ذبیحہ کو حلال ٹھہرایا۔ اب یہ بات باقی رہی کہ ذبیحہ کے شکم میں جو بچہ مردہ حالت میں پیدا ہو اس کا حکم کیا ہے؟ اس کے بارے میں حضورؐ نے

حکم صادر فرمایا کہ "وہ حلال ہے"۔ اس کی حلّت کا فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے اس امر کو ملحوظ رکھا کہ ذبیحہ حلال ہے اور بچہ اس کا جزو ہے۔ اس لیے وہ بھی حلال ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی)

۴۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ (النساء ۱۱)

اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔ اور اگر ایک ہو تو اسے جائداد کا نصف ملے گا۔

اس آیت میں یہ نہیں بتایا کہ جب میت دو لڑکیاں چھوڑے تو ترکہ میں سے ان کو کیا ملے گا؟ حدیث نبوی نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ان کو بھی وہی حصہ ملے گا جو دو سے زیادہ لڑکیوں کو۔

مندرجہ صدر امثلہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ حدیث نبوی قرآن کی شارح و مفسر ہے

بیان بطریق قیاس:

بعض اوقات قرآن کریم ایک چیز کو صراحۃً بیان کرتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی دوسری چیز کو اتحادِ علّت کی بنا پر بطریق قیاس اس کے ساتھ شامل کر دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ در اصل قرآنی دلالت ہی ہوتی ہے اس لیے کہ نص قرآنی جس سے اصل کے حکم کا اثبات ہوتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اصل کے ساتھ مختص ہے تاہم عمومِ علّت کے اعتبار سے عام ہے خواہ نبی کریمؐ نے یہ بات اپنے اجتہاد سے کہی ہو یا وحی کی بنا پر۔ مگر ہم اسے اجتہاد و قیاس پر محمول کریں گے۔ چند امثلہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ خداوند ذوالجلال نے ربا کو حرام ٹھہرایا۔ جس کے بارے میں مشرکین مکہ کہا کرتے تھے کہ "بیع بھی تو ربا ہی کی مانند ہے"۔ قرضخواہ آکر مقروض سے کہا کرتا تھا کہ "یا تو میرا قرض ادا کر دو۔ ورنہ اصل رقم میں اضافہ قبول کرو"۔ اس قسم کے ربا کو حرام ٹھہرانے کی وجہ یہ تھی کہ اصل رقم میں بلاوجہ اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ حدیث نے آکر ہر اس بیع کو حرام قرار دیا جس میں بلا عوض زیادتی پائی جاتی ہو۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا "سونے کی بیع سونے کے عوض اور چاندی گندم جو کھجور اور نمک کی اس قسم کی دیگر اشیا کے عوض برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ درست ہے۔ جس نے زیادہ دیا یا لیا اس نے سُودی کاروبار کیا۔ جب اجناس بدل جائیں مثلاً گندم کی بیع جو کے عوض یا چاندی کی بیع سونے کے بدلے ہیں، تو اندریں صورت کمی بیشی جائز ہے مگر ادھار جائز نہیں ہے" (صحاح ستہ)

۲۔ اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں لانے کو ممنوع قرار دیا اور فرمایا "اس کے سوا سب رشتے حلال ہیں"۔ مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی سے بھی بہ یک وقت نکاح کرنے سے منع فرمایا۔ دراصل یہ بھی حضورؐ کا قیاس ہے۔ اس لیے کہ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کی علت ان دونوں صورتوں میں بھی موجود ہے۔ اور وہ علت حضورؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ "ایسا کرنے سے قطع رحمی ہوتی ہے"۔

(ابن حبان)

۳۔ قرآن کریم نے رضاعی ماں اور بہن کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

وَاُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ۔ — اور تمہاری دودھ کی مائیں اور بہنیں حرام ہیں۔ (النساء ۲۳)

حدیث نبویؐ نے ان تمام رشتوں کو حرام قرار دیا جو نسب سے حرام ہیں۔ مثلاً پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی وغیرہ۔ (ترمذی)

حضورؐ نے اپنے اجتہاد کی بنا پر ایسا کیا۔ اس لیے کہ اصل و فرع میں اتحادِ علت موجود ہے۔

بیان بطریق استنباط:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئ ما نوی"۔ اعمال کا انحصار نیت پر ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی دراصل ان آیات سے مستفاد ہے۔ جن میں اخلاص نیت کی ترغیب اور ریا کی مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً یہ آیات۔

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم-۳۹) — انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی اس نے کوشش کی۔

وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ۔ (البینہ ۵) — اور انہیں تو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خالص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (الزمر-۳) — اللہ ہی کے لیے خالص عقیدہ ہے۔

فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا۔ (الکہف) — جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو۔ وہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد، کہ "لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ" (نہ خود نقصان اٹھایا جائے اور نہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے" یہ حدیث نبوی متعدد اوامر و نواہی سے ماخوذ ہے۔ جو قرآن کریم کے مختلف مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً قرآن میں فرمایا۔

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا۔ (البقرہ ۲۳) — اور نقصان پہنچانے کیلئے عورتوں کو روکے نہ رکھو کہ ان پر ظلم و تعدی کی جائے۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَۃٌۢ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّہٗ بِوَلَدِہٖ۔ البقرہ ۲۳۳) — والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے نقصان نہ پہنچایا جائے اور نہ ہی والد کو بچے کی وجہ سے ضرر پہنچایا جائے۔

وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ۔ (البقرہ ۲۸۱) — کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ حدیث نبوی قرآن کی شارح ہے اور اس کے کلی اور جزئی مقاصد کو واضح کرتی ہے۔

دوسرا جواب: دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث نبوی مستقل ماخذِ تشریع ہے۔ ضروری نہیں کہ حدیث میں بیان کردہ احکام اجمالاً قرآن حکیم میں مذکور ہوں۔ اس لیے

کہ بذاتِ خود قرآن نے اطاعتِ رسولؐ کو اطاعتِ خداوندی قرار دیا اور فرمایا ہے کہ ہمارا رسولؐ وحی کے بغیر بولتا ہی نہیں۔ اگر رسول کی اطاعت صرف انہی احکام تک محدود ہے جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔ تو پھر آپ کی خصوصی اطاعت کا کیا مطلب؟ حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ (النساء ۵۹) — اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (النساء ۸۰) — جو رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔

پہلی آیت میں "اَطِیْعُوْا" فعل امر حاضر کو مکرر لایا گیا ہے۔ دوسری آیت میں اطاعتِ رسولؐ کو اطاعتِ خداوندی قرار دیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حضورؐ کی اطاعت مطلق اور بدوں قید و شرط ہے۔

باقی رہا قرآن کریم کا ارشاد لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حضورؐ صرف قرآن کی شرح و تعبیر کے مجاز ہیں۔ بخلاف ازیں اس آیت اور سابقہ دونوں آیات سے مستفاد ہوتا ہے کہ آپ قرآن کی توضیح بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جب ایسے احکام بیان کرتے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں، تو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ بلکہ وحی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ علمائے سلف کی ایک جماعت نے اس کی تصریح بھی کی ہے۔

عبدالرحمٰن بن یزید سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک محرم کو دیکھا جس نے سلے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ عبدالرحمٰن کے منع کرنے پر اس نے کہا کہ قرآن کی کوئی آیت پیش کیجیے۔ عبدالرحمٰن نے یہ آیت پڑھی۔ وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔

طاؤس سے مروی ہے کہ وہ عصر کے بعد دو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا "ان کو چھوڑ دیجیے"۔ طاؤس نے کہا کہ ان کو سنت بنانا منع ہے صرف ادا کرنا نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا رسول کریمؐ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا تمہیں ان کا اجر ملے گا یا عذاب ہوگا۔ اس لیے کہ فرمانِ خداوندی ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ	کسی مومن مرد و عورت کو زیب نہیں دیتا کہ جب اللہ
إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا	اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کو
أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ	کوئی گنجائش بھی باقی رہے۔
أَمْرِهِمْ۔ (الاحزاب ۔ ۳۶)	

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی قسم کی ایک روایت منقول ہے۔
(الموافقات للشاطبی ج ۴ ص ۴۲ تا ۴۸)

ہمارے نقطہ نظر کے مطابق سابق الذکر اعتراض کے دونوں جوابوں میں کوئی تخالف و تضاد نہیں پایا جاتا۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ حدیث نبوی ایسے احکام پر مشتمل نہیں ہو سکتی جو قرآن سے زائد ہوں۔ اور اس میں مذکور نہ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جملہ احکام پر بطریق اجمال یا تفصیل حاوی ہے۔ اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ حدیث قرآن سے زائد احکام پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں ایسے تفصیلی احکام مذکور ہوتے ہیں۔ جن کا ذکر صراحتہً قرآن میں نہیں کیا گیا۔ اس طرح دونوں جواب ایک ہی نقطہ پر متحد ہو جاتے ہیں۔

حدیث نبوی شرعی احکام کے علاوہ دیگر امور میں بھی قرآن کی شرح و توضیح کرتی ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ حدیث نبوی قرآن سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور اس کی تائید و حمایت کے

علاوہ اس کی شرح و تفصیل پیش کرتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر کا واقعہ جو صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ یہ واقعہ سورہ کہف میں بیان کردہ قصّہ کے مطابق ہے۔

۲۔ دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جو قرآن کی شرح و تفسیر کرتی ہیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ حضرت نوح علیہ السلام کو روزِ قیامت بلاکر پوچھا جائے گا۔ کہ کیا آپ نے شرعی احکام لوگوں تک پہنچا دیئے تھے؟ وہ اثبات میں جواب دیں گے۔ پھر ان کی قوم کو بلاکر پوچھا جائے گا۔ تو وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی نبی آیا ہی نہیں۔ حضرت نوحؑ سے پوچھا جائے گا آپ کا گواہ کون ہے؟ فرمائیں گے حضرت محمدؐ اور ان کی اُمّت۔ پھر امتِ محمدی حضرت نوحؑ کی تائید میں شہادت دے گی کہ آپ نے شرعی احکام بلاکم وکاست اپنی اُمّت تک پہنچا دیئے تھے۔ تب حضور اکرم صلی اللہ علیہ السلام نے فرمایا۔ اس بات کی تائید مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرۃ ۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانہ امت بنایا ہے۔ تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

۳۔ تیسری قسم کی وہ احادیث ہیں جو مستقل ہیں اور کسی قرآنی آیت کی شرح و تفسیر میں وارد نہیں ہوئیں۔ مثلاً وہ حدیث جس میں جُریج عابد کا واقعہ مذکور ہے یا ایک کوڑھی ایک گنجے اور ایک اندھے شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یا وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ چند شخص غار میں داخل ہوئے اور اُوپر سے پتھر کے لڑھکنے سے غار کا دروازہ بند ہوگیا۔ وہ تین شخص تھے۔ انہوں نے باری باری اعمال کو بطور وسیلہ پیش کرکے بارگاہ ایزدی میں دعا کی تو غار کا منہ کھل گیا۔ ایسی احادیث لوگوں کو اعمال صالحہ پر آمادہ کرنے اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔

حدیث نبوی مختلف ادوار میں

پہلا دور

حدیث نبوی عہد رسالت میں

یہ باب چار مباحث پر مشتمل ہے۔

۱۔ حفاظتِ حدیث میں صحابہ کا کردار۔

۲۔ سرورِ کائنات صلعم کی علمی مجالس۔

۳۔ اخذ حدیث کے سلسلہ میں صحابہ کا طرز و انداز۔

۴۔ حدیث کی نشر و اشاعت میں قبائلی وفود کا حصّہ۔

۱۔ حفاظتِ حدیث میں صحابہ کا کردار: بعثتِ محمدی سے قبل عربوں پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جہالت کی حد یہ تھی۔ کہ جو بت انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں کے ساتھ پتھروں سے تراشے تھے۔ ان کو معبود بنا رکھا تھا۔ ان کی سنگدلی کا یہ عالم تھا کہ عار یا تنگ دستی کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کر ڈالتے تھے۔ جنگجو اور خونخوار اس قسم کے تھے کہ معمولی معمولی باتوں پر دشمن کو لوٹ لیتے اور اس پر دھاوا بول دیتے تھے۔ جاہلی حمیت و غیرت اور قبائلی تعصب ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ شراب اور جُوا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔

لڑائیوں کا سلسلہ جب ایک دفعہ شروع ہو جاتا تو سالہا سال تک رُکنے میں نہ آتا۔ نہ کوئی حاکم تھا جو منکرات سے ان کو روکتا۔ اور نہ وہ کسی مذہب کے پیرو تھے۔ جو

ان کو بُرائیوں سے باز رکھتا۔ بہر کیف دورِ جاہلیت پر تاریکی کے سائے دراز تھے۔ اور ضلالت و جہالت نے ان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا جس کے نتیجہ میں جزیرہ نمائے عرب حرب و پیکار گاہ بن چکا تھا۔ خدا کی زمین اس خونریزی سے تنگ آ چکی تھی۔ اور اس پر بسنے والے انسان ایسے شخص کی تلاش میں تھے۔ جو ان کو اس تیرہ و تار وحشت و جہالت سے نجات دلا سکے۔ مگر اس میں کامیابی کی راہ انہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان کی حالت بعینہٖ اس شخص جیسی تھی جو پیاس کی شدت میں مبتلا ہو کر پانی کے لیے ہاتھ مارتا ہو مگر پانی میسر نہ آ سکے۔

خداوند رحیم و کریم کو عربوں کی حالتِ زار بلکہ پوری انسانیت پر ترس آیا اور اس نے عربوں ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ یہ رسول ان کو آیاتِ خداوندی پڑھ کر سناتا، ان کا تزکیہ نفس کرتا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا۔ اس رسول کا اسمِ گرامی محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب تھا۔ آپ حسب و نسب کے اعتبار سے سب سے اعلیٰ اور قریش کے بزرگ ترین قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

سرورِ کائنات ؐ نے اسلامی دعوت و ارشاد کا کام رازدارانہ طور پر رفتہ رفتہ شروع کیا تاکہ یہ جہالت زدہ قوم بدک نہ جائے۔ اس دعوت کے نتیجہ میں چند افراد آپ پر ایمان لائے۔ جن کی تعداد ہاتھوں کی انگلیوں سے زیادہ نہ تھی۔ پھر آپ نے علانیہ دعوت کا آغاز کیا اور بڑے بڑے لوگ مشرف باسلام ہوئے۔ ان لوگوں نے علیٰ وجہ البصیرت (بلاجبر و اکراہ) اسلام کو اختیار کیا۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں بیان کردہ احکام سُنے۔ اسلام کو سوچ سمجھ کر اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایمان ان کے رگ و پے میں سما گیا۔

اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے ہی شرک کی تاریکیوں سے نجات حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ اسلام نے رشد و ہدایت کے پیاسے دلوں کو پایا اور ان میں

داخل ہوگیا۔ ایمان ان کے رگ وپے میں خون کی طرح جاری وساری ہوگیا۔ ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ دین ہی ان کی سعادت کا منبع اور اسی کے ساتھ ان کا عزّ وشرف وابستہ ہے۔ اس لیے وہ دین کی پیروی کے لیے کمربستہ ہوگئے۔

صحابہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل وجان سے شیدا تھے اور آپ کو اپنے والدین اور بال بچوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ قرآن ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ اس کو نوک زبان یاد کرتے اور اس کی شرح وتفسیر معلوم کرنے میں لگے رہتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی جو تفسیر بیان کرتے یا اسلامی احکام پر روشنی ڈالتے، صحابہ اس کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ پھر ہجرتِ مدینہ کا واقعہ پیش آیا اور سماعِ قرآن اور حضورؐ کی علمی مجالس سے استفادہ کا دائرہ وسیع ہوگیا۔

حضرات صحابہؓ حدیث نبوی کی اہمیت سے واقف تھے۔ اور جانتے تھے کہ دین اسلام میں کتاب اللہ کے بعد اس کو دوسرا درجہ حاصل ہے۔ وہ اس بات سے بھی آگاہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حدیث کی پیروی کا حکم دیا اور اس کی خلاف ورزی سے باز رکھا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ حدیث کے معاملہ میں افراط وتفریط سے کام لینے والا بدبخت انسان ہے۔ اور جو شخص حدیث کو یاد کرتا اور اس پر عمل کرتا ہو وہ خوش نصیب آدمی ہے۔

صحابہ کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ قرآن عزیز نے علم اور علماء کا مرتبہ بلند کیا ہے۔ اور جہالت وجہلاء کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ کہہ دیجئے کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے

وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الزمر ۹) برابر ہیں۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ۔ (المجادلہ) اللہ تعالیٰ تم میں سے اصحاب علم و ایمان کے درجات بلند کرتا ہے۔

علمِ دین اور اس کی تبلیغ کی فضیلت ان الفاظ میں واضح فرمائی۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۔ (التوبہ ۱۲۲) سب مومنوں کو (طلب علم کے لئے) گھر سے نہیں نکل جانا چاہیے ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ایک جماعت میں سے کچھ لوگ دین کا علم حاصل کرنے کے چلے جائیں اور جب واپس آئیں تو اپنی قوم کو ڈرائیں تاکہ وہ پرہیز کریں

علم کو چھپانے اور اس کا اظہار نہ کرنے کے سلسلہ میں جو وعید شدید وارد ہوئی ہے۔ صحابہ اس سے بھی آگاہ تھے۔ قرآنِ عزیز میں فرمایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (البقرہ ۱۵۹) بے شک وہ لوگ جو ان دلائل اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جس کو ہم نے اتارا ہے اس کے بعد کہ ہم نے اس کو لوگوں کے لیے کتاب میں واضح کر دیا ہے۔ ان پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور لعنت بھیجنے والے (فرشتے) بھی۔

جس طرح قرآنی نصوص میں دینی علم حاصل کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کی فضیلت بیان کی گئی ہے اسی طرح بکثرت احادیث نبویہ علوم دینیہ کی تحصیل و تبلیغ اور کتمانِ علم کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں۔

چند احادیث ملاحظہ ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

۱- اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ (صحیح بخاری و مسلم)

۲- دنیا و ما فیہا ملعون ہے سوائے ذکرِ الٰہی اور عالم و متعلم کے۔ (ترمذی)

۳- اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سُنی اور اسے بلا کم و کاست آگے پہنچا دیا۔ اس لیے کہ جن کو بات پہنچائی جاتی ہے ان میں سے بعض سننے والوں سے بھی زیادہ یاد رکھتے ہیں۔ (ترمذی)

۴- جو شخص کسی راہ پر اس لیے چلا کہ علم حاصل کرے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنّت کے راستہ کو آسان کر دیتا ہے۔ (صحیح مسلم)

۵- جس شخص سے کوئی علمی مسئلہ دریافت کیا جائے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے روز اس کو آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ (ابو یعلیٰ)

مذکورہ بالا آیات و احادیث حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رگ و پے میں سما گئیں اور ان کے قلوب و اذہان پر چھا گئی تھیں۔ ان کے دل اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے بھرپور و معمور تھے۔ ان کے نفوس میں علم و عمل کی شمع فروزاں تھی۔ چنانچہ انہوں نے دینی احکام و سنن کے تحفّظ و نگہداشت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ اس کی خاطر انہوں نے اپنے مال و جان کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ مزید برآں دینی حمیّت و غیرت کے پہلو بہ پہلو صحابہ حد درجہ کی فطری استعداد سے بھی بہرہ ور تھے۔ ان کی قوتِ حافظہ اور ذہانت و فطانت ضرب المثل کی حد تک مشہور تھی اور اس ضمن میں وہ یگانہ روزگار تھے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ خالص عرب تھے اور لکھنے پڑھنے سے آشنا نہ تھے اکثر و بیشتر وہ اپنے حافظہ پر اعتماد کرنے کے عادی تھے۔ دورِ جاہلیّت میں ان کی حالت یہ تھی کہ اشعار خطبات اور انساب و مناقب ان کو زبانی یاد ہوا کرتے تھے

اکثر ایسا ہوتا کہ حسب و نسب میں ایک دوسرے پر فخر کا اظہار کرتے۔ اس سلسلہ میں اپنے اور دشمن کے جو اخبار و واقعات ان کو یاد ہوا کرتے تھے، بیان کرتے اور اس طرح مخالفین پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھاتے۔ ہر شخص اپنی عقل اور قوتِ حافظہ کی حد تک اپنے قبیلہ کا ترجمان ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے قبیلہ کے اوصاف و محاسن بیان کرتا اور قبیلہ اس کو خراج تحسین پیش کرتا تھا۔ گویا قبیلہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے۔ جو اخبار و حوادث سے بھرپور ہے۔ عربوں کے اندر حسب و نسب پر فخر کرنے اور دوسروں کے عیوب و نقائص گنوانے کا جو ملکہ راسخ ہو چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جو قبائلی تعصب ان میں پایا جاتا تھا۔ وہ ان کی قوتِ حفظ و ضبط کے لیے مزید معاون ثابت ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قوت حافظہ میں دنیا کی کوئی قوم عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

گویا خداوند کریم نے اس امت عربیہ کو یہ حیرت ناک استعداد دے کر اسی لیے خلق فرمایا تھا کہ رسالتِ محمدیؐ کے لیے اساس و بنیاد کا کام دے سکے۔ چنانچہ اس امت کے سینے آیات قرآنی کے سفینے قرار پائے اور ان کی قوتِ حفظ و ضبط سے بھرپور دل حدیث نبوی کے ملجا و مامن ٹھہرے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ حضور کے صحابہ والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ حدیث کے اخذ و تحمل میں لگ گئے اور ان کی برکت سے خداوند کریم نے اس دین کو جملہ مذاہب عالم پر برتری عطا فرمائی۔

خلاصہ یہ کہ امت عربیہ میں روحانی و فطری دو قسم کے عوامل جمع ہو گئے تھے۔ جن کی بدولت وہ امت ایسے کارنامے انجام دے سکی جو کسی قوم نے آغاز آفرینش سے انجام نہیں دیئے تھے۔ انہوں نے کتاب و سنت کی حفاظت و صیانت کا فریضہ بطریق احسن ادا کیا۔ حضورؐ کی لائی ہوئی شریعت کو دینی و دنیوی جملہ امور میں مشعلِ راہ بنایا اور جوں کی توں اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔

۲۔سرورِ کائنات کی علمی مجالس: سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح قرآنِ عزیز کے احکام پر روشنی ڈالتے اور دعوت و ارشاد کے فریضہ کی ادائیگی فرماتے تھے، اس کی ایک جھلک آپ دیکھ چکے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے کوئی سکول یا کالج تعمیر کر رکھا تھا اور حسب قاعدہ اس میں بیٹھ کر صحابہؓ کو پڑھایا کرتے تھے۔ بخلاف ازیں ہوتا یوں تھا کہ جہاں بھی موقع ملتا آپ علمی مجالس جما لیتے۔ میدانِ جہاد میں جرأت و جلادت کی تلقین کر کے دلوں کو گرماتے سفر میں ہوتے تو لوگوں کو رُشد و ہدایت کی راہ دکھاتے۔ گھر میں مقیم ہوتے تو اہلِ خانہ کو تعلیم دیتے۔ مسجد میں ایک مدرس، خطیب، قاضی اور مفتی کا پارٹ ادا کرتے۔

تعلیم و تدریس کی حد یہ ہے کہ راہ چلتے لوگوں کو کھڑا کر کے دینی مسائل سمجھاتے۔ گویا یوں کہیے کہ حالت کوئی اور کیسی بھی ہو، آپ ایک مُرشد، ناصح اور معلّم کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی بھی سہل انگاری سے کام نہ لیتے۔ جب لوگ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں حاضر ہوتے تو بسا اوقات آپ علمی مجالس منعقد کر کے ان کو وعظ و تذکیر فرمایا کرتے تھے۔ مگر لوگوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ ہمیشہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ مبادا اکتاہٹ و بیزاری کے آثار پیدا ہو جائیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور بیزاری کے ڈر سے کبھی کبھی ہمیں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی علمی مجالس میں ایسی پاکیزہ اور مفید باتیں ارشاد فرماتے جن سے صحابہ کو شرح صدر عطا ہوتا اور ان کے دل نور ایمان سے جگمگا اُٹھتے۔ صحابہؓ ان علمی مجالس میں اپنے بچوں کو بھی ہمراہ لاتے تھے۔ تاکہ وہ بھی حضورؐ کے ارشادات گرامی سے مستفیض ہوسکیں اور مجلس نبوی کے آداب سیکھیں۔ بعض اوقات آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا اور آپ اس کا جواب ارشاد فرماتے۔ گاہے کوئی حادثہ رُونما ہوتا اور آپ اس کے بارے میں حکم خداوندی سے آگاہ فرماتے۔ یا کوئی قرآنی آیت نازل ہوتی اور آپ اس کی

تفسیر کرتے۔ بعض اوقات آپ کے سامنے کوئی کام کیا جاتا اور آپ خاموش رہتے۔ یہ اس جانب اشارہ تھا کہ یہ کام شرعاً جائز ہے اور ممنوع نہیں۔

حضورؐ کی نسبت یہ گمان درست نہیں کہ آپ بادشاہوں کی طرح لوگوں سے الگ تھلگ رہا کرتے تھے۔ اور افرادِ امت کے ساتھ گھل مل کر رہنے کو ناپسند کرتے تھے۔ بخلاف ازیں آپ لوگوں کے ساتھ میل جول کو پسند فرماتے تھے۔ لوگوں کو وعظ فرماتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کرتے۔ جنازہ میں شرکت کرتے۔ لوگوں کے جھگڑے چکاتے اور ان کے متنازعہ امور فیصل کرتے۔ صحابہ حضورؐ کے ان سب معاملات کو بچشم خود دیکھتے اور آپ کے ارشادات کو دل کے کانوں سے سنتے۔

مگر یہ امر پیش نظر رہے کہ سب صحابہؓ آنحضورؐ کی علمی مجالس سے اخذ و استفادہ میں مساوی نہ تھے۔ کچھ خوش نصیب ایسے بھی تھے۔ جو ہر جگہ حضورؐ کے وابستۂ دامن رہتے اور سفر ہو یا حضر، کسی حالت میں بھی آپ سے الگ نہیں ہوتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ و حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ بعض ایسے بھی تھے جو زراعت و تجارت اور دیگر معاشی امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے ہر وقت حاضری سے معذور تھے۔ مگر بایں ہمہ حدیث نبوی کے ساتھ ان کی شیفتگی و دل بستگی کا یہ عالم تھا کہ جب واپس آتے تو دیگر صحابہؓ سے پوچھ کر وہ احادیث یاد کر لیتے جو ان کی عدم حاضری میں آپ نے ارشاد فرمائی ہوتی تھیں۔ بعض صحابہؓ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ ایک روز خود اور ایک روز ان کا پڑوسی باری باری خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور جو کچھ سنتے ایک دوسرے کو بتا دیتے جیسا کہ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور ان کے ایک انصاری پڑوسی کے بارے میں منقول ہے کہ دونوں باری باری آنحضورؐ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور جو کچھ دیکھتے یا سنتے، ایک دوسرے کو بتا دیتے۔ (صحیح بخاری)

مدینہ منورہ سے دور رہنے والے صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ جب کسی نئے مسئلے سے

دوچار ہوتے اور اسے حل نہ کر پاتے تو اونٹوں پر سوار دُور دراز کا سفر طے کرتے اور مدینہ پہنچ کر یہ مسئلہ دریافت کرتے۔ بعض اوقات کئی کئی دن اور راتیں سفر میں لگ جاتیں چنانچہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نے انہیں بتایا کہ "میں نے تم اور تمہاری بیوی دونوں کو دودھ پلایا ہے"۔ یہ سن کر وہ مکّہ سے روانہ ہوئے اور مدینہ پہنچ کر حضورؐ سے یہ مسئلہ دریافت کیا۔ حضورؐ نے فرمایا جب تم دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا ہے تو تمہاری بیوی تمہارے نکاح میں کیسے رہ سکتی ہے؟ چنانچہ حضرت عقبہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ (صحیح بخاری)

سالارِ رُسل صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ آپ کے بعد دعوت و ارشاد کا کام صحابہؓ کے کندھوں پر آپڑے گا۔ اس لیے آپ اپنے تعلیمی اسباق میں اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اس کام کے لیے صحابہؓ کو تیار کیا جائے۔ چنانچہ ذیل میں ہم حضورؐ کی اس خصوصی تربیت کا ذکر کریں گے جو صحابہ کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ اور صحابہؓ حضورؐ کے بعد اس کی روشنی میں دعوت و ارشاد کا فریضہ بجالاتے رہے۔

حضورؐ صحابہؓ کو جو تربیت دیتے تھے اس کے خصوصی پہلو حسب ذیل تھے۔

۱۔ جب حضورؐ سے کوئی ایسی بات دریافت کی جاتی جو آپ کو معلوم نہ ہوتی تو آپ سکوت اختیار کرتے۔ اور وحی کا انتظار کرتے۔

۲۔ حضورؐ کی یہ عادتِ مبارکہ تھی کہ جو بات کرتے اسے تین مرتبہ دہراتے تاکہ آپ کی بات اچھی طرح سمجھی جاسکے۔

۳۔ بعض اوقات صحابہؓ کی ذہانت و فطانت معلوم کرنے کے لیے ان سے بعض مسائل دریافت فرمایا کرتے تھے۔

۴۔ جب آپ سے کوئی سوال کیا جاتا تو آپ جواب دیتے اور حاضرین کے فائدہ کے لیے جواب سے ملتے جلتے مسائل بھی بیان کردیتے۔

۵۔آپ وعظ ناغہ کے ساتھ فرمایا کرتے تھے تاکہ سامعین اکتا نہ جائیں۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ نے ان سے عرض کی کہ آپ ہر روز ہمیں حدیثیں سنایا کریں تو انہوں نے تسلیم نہ کیا اور کہا میں ناغہ سے تمہیں حدیثیں سنایا کروں گا۔کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ناغہ کے ساتھ وعظ فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ اکتا نہ جائیں۔

۶۔حضورؐ بعض صحابہ کو خصوصی مسائل سے آگاہ کرتے،جب کہ دوسروں کو یہ علمی باتیں نہ جاتیں۔مبادا کہ وہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔

اور دیگر امثلہ جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضورؐ کس طرح صحابہ کی علمی تربیت فرماتے تھے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت ہی کا خوشگوار ثمرہ تھا کہ صحابہؓ کو جلیل القدر اساتذہ کی حیثیت حاصل ہوئی۔اور وہ دینی احکام و مسائل کے امین قرار پائے۔

۳۔اخذ حدیث کے سلسلہ میں صحابہ کا طرز و انداز:

اصحاب رسولؐ میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔اکثر و بیشتر ان میں سے ناخواندہ تھے۔یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث سیکھتے وقت وہ زیادہ تر اپنے حافظہ پر اعتماد کیا کرتے تھے۔حفظ پر بھروسہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آغازِ اسلام میں ان کو کتابتِ حدیث سے منع کر دیا گیا تھا۔مبادا وہ قرآن عزیز کے ساتھ مل جل جائے۔اور دونوں میں امتیاز مشکل ہو۔صحابہؓ یا تو آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر بالمشافہ احادیث اخذ کرتے یا آپ کے افعال و تقریرات کو بچشم خود دیکھ کر دوسروں تک پہنچاتے۔یا دیگر صحابہ سے احادیث سنتے۔جنھوں نے بذات خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ احادیث سنی تھیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ سب صحابہ آنحضورؐ کی علمی مجلس میں حاضر ہو کر استفادہ کرنے سے قاصر تھے۔وہ اپنے کام کاج کے سلسلہ میں لگے رہتے تھے۔

چونکہ سب صحابہؓ آنحضور سے استفادہ کرنے میں یکساں نہ تھے۔اسی لیے ان کی مرویات

میں بھی فرقِ مراتب پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض احادیث تواتر کے درجہ پہ فائز ہیں جب کہ بعض ایسی نہیں۔ متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو روایت کرنے والے اشخاص اس قدر زیادہ ہوں کہ عقل انسانی ان کے کذب پر متفق ہونے کو محال سمجھتی ہو۔ متواتر کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ متواتر لفظی :۔ ایسی احادیث بہت کم ہیں مثلاً "من کذب علیّ متعمّداً فلیتبوّء مقعدہ من النّار"۔

۲۔ متواتر معنوی :۔ ایسی احادیث کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مثلاً طہارت۔ نماز روزہ اور حج وزکوٰۃ کے احکام سے متعلق احادیث اور وہ احادیث جن میں بیع کے اقسام نکاح اور غزوات کا ذکر کیا گیا ہے اور جن کے بارے میں سب فرقہ ہائے اسلامی متفق الخیال ہیں۔

بعض احادیث وہ ہیں جو تواتر کے درجہ تک نہیں پہنچ سکیں۔ ان کو "اخبارِ آحاد" کہتے ہیں۔

صحابہ کرام احادیث نبویہ کو زبانی یاد کر لیا کرتے اور لوگوں کو مل کر پہنچا دیا کرتے تھے۔ البتہ صحابہؓ میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو نبی کریمؐ نے حدیثیں لکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ میں جو چیز بھی آنحضورؐ سے سنتا اس کو حفظ کرنے کے ارادہ سے لکھ لیا کرتا تھا۔ قریش نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا کہ "تم رسول اللہؐ سے جو چیز بھی سنتے ہو اس کو لکھ لیتے ہو۔ حالانکہ آپ بھی ایک انسان ہیں۔ کبھی آپ غصہ میں ہوتے ہیں اور کبھی حالتِ رضا میں۔ اس لیے ہر چیز کا لکھ لینا موزوں نہیں"۔ چنانچہ میں نے لکھنا بند کر دیا اور نبی کریمؐ کی خدمت میں ماجرا بیان کیا۔ حضورؐ نے فرمایا "لکھتے رہو مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میری زبان سے جو بات بھی نکلتی ہے حق ہوتی ہے"۔ (مسند احمد)

جس طرح سب صحابہؓ لکھنے پڑھنے سے آشنا ہونے اور نہ ہونے، نیز حضورؐ کی علمی مجالس میں حاضری دینے کے اعتبار سے مساوی الدرجہ نہ تھے۔ اسی طرح حضورؐ سے روایات کے اخذ و تحمل اور اس کو لوگوں تک پہنچانے کے سلسلے میں بھی یکساں نہ تھے۔ چنانچہ ان میں قلیل الروایت اور کثیر الروایت دونوں قسم کے صحابہؓ پائے جاتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

اصحابِ رسولؐ میں کوئی صحابی بھی مجھ سے کثیر الروایت نہ تھا بجز عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔ جبکہ میں لکھا نہیں کرتا تھا۔ (بخاری کتاب العلم)

جس طرح صحابہؓ رسول کریمؐ سے روایات اخذ کرنے میں متفاوت الدرجہ تھے۔ اسی طرح حدیث نبوی کے فہم و ادراک میں بھی سب کی حالت یکساں نہ تھی اور اس کی وجہ فطری استعداد کا فرق و تفاوت ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ناسخ و منسوخ عام و خاص مطلق و مقید اور مجمل و مفسر احادیث کے جاننے پہچاننے میں بھی سب صحابہ مساوی الدرجہ نہ تھے۔ تاہم جب ان کے یہاں کسی مسئلہ میں اختلاف رُونما ہوتا تو وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رجوع کیا کرتے۔ اور آپ اس میں منصفانہ فیصلہ صادر فرمایا کرتے تھے۔

اشاعتِ حدیث میں خواتین کا حصہ:

سالارِ رُسل صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی مجالس کا سلسلہ مردوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ بکثرت خواتین مسجد نبوی میں حاضر ہو کر احادیث نبویہ سُنا کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں حضورؐ کی عام مجالس مثلاً عید کے اجتماع میں شرکت کر کے آپ کے مواعظِ حسنہ سے مستفید ہوتیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ مردوں کی اگلی صفوں میں خطبہ دے کر عورتوں کی صفوں کی طرف تشریف لاتے تھے اور ان کو دینی احکام سے آگاہ فرماتے۔ مگر اکثر و بیشتر حضورؐ کی علمی مجالس میں زیادہ مرد ہی ہُوا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ خواتین

کے ایک وفد نے آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ ہمارے لیے ایک دن مقرر کر کے اس میں ہمیں دینی مسائل سے آگاہ فرمایا کریں۔ آپ نے اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔

تاہم اس کے یہ معنی نہیں کہ ان عمومی یا خصوصی مجالس سے خواتین کی دینی ضروریات پوری ہوگئی تھیں۔ بخلاف ازیں ان کو نئے نئے مسائل سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو اسلام کو قبول کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ جب کسی خاتون کو کوئی نیا مسئلہ پیش آتا تو وہ آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ سے اس کا حل دریافت کرتی۔ ایسا کرتے ہوئے حیاء کا جذبہ ان کی راہ میں اس لیے حائل نہیں ہُوا کرتا تھا کہ دینی مسائل سیکھنے میں حیاء کو مانع نہیں ہونا چاہیے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی شرمیلی مسلم خاتون دینی مسئلہ دریافت کرنے سے پہلے یہ جملہ دُہراتی کہ "یارسول اللہ خداوند کریم شرم کی بناپر حق مسئلہ دریافت کرنے سے نہیں روکتا" پھر بارگاہِ نبوی میں عرض پرداز ہوتی کہ "جب عورت کو احتلام ہو جائے تو کیا اس پر غسل واجب ہے؟" انصاری خواتین اس ضمن میں زیادہ بے باک واقع ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو ان کی شان میں یہ فقرہ کہنا پڑا۔ کہ

"انصاری خواتین کیا خوب ہیں۔ حیا ان کو دینی مسائل سیکھنے سے نہ روک سکی۔"

(صحیح بخاری)

اگر کوئی شرمیلی خاتون براہ راست آنحضورؐ سے مسئلہ دریافت نہ کرسکتی تو امہات المومنین رسول کریمؐ سے پوچھ کر اس کو مسئلہ سے آگاہ کردیتیں۔

امہات المومنین مبلّغ احادیث کی حیثیت سے:

مسلم خواتین میں امہات المومنین نے حدیثِ نبوی کی نشرواشاعت میں جو پارٹ ادا کیا تھا، اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصًا

خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدماتِ جلیلہ اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ آپ حد درجہ ذہین و فطین تھیں۔ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی مسائل دریافت کرتیں اور اکثر قرآنی آیات و احادیث کی شرح و تفسیر کے بارے میں سوال کیا کرتی تھیں۔

ابن ابی ملیکہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جو مسئلہ معلوم نہ ہوتا اور وہ کسی سے سنتیں تو اس کے بارے میں بحث و تمحیص اور نقد و جرح کرتیں حتیٰ کہ اس مسئلہ سے آگاہ ہو جاتیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص سے حساب لیا جائے گا اسے عذاب ہوگا"۔ حضرت عائشہ نے یہ سن کر سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے "فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا" (اس سے آسان حساب لیا جائے گا) حضورؐ نے فرمایا "یہ تو اعمال کے پیش کرنے کے وقت ہوگا۔ البتہ جس پر محاسبہ اعمال کے وقت جرح و قدح کی جائے گی اسے سخت عذاب دیا جائے گا"۔ (صحیح بخاری)

جن حِکَم و مصالح کے پیش نظر خداوندِ کریم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چار سے زیادہ ازواج کی اجازت دی تھی، اُن میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ ازواج مطہرات فریضہ دعوت و ارشاد بجا لائیں۔ خصوصاً ایسے مسائل جو آپ صحابہ کے سامنے انجام نہیں دے سکتے یا شرماتے ہیں۔ اور ازواج مطہرات کے سوا کوئی ان سے آگاہ نہیں ہو سکتا اسی لیے جب حضورؐ کے صحابہ آپ کے بعد کسی مسئلہ میں مختلف الرائے ہوتے، مثلاً غسل، حیض اور جماع کی قسم کے مسائل، تو امہات المؤمنین کی جانب رجوع کرتے اور ان کے فیصلہ کو تسلیم کر لیتے۔ اس طرح ان کا باہمی نزاع و جدال ختم ہو جاتا۔

۴۔ حدیث کی نشر و اشاعت میں قبائلی وفود کا کردار:

دعوتِ محمدی کا آغاز پوشیدہ طور پر ہوا اور تین سال تک یونہی رہا۔ جب کچھ لوگ مشرف باسلام ہو گئے تو آپ کو علانیہ دعوت کا حکم ملا۔ قریش نے آپ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کچھ عرصہ تک یہی کیفیت رہی، حتیٰ کہ اکثر

اہل مدینہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو آپ کو ہجرتِ مدینہ کا حکم ہُوا۔ چنانچہ آپ اپنے اصحاب سمیت عازمِ مدینہ ہوئے۔ مدینہ اس وقت سے مہبطِ وحی اور مرکز اسلام ٹھہرا۔ مدینہ میں مقیم رہ کر آپ نے اعدائے دین کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور وہیں آپ نے احادیث کی نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیا۔ مگر قتال و جہاد کا سلسلہ جس طرح بہت سے قبائل کے حلقہ بگوش اسلام ہونے میں سدِ راہ تھا۔ اسی طرح بیرونِ عرب دعوتِ اسلامی کے پھیلنے کی راہ میں بھی رکاوٹ بنا ہُوا تھا۔ جونہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مکہ کے مابین صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہُوا اور فریقین کو باہم ملنے جلنے اور اس نئے دین کے بارے میں غور و خوض کرنے کے مواقع میسر آئے تو اسلام کو بیش از بیش پھیلنے کا موقع ملا۔ چنانچہ آپ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اطراف و اکناف کے سلاطین کو دعوتِ اسلام پر مشتمل خطوط ارسال فرمائے جو قبیلے مشرف باسلام ہو چکے تھے، ان کو دینی احکام سکھلانے کے لیے حضورؐ نے اطرافِ ملک میں وفود بھیجنے کا آغاز کیا۔ چنانچہ آپ نے یمن، بحرین، یمامہ، حضرموت، عمان اور دیگر بلاد و دیار میں مسلمانوں کے وفد بھیج کر ان کو اسلامی احکام سے آگاہ کیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے یہ وفود لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت کے پیامبر ثابت ہوئے۔ اس لیے کہ یہ لوگوں تک قرآن و سنت کی وہ غذا پہنچاتے تھے جس پر روحانی زندگی کا مدار و انحصار ہے۔ اس کے دوش بدوش یہ وفود اطراف عرب میں حدیث نبوی کی نشر و اشاعت کا زبردست ذریعہ تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصد کے لیے ایسے صحابہ کو منتخب فرمایا کرتے تھے جو کتاب و سنت میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ آپ ان کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے اور دعوت و ارشاد کے مناسب طریقوں سے آگاہ فرماتے چنانچہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن بھیجا تو ارشاد فرمایا۔

"آپ کی ملاقات اہل کتاب کی ایک قوم سے ہوگی۔ جب آپ ان سے ملیں تو کہیں کہ

اللہ تعالیٰ نے تم پر شب و روز میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ آپ کی اطاعت کرنے پر رضامند ہوں تو ان سے کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں تم پر ماہ رمضان کے روزے فرض کیے ہیں۔ اگر وہ اس کو بھی تسلیم کر لیں تو ان سے کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے جو اس کی استطاعت سے بہرہ ور ہو۔ اگر وہ اس کی بھی اطاعت کریں تو کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مالوں میں زکوٰۃ فرض کی ہے جو دولتمندوں سے لے کر تنگدستوں میں بانٹی جاتی ہے۔"

غرض یہ کہ آپ کا فرستادہ شخص حسب موقع و مقام دینی احکام و مسائل جو اسے معلوم ہوتے بیان کیا کرتا تھا۔ یہ حضور کی اسی رہنمائی کا نتیجہ تھا کہ یہ وفود حدیث نبوی کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بڑے مفید ثابت ہوئے۔

مدینہ پہنچنے والے قبائلی وفود: جب عہد رسالت میں اسلامی فتوحات کا دائرہ پھیلا اور غزوہ تبوک سے فارغ ہوئے۔ تو عربی قبائل کے وفد اپنے اونٹوں کو ہانکتے اور سفر کی وسعتوں کو سمیٹتے ہوئے نبی امین کی ملاقات کا شوق لے کر مدینہ حاضر ہوئے۔ تاکہ دین کے اولین سرچشمہ سے اپنی علمی پیاس بجھائیں۔ وہ قبائل اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہو چکے تھے کہ جب قریش نے اسلام کے جھنڈے تلے اپنا سر جھکا دیا ہے تو بھلا وہ رسول کریم کے خلاف کیسے نبرد آزما ہو سکیں گے اور قریش کی قیادت و سیادت ان سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ چنانچہ یہ قبائل جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور انفرادی یا اجتماعی طور پر حضور کی خدمت اقدس میں باریاب ہوئے۔ قرآن اسی ضمن میں فرماتا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ (النصر)

جب اللہ کی مدد اور فتح آگئی۔ اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔

یہ وفود یکے بعد دیگرے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ اسی طرح بیرونی سلاطین کے خطوط اور قاصد یہ پیغام لے کر حاضر ہوئے کہ ہم نے اسلام کو قبول کر لیا اور شرک کو ترک کر دیا ہے۔ جو وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، آپ اس کا اکرام واحترام بجا لاتے، ان کی رہنمائی کرتے، ان کو دینی احکام و مسائل سے آگاہ فرماتے، اطاعت کی صورت میں بشارت سناتے اور ان کے حقوق اور فرائض و واجبات سے مطلع فرماتے تھے۔ یہ بیرونی وفد آپ کی خدمت میں ۹ھ میں حاضر ہوئے۔ اسی لیے اس سال کو "عام الوفود" (وفدوں والا سال) کہتے ہیں۔ یہ وفود آپ سے عطیات لینے نہیں آتے تھے یہ دوسری بات ہے کہ حضورؐ ان کا اکرام فرماتے اور خدا کے عطا کردہ مال سے ان کو نوازتے۔ ان کا مقصد آپ کے یہاں حاضر ہو کر اسلام کے اصول و فروع معلوم کرنا ہوتا تھا۔ حضورؐ ان سے بات چیت کرتے۔ ان کے سوالات کا جواب دیتے، ان کو وعظ سناتے دینی احکام بیان کرتے۔ اور خدا سے ڈرتے رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

کتب سیرت کا قاری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہت سے وفود حاضر ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ عربی قبائل میں سے کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس میں سے کوئی وفد بارگاہِ نبوت میں شرفِ باریابی نہ حاصل کر چکا ہو۔ صحابہ ان میں کے ایک ایک وفد سے آگاہ و آشنا تھے۔ اور بخوبی جانتے تھے کہ حضور نے کون کون سی احادیث سنائیں یا کون سا خطبہ دیا۔ وہ پوری طرح باخبر تھے کہ آپ نے ان کو کن مواعظ و نصائح اور احکام و سنن سے مستفید فرمایا۔ حدیث نبوی اور سِیَر و مغازی پر مشتمل کتب ان وفود کے ذکر سے مملوّ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ حدیثِ رسول کی نشر و اشاعت میں ان وفود نے کیا پارٹ ادا کیا۔ خواہ یہ وفود ۹ھ میں حاضر بارگاہ ہوئے ہوں یا اس سے پہلے۔ ذیل میں چند وفود کا ذکر کیا جاتا ہے جو آپ کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔

۱۔ وفد بنی سعد بن بکر: اس قبیلہ کا سردار ضمام بن ثعلبہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا۔ جب مدینہ پہنچا تو حضورؐ کو صحابہؓ کے درمیان تشریف فرما پایا۔ کہنے لگا "تم میں ابن عبدالمطلب کون ہے؟ صحابہؓ نے حضورؐ کی جانب اشارہ کیا۔ وہ آپ کے قریب آ کر کہنے لگا "میں آپ سے چند باتیں پوچھوں گا اور سوال میں سختی سے کام لوں گا۔" فرمایا "جو جی میں آئے پوچھیے"۔ کہنے لگا "اے محمدؐ! آپ کا فرستادہ ہمارے یہاں آیا اور کہنے لگا کہ آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ آپ کو خدا نے بھیجا ہے"۔ آپ نے فرمایا "یہ درست ہے"۔ ضمام نے کہا "میں آپ کو آپ سے پہلے اور پچھلوں کے ربّ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ آیا یہ درست ہے؟ حضورؐ نے فرمایا "ہاں یہ ٹھیک ہے"۔ ضمام نے کہا "میں آپ کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا خدا نے آپ کو پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے"؟ فرمایا "جی ہاں"۔ اس نے پھر کہا "میں آپ کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا اللہ نے تجھے حکم دیا ہے کہ آپ دولتمندوں کے مال کا کچھ حصہ ان سے لے کر فقرا کو دیں"؟ فرمایا "بخدا بالکل درست"۔ ضمام نے کہا "میں آپ کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ کو ماہ رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے"؟ فرمایا جی ہاں۔ ضمام نے پھر کہا "میں آپ کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا اللہ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ جو شخص استطاعت رکھتا ہو وہ بیت اللہ کا حج کرے"؟ فرمایا "ہاں یہ درست ہے"۔ ضمام کہنے لگا تو میں ان باتوں کی تصدیق کرتا اور ان پر ایمان لاتا ہوں۔ میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے۔ پھر ضمام اپنی قوم کی جانب لوٹ گیا۔ اور وہ سب مشرف باسلام ہو گئے۔

۲۔ وفد عبد القیس: عبد القیس نامی قبیلہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہُوا۔ کہ ہم آپ کے پاس صرف محرم کے مہینے میں حاضر ہو سکتے ہیں۔ دجب کہ جنگ و جدال بند ہوتا ہے، ہمارے اور

آپ کے درمیان مُضر (کا کافر قبیلہ) حائل رہتا ہے۔ لہذا آپ ہمیں کوئی فیصلہ کن بات بتائیں۔ جو ہم اپنے پچھلوں کو تبلا دیں اور اس پر عمل کر کے جنّت کے مستحق ٹھہریں۔ انہوں نے آپ سے پانی کے برتنوں کے بارے میں بھی سوال کیا۔ حضورؐ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار سے منع فرمایا۔ آپ نے ان کو خدائے واحد پر ایمان لانے کا حکم دیا۔ پھر فرمایا، کیا آپ کو معلوم ہے کہ خدائے واحد پر ایمان کیسے لایا جاتا ہے؟ وہ کہنے لگے "اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں"۔ آپ نے فرمایا ایمان باللہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

جن چار باتوں کا حکم دیا وہ یہ ہیں۔

۱۔ اقامت الصلوٰۃ۔

۲۔ ادائیگی زکواۃ

۳۔ ماہ رمضان کے روزے۔

۴۔ مالِ غنیمت میں سے خمس ($\frac{1}{5}$) کی ادائیگی۔

مندرجہ ذیل چار برتنوں کو استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

۱۔ جس برتن میں لاخ کا روغن لگا ہوا ہو۔

۲۔ کدّو کے بنے ہوئے برتن۔

۳۔ لکڑی کھود کر جو برتن بنائے گئے ہوں۔

۴۔ جن برتنوں پر رال کا روغن کیا گیا ہو۔

آپ نے فرمایا ان کو یاد رکھو اور پچھلے لوگوں کو اس کی اطلاع دے دو۔

(بخاری کتاب الایمان)

۳۔ وفد تجیب: یہ وفد تیرہ افراد پر مشتمل تھا۔ آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے وقت یہ زکوٰۃ کے مویشی بھی ہمراہ لائے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان کی میزبانی کا حق ادا فرمایا۔ کہنے لگے ہمارے اموال پر خدا کا جو حق تھا ہم وہ بھی ساتھ لائے ہیں۔ فرمایا، ان مویشیوں کو واپس لے جائیے اور آپ کے یہاں جو تنگدست ہوں ان میں تقسیم کر دیجیے۔ وہ کہنے لگے ہم اپنے فقراء کو پہلے دے چکے ہیں۔ جو مال بچ گیا تھا وہ ہمراہ لائے ہیں۔ جناب صدیق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے حضورؐ! آج تک عرب بھر سے اس قسم کا وفد آپ کے پاس نہیں آیا۔ فرمایا ہدایت خداوند کریم کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے ساتھ وہ بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سینہ کو ایمان کے لیے وا کر دیتا ہے۔

وفد تجیب نے حضورؐ سے کتاب وسنت کے مسائل دریافت کیے۔ رسول کریمؐ کی ان کے ساتھ رغبت میں مزید اضافہ ہوا۔ جب انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو حضور نے فرمایا آپ کیا چاہتے ہیں؟ عرض کرنے لگے "ہم واپس جا کر لوگوں کو بتائیں گے کہ ہم رسول کریمؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور آپ نے ہمیں فلاں فلاں دینی احکام سنائے پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازت چاہی۔ جب رخصت ہوئے تو حضورؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بھیج کر پھر انہیں بلایا اور بہت عمدہ قسم کے تحائف دیئے۔ جو اس سے پہلے آپ نے کسی وفد کو نہ دیئے تھے۔ آپ نے دریافت کیا تم میں سے کوئی شخص رہ تو نہیں گیا جس کو تحفہ نہ ملا ہو؟ انہوں نے کہا کہ ایک لڑکا باقی رہ گیا ہے۔ جس کو ہم سامان کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ فرمایا "اس کو بھیج دیجیے"۔ جب وہ خدمت میں حاضر ہوا تو کہنے لگا "حضورؐ! میں اس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں جو ابھی آپ کے یہاں آیا تھا۔ آپ نے ان کی ضروریات پوری فرمادیں۔ اب میری حاجت روائی فرمائیے"۔ فرمایا "آپ کیا چاہتے ہیں"؟ عرض کی بارگاہ خداوندی میں دعا کیجیے، کہ خداوند کریم مجھے بخشے، مجھ پر رحم فرمائے اور میرے دل کو غنی کر دے"۔ حضورؐ نے دعا فرمائی۔ پھر اس کو اسی قسم کا تحفہ دیا جیسا اس کے قبیلہ والوں کو دیا تھا۔

کچھ عرصہ بعد اسی قبیلہ کے لوگ ایام حج میں منیٰ کے میدان میں حضورؐ سے ملے۔ مگر وہ لڑکا موجود نہ تھا۔ حضورؐ نے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا "یا رسولؐ اللہ! ہم نے اس جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا اور نہ ہی اس سے بڑھ کر کسی کو صابر پایا۔ اگر لوگوں کو ساری دنیا بھی مل جائے تو وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ حضورؐ نے فرمایا "اللہ کا شکر ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ بڑے اطمینان سے جان دے گا۔" ایک شخص نے کہا، کیا اور کوئی شخص اطمینان سے نہیں مرتا۔" فرمایا "لوگوں کے خیالات اور اُمنگیں دنیا کی وادیوں میں ہر جگہ بھٹکتی پھرتی ہیں۔ اور اسی قسم کی کسی وادی میں انسان کی موت آجاتی ہے۔ ایسے میں خدا کو بھی اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کی موت کس وادی میں آتی ہے۔"

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ بیرونی قبائل کے وفود علم دین کے سرچشمۂ صافی سے اپنی علمی پیاس بجھانے اور دینی احکام و مسائل سے آگاہ و آشنا ہونے کے لیے حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے تھے پھر واپس لوٹتے اور اپنے متعلقین کو دینی مسائل سے آگاہ کرتے۔ صحابہؓ کرام کے جو وفد حضور اکرمؐ مختلف قبائل و ملوک کی جانب دینی دعوت و ارشاد کے سلسلہ میں بھیجا کرتے تھے۔ وہ اس پر مزید ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ان دونوں قسم کے وفود نے حدیث نبوی کی نشر و اشاعت میں خصوصی پارٹ ادا کیا۔ اور احادیث جزیرہ نمائے عرب کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گئیں۔

اشاعت حدیث میں حجۃ الوداع کے اثرات:

جب جزیرہ نمائے عرب پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا پورا تسلط حاصل ہو گیا۔ تو آپ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ چالیس ہزار مسلمان آپ کے ہمرکاب تھے۔ حضورؐ نے اہل اسلام کو مخاطب کرکے ایک جامع خطبہ دیا۔ جس میں اکثر احکام و سنن پر روشنی ڈالی اور جاہلی رسوم کو باطل قرار دیا۔ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے

ربیعہ بن امیہ بن خلف آپ کی آواز کو لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ آپ نے خطبہ کا آغاز الحمد للہ کے الفاظ سے فرمایا اور کہا۔

"اے لوگو! میری بات سنو۔ شاید اس سال کے بعد میں آپ کو یہاں کبھی نہ مل سکوں"۔

یہ طویل خطبہ ہے اس میں آپ نے مناسکِ حج پر روشنی ڈالی۔ حضورؐ کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ آپ کی وفات قریب ہے۔ اس لیے آپ نے ہر ضروری بات بیان فرما دی۔ اس عظیم اجتماع میں حضورؐ کا یہ جامع خطبہ حدیث نبوی کی نشر و اشاعت کے عوامل میں سے ایک عظیم عامل تھا۔ گویا یہ دعوتِ اسلامی بالعموم اور حدیث نبوی بالخصوص کا آخری پروگرام تھا۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ	آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اپنی
اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ	نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام
رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔	کو پسند فرمایا۔

(المائدہ)

دوسرا دور

حدیث نبوی خلافت راشدہ میں

یہ باب مندرجہ ذیل مباحث پر مشتمل ہے۔

۱۔ خلافت راشدہ کے سیاسی حالات۔

۲۔ روایتِ حدیث میں صحابہ کا طرز و منہاج۔

۳۔ خلفاء راشدین کی جانب سے تقلیل روایت کے احکام۔

۴۔ روایتِ حدیث میں حزم و احتیاط۔

۵۔ ایسی احادیث روایت کرنے کی ممانعت جو عوام کے لیے بالائے ادراک ہوں۔

۶۔ صحابہؓ کے طرزِ روایت پر اعتراض اور اس کا جواب۔

۱۔ خلافتِ راشدہ کے سیاسی حالات:

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور صحابہ میں سے کسی کو بھی اپنا جانشین مقرر نہ کیا۔ اس لیے مہاجرین و انصار کے مابین نزاع پیدا ہوئی کہ آپ کا جانشین کن میں سے ہو۔ چنانچہ یہ سب لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر سب کو مطمئن کر دیا کہ مہاجرین سبقت فی الاسلام کی بنا پر خلافت کا اولین استحقاق رکھتے ہیں۔ چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور جنابِ صدیقؓ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ یکایک دوسرے لوگوں نے بھی بیعت کر لی اور اس طرح اس نزاع کا خاتمہ ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ کو مسندِ خلافت پر فائز ہوئے زیادہ عرصہ گزرنے نہ پایا تھا کہ مدینہ میں

نفاق کی ہوائیں چلنے لگیں۔ بہت سے قبائل اسلام سے مرتد ہو گئے۔ کچھ قبیلے ایسے بھی تھے جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ وہ کہنے لگے ہم نماز پڑھ لیا کریں گے مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بعض صحابہؓ نے حضرت صدیقؓ کو یہ مشورہ دیا کہ ان کی یہ بات قبول کر لی جائے۔ اس لیے کہ ابھی آغازِ اسلام ہے عربوں کی تعداد بہت ہے اور ہم معدودے چند آدمی ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے حضورؐ کی یہ حدیث پیش کی کہ آپ نے فرمایا "مجھے لوگوں سے اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں۔ جب وہ یہ کلمہ پڑھ لیں تو مجھ سے اپنا خون اور مال بچا لیں گے۔ البتہ اگر اسلام کا کوئی حق اس امر کا متقاضی ہو کہ ان کا مال یا خون بہایا جائے تو الگ بات ہے۔ اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا "زکوٰۃ بھی اسلام کا حق ہے۔ اس لیے جہاد ناگزیر ہے"

حضرت عمرؓ بھی ان لوگوں کے ہمنوا تھے جو ترکِ جہاد کا مشورہ دے رہے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر نے اس ضمن میں ان کے مشورہ کو قبول نہ کیا۔ اور اپنا یہ مشہور فقرہ کہا کہ جاہلیت میں آپ جابر تھے مگر اسلام میں بزدل ہو گئے۔ اے ابن الخطابؓ! بخدا اگر منکرین زکوٰۃ ایک رسّی دینے سے بھی انکار کریں گے۔ جسے وہ عہد رسالت میں دیا کرتے تھے۔ تو میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔ اور اگر دوسرا کوئی شخص میرے ساتھ نہ ہوگا تو میں تنہا لڑوں گا۔ یہاں تک کہ خداوند کریم اپنا فیصلہ صادر کر دے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"[1] حضرت عمرؓ نے ابو بکرؓ کا یہ خطبہ سن کر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

جناب ابو بکرؓ نہ جھکے نہ نرم پڑے اور اپنی راہ پر رواں دواں رہے۔ آپ اپنے اطاعت شعاروں کو لے کر باغی قبائل کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے۔ حتیٰ کہ سرکش قبیلے حکم خداوندی کے سامنے جھک گئے۔ انہوں نے بخوشی یا ناخوشی دوبارہ اسلام قبول کر لیا اور باقاعدہ زکوٰۃ دینے لگے۔ اس طرح حضرت ابو بکرؓ کے فہم و فراست سے اسلام کا بکھرا

ہوا شیرازہ پھر مستحکم ہوگیا۔ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے مدح سرا ہوئے اور آپ کے مرتبہ ومقام کو پہچان گئے۔

حضرت ابوبکرؓ وعمر اور حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مسلمانوں کی سیاسی واجتماعی زندگی پورے امن وسکون سے گزرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں صغار صحابہؓ نے علوم دینیہ کی تکمیل کی اور اکثر تابعین نے احادیث نبویہ اور صحابہ کے احکام وفتاویٰ کا درس لیا۔

آگے چل کر جب لوگوں نے بلاوجہ حضرت عثمانؓ کو ہدف بنایا تو چند لوگوں نے جو بظاہر مسلمان اور بباطن یہود تھے۔ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو اپنے دام فریب میں پھنسانا چاہا۔ ان کا سرغنہ عبداللہ بن سبا نامی یہودی تھا جو حمیر کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہود بے بہبود نے فتنہ کو ہوا دینا شروع کی۔ اور اطراف عرب کے لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف اکسانا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ بحالت مظلومی اپنے گھر میں شہید کر دیئے گئے۔ اس وقت سے مسلمانوں میں شرارت کا ایسا دروازہ کھلا، جو کثیر صحابہ کی موت کا باعث بنا۔

جونہی خلیفہ چہارم جناب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر فائز ہوئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں کے درمیان لڑائیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ جس نے مسلمانوں کے شیرازہ کو بکھیر کر رکھ دیا۔ حرب وضرب کا یہ طویل سلسلہ جنگ صفین پر جاکر ختم ہوا۔ نتیجہ کے طور پر حضرت علیؓ کے رفقا شیعہ وخوارج دو فرقوں میں منقسم ہوگئے۔ شکست خوردہ عناصر مثلاً یہود اور اہل فارس نے مسلمانوں کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھایا اور مقدور بھر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں لگ گئے۔

۲۔ روایت حدیث میں صحابہؓ کا طرز ومنہاج: جب تک سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے درمیان بقید حیات رہ کر ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے رہے۔ صحابہ دین ودنیا دونوں

کے اعتبار سے خوش قسمت تھے۔ اس عہدِ سعادت عہد میں صحابہ کو یہ خطرہ دامنگیر نہ تھا، کہ منافق اور جھوٹے لوگ حدیث نبوی میں اپنی طرف سے کچھ ملا دیں گے۔ جب تک حضور پر وحی نازل ہوتی رہی۔ اس کے ذریعہ منافقین کے دجل و فریب کو طشت از بام کرنے کا سلسلہ جاری رہا اور حدیث نبوی بھی ان کی کارستانیوں سے مامون و مصئون رہی۔ منافق اس بات سے خائف و ہراساں رہا کرتے تھے کہ مبادا کوئی سورت حضور پہ نازل ہوکر ان کے باطنی کفر و نفاق سے مسلمانوں کو آگاہ کر دے۔ مزید براں حدیث کی نقد و جرح کا اس کے سوا کوئی طریقہ رائج نہ تھا کہ آنحضور کی خدمت میں حاضر ہوکر اس کی تردید یا تصدیق سے آگاہ ہوں۔ صحابہ کے یہاں جب بھی کوئی نزاع و اختلاف پیدا ہوتا تو آنحضور کی جانب رجوع کرکے اس کا حل دریافت کرتے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ (النساء ۵۹)

اگر کسی بات میں تمہارے یہاں اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹا دو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہشام بن حکیم رض کو مختلف طریقہ سے سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے سُنا۔ تو ان کے گلے میں چادر ڈال کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور کہا کہ یہ شخص سورۃ الفرقان کی تلاوت اس طریقہ سے نہیں کر رہا۔ جیسے آپ نے مجھے یہ سورہ پڑھائی تھی حضور انہیں پڑھنے کا حکم دیتے اور سن کر فرماتے ہیں کہ یہ سورت یونہی نازل ہوئی تھی۔ پھر آپ نے حضرت عمر رض کو اسی سورت کے پڑھنے کا حکم دیا اور سُن کر فرمایا۔ یہ سورہ یونہی اُتری تھی۔ پھر فرمایا کہ یہ قرآن سات طرح اُتارا گیا ہے۔ جیسے بھی آسان ہو اسے پڑھ لیا کرو۔ (صحیح بخاری)

اس قسم کے حوادث و امثلہ کی کمی نہیں، جن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ صادر فرمایا۔ سابقہ بیانات سے یہ حقیقت منصۂ شہود پہ جلوہ فگن ہوتی ہے کہ آپ کے حین حیات کسی خلاف و نزاع یا شک اور وسوسے کے ظہور و شیوع کا کوئی امکان

نہ تھا۔ اور اگر ایسی کوئی بات ظاہر ہوتی تو آپ اسے فوراً ختم کر دیتے۔

جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو صحابہ کے سینوں کے سوا حدیث نبوی کا دوسرا کوئی محافظ نہ تھا۔ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ نفاق کا دَور دورہ تھا۔ بکثرت عرب مرتد ہو گئے اور بعض نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کہ منافقین آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پردازی سے کام لیتے۔ جو بدو یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ آپ کی رسالت آپ کی موت ہی کے ساتھ ختم ہو گئی ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ حدیثِ رسول کے ساتھ دل لگی کرنے لگیں۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے حزم واحتیاط کا شیوہ اختیار کیا۔ انہوں نے جس طرح مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح قوانینِ روایت وضع کر کے حدیث میں دروغ گوئی کے راستہ کو مسدود کر دیا۔ اِن کے بعد فاروق اعظمؓ کا دَور آیا تو انہوں نے جھوٹوں کو ڈرایا اور کثیر الروایت لوگوں کو خوفزدہ کر دیا۔ حدیث کی راہ میں انجام دی گئیں۔ ان خدمات جلیلہ کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے۔

۳۔ صحابہ کو تقلیل روایت کا حکم:

خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم کی نگاہ میں حدیث نبوی ایک ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہے۔ تاہم وہ اسے روایت کی منڈی میں فروخت کے لیے لے جانا نہ چاہتے تھے۔ تاکہ منافقین کو اس میں اضافہ کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ اور وہ اس کو حدیثیں گھڑنے کا ذریعہ نہ بنا لیں۔ نیز اس لیے کہ کثیر الروایت صحابہ کے قدم پھسل نہ جائیں اور وہ خطا ونسیان کے گڑھے میں نہ جا گریں اور اس طرح غیر شعوری طور پر رسول کریمؐ پر دروغ بافی کے مرتکب ہوں۔ خلفائے راشدین نے کثرت روایت سے اس لیے بھی منع کیا تھا کہ مبادا لوگ حدیثوں میں منہمک ہو کر تلاوتِ قرآن کو خیرباد کہہ دیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین صرف انہی احادیث کی

نقل و روایت پر متفق تھے جو پیش آمدہ مسائل و فتاویٰ کے لیے ناگزیر ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیکھیے کہ کثرت سماع کے باوجود وہ بہت کم احادیث روایت کرتے تھے۔ یہی حال حضرات عمران بن حصین، ابوعبیدہ اور عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم کا تھا۔ حضرت سعید بن زید جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ ان سے صرف دو یا تین احادیث منقول ہیں۔ حضرت اُبی بن عمارہ رضی اللہ عنہ سے موزوں پر مسح سے متعلق صرف ایک حدیث مروی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کثیر الروایت صحابہ میں سے تھے۔ تاہم خلافتِ فاروقی میں انہوں نے روایت حدیث کا مشغلہ ترک کر دیا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد جب ضرورت روایت حدیث کی مقتضی ہوئی۔ تو انہوں نے روایتِ حدیث کا سلسلہ پھر شروع کر دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے "لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہؓ کثیر الروایت ہے۔ اگر قرآن کریم کی دو آیتیں نہ ہوتیں۔ تو میں ایک حدیث بھی روایت نہ کرتا۔ پھر آپ نے وہ آیتیں تلاوت کیں۔ یعنی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ یہ آیت آپ نے اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ تک پڑھی ۔ (بے شک جو لوگ ہمارے نازل کردہ دلائل اور ہدایت کو چھپاتے ہیں۔ اس کے بعد کہ ہم نے ان کو لوگوں کے لیے واضح کر دیا ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے لعنت کرتے ہیں)۔ ہمارے مہاجر بھائی بازار میں خرید و فروخت کرتے رہتے۔ انصار اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے۔ مگر مجھے شکم سیری کے سوا کسی بات کی فکر دامنگیر نہ ہوتی اور میں آنحضورؐ کے ساتھ لگا رہتا اور وہ حدیثیں یاد کرتا جو دوسروں کو محفوظ نہ ہوتیں۔" (صحیح بخاری)

حضرت ابوہریرہ کو موردِ طعن بنانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ صرف تین سال تک صحبت نبوی میں رہے اور اس قلیل عرصہ کے باوجود وہ سابقین اولین صحابہ سے زیادہ حدیثیں روایت کرتے تھے۔ جب انہوں نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ وہ سفر و حضر میں ہمیشہ حضورؐ کے

وابستۂ دامن رہے اور تجارت و زراعت میں سے کوئی کام بھی ان کو صحبتِ نبوی سے باز نہ رکھ سکا۔ اس لیے انہوں نے وہ احادیث یاد کیں جو دوسروں کو محفوظ نہ تھیں۔ ابوہریرہؓ کی یہ بات سن کر معترضین خاموش ہو گئے۔ تاہم حضرت ابوہریرہؓ نے جناب عمرؓ کی راویوں پر سختی دیکھ کر روایتِ حدیث کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔ آگے چل کر جب حضرت ابوہریرہؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ خلافتِ فاروقی میں بھی اسی طرح حدیثیں روایت کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے کہا "اگر میں ان دنوں بھی اسی طرح حدیثیں روایت کرتا تو حضرت عمرؓ اپنے دُرّہ سے مجھے پیٹتے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عمرؓ لوگوں کو حدیث کم روایت کرنے کا حکم دیتے تھے۔ اور سب صحابہؓ آپ سے خائف تھے۔ امام شعبی حضرت قرظہ بن کعبؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ہم عازمِ عراق ہوئے تو حضرت عمرؓ ہمارے ہمراہ مقام صرار تک گئے۔ آپ نے پہلے وضو کیا پھر غسل کیا۔ پھر فرمانے لگے تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کس لیے چل کر آیا ہوں؟ ہم نے کہا چونکہ ہم اصحابِ رسولؐ ہیں، اس لیے آپ احتراماً ہمارے ساتھ آئے ہیں۔ فرمایا "تمہارا گزر دیہاتی لوگوں پر ہو گا۔ جن کی قرآن خوانی کی آواز ایسے آ رہی ہو گی جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ ان کو احادیث میں الجھا کر تلاوتِ قرآن سے روک نہ دینا۔ اچھی طرح قرآن کی تلاوت کرتے رہو۔ اور حدیثیں کم روایت کرو۔ اب جائیے میں آپ کا رفیق کار ہوں۔" جب قرظہ وہاں پہنچے، تو لوگوں نے حدیثیں روایت کرنے کی فرمائش کی۔ کہنے لگے حضرت عمرؓ نے ہمیں حدیثیں روایت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ہم نے اس روایت کو صحیح فرض کر کے روایت کیا ہے ورنہ امام ابن عبد البر نے اس پر نقد و جرح کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جب اپنے والد حضرت زبیرؓ سے سوال کیا کہ آپ فلاں شخص کی طرح زیادہ حدیثیں روایت کیوں نہیں کرتے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ حضورؐ کی

صحبت کا فخر تو مجھے بھی حاصل ہے۔ مگر میں نے آپ سے سنا ہے کہ "جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے"۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے جب کہا جاتا کہ ہمیں حدیثیں سناؤ تو وہ کہتے "ہم بوڑھے ہو کر حدیثیں بھول گئے۔ حضور کی حدیثیں بیان کرنا معمولی کام نہیں"۔

سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کا مدینہ سے مکہ تک رفیق سفر رہا۔ اس دوران انہوں نے مجھے ایک حدیث بھی نہ سنائی۔ امام شعبی کا قول ہے "میں سال بھر تک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ہم نشین رہا۔ میں نے کبھی ان کو حدیث روایت کرتے نہ سنا"۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جب حدیث روایت کر کے فارغ ہوتے تو کہا کرتے تھے "اَوْ کَمَا قَالَ" (یا آپ نے جیسا بھی فرمایا)، تاکہ جھوٹ سے احتراز کیا جائے۔

اور اس قسم کے کثیر اقوال و آثار جن سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ صحابہ حزم و احتیاط کی بنا پر حدیثیں کم روایت کرتے تھے، مبادا منافقین حدیث کو اپنی اغراض خبیثہ پورا کرنے کا ذریعہ بنالیں۔ مزید برآں وہ حضور کی اس حدیث سے بھی آگاہ تھے کہ "کثرتِ حدیث سے پرہیز کیجیے۔ اور جو شخص حدیث روایت کرے وہ سچی روایت بیان کرے"۔ (احمد۔ حاکم۔ ابن ماجہ)۔ صحابہ حضور کے اس ارشاد گرامی سے آگاہ تھے کہ "میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سُنّت کا دامن تھامے رکھو"۔

۴۔ روایت حدیث میں حزم و احتیاط: حضرات صحابہ جس طرح روایت حدیث میں قلت کا حکم دیتے تھے اور کثرت سے منع کرتے تھے۔ اسی طرح راوی اور مروی دونوں کے بارے میں حزم و احتیاط کی راہ پر گامزن تھے۔ اس ضمن میں وہ کتاب اللہ اور احادیث متواترہ و مشہورہ سے استناد و احتجاج کرتے تھے۔ حدیث سے استدلال کرتے وقت حد درجہ حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جس حدیث سے ان کا دل مطمئن ہوتا، مثلاً یہ کہ متواتر یا مشہور ہو، یا

اس قسم کی خبر واحد ہو جس کے راویوں میں ایسا کوئی شخص نہ ہو جس کے حفظ و ضبط میں شک کی گنجائش ہو، اس کو قبول کر کے عمل کرتے اور اس پر گواہ طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ جس حدیث میں شک محسوس کرتے اس پر گواہ طلب کرتے۔ اگر مشکوک کی صداقت شہادت سے ثابت نہ ہوتی یا وہ حدیث کتاب اللہ کے مخالف ہوتی تو اس کو رد کر دیتے۔

اس ضمن میں چند روایات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں حضرت ابوبکرؓ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ابوبکرؓ اولین شخص تھے جنہوں نے قبولیتِ احادیث میں احتیاط سے کام لیا۔ ابن شہاب حضرت قبیصہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دادی حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئی کہ اس کے پوتے کے ترکہ سے اسے ورثہ دلایا جائے۔ کہنے لگے میں خدا کی کتاب میں تمہارے لیے کچھ نہیں پاتا۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ حضورؐ نے تمہارے لیے ترکہ میں سے حصہ مقرر کیا ہے۔ پھر اس ضمن میں لوگوں سے پوچھا تو حضرت مغیرہؓ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے رسول کریمؐ دادی کو ترکہ میں سے چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے۔ فرمایا کوئی اور شخص تمہاری تائید کرے گا؟ چنانچہ محمد بن مسلمہ نے ان کے حق میں شہادت دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے دادی کو چھٹا حصہ دلا دیا۔

۲۔ حافظ ذہبی حضرت عمرؓ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ وہ اولین شخص تھے جس نے روایت حدیث میں بیدار مغزی اور احتیاط کی راہ نکالی۔ جب آپ کو شک پڑ جاتا تو قبولیت میں توقف فرماتے۔ حضرت ابوسعید روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو دروازہ کے شگاف میں سے تین مرتبہ سلام کیا اور جب اندر آنے کی اجازت نہ ملی تو لوٹ گئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے پیچھے آدمی بھیجا اور پوچھا کہ آپ لوٹ کیوں گئے تھے؟ کہنے لگے میں نے نبی اکرمؐ سے سنا، آپ فرماتے تھے۔ جب کوئی شخص تین مرتبہ سلام کہے اور اسے جواب نہ دیا جائے تو واپس لوٹ جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس حدیث کی تائید میں شہادت پیش کیجیے۔ ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ حضرت ابوموسیٰؓ ہمارے پاس آئے تو ان

کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے ماجرا کہہ سنایا اور پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی نے یہ حدیث سُنی ہے؟ ہم نے کہا "یہ حدیث ہم سب نے سُنی ہے"۔ چنانچہ ایک شخص ان کے ساتھ چلا گیا اور حضرت عمرؓ کے سامنے شہادت دی۔ (تذکرۃ الحفاظ)

۳۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ جب کوئی شخص کسی عورت کا حمل ساقط کر دے تو اسے کیا پاداش ادا کرنا ہوگی؟ حضرت مغیرہؓ نے فرمایا رسول کریمؐ نے ایک عورت کو ایک غلام دینے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا گواہ پیش کیجیے۔ چنانچہ حضرت محمد بن مَسلمہ نے ان کے حق میں شہادت دی۔ (تذکرۃ الحفاظ)

۴۔ امام ذہبی روایت کرتے ہیں کہ ہشام کے والد نے جب ایک حدیث بیان کی تو حضرت عمر نے کہا کہ شہادت پیش کیجیے۔ وہ باہر نکلا، تو چند انصاری صحابہ کھڑے تھے۔ اس نے ماجرا بیان کیا۔ وہ کہنے لگے ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے۔ حضرت عمرؓ یہ سُن کر کہنے لگے "میں آپ پر جھوٹ کی تہمت نہیں لگاتا۔ میرا مقصد صرف تحقیق کرنا تھا"۔

۵۔ امام ذہبی حضرت علی کے ترجمہ میں اسماء بن حکم الفزاری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت علی کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ "جب میں براہ راست آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تو مستفید ہوتا۔ اور جب کوئی دوسرا شخص مجھے حدیث سناتا۔ تو اسے حلف دیتا۔ جب حلف اُٹھا لیتا تو اس کی تصدیق کرتا"۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں ابوبکر صدیقؓ نے مجھے یہ حدیث سنائی ــ اور ابوبکرؓ نے سچ فرمایا ــ کہ میں نے نبی اکرمؐ کو فرماتے سنا کہ "جو مسلمان شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرکے وضو کرے اور پھر دو رکعت نماز پڑھے اور اللہ سے بخشش مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے"۔

۶۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث کو رَد کر دیا۔ جس میں مذکور ہے کہ شبِ معراج نبی کریمؐ نے اپنے رب کو دیکھا۔ کیونکہ قرآن کریم میں اس کے

خلاف مذکور ہے۔ ارشاد فرمایا۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔ (الانعام ۱۰۳) آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ آنکھوں کا ادراک کر سکتا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں، جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضورؐ نے شب معراج خدا وند تعالیٰ کو دیکھا اس نے زبردست جھوٹ بولا۔ یہ ان کے اجتہاد پر مبنی ہے۔ بعض علما حضرت عائشہ رضؓ کے خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک مذکورہ صدر آیت کے معنی یہ ہیں کہ "آنکھیں ذات تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اگر یہ مفہوم مراد لیا جائے تو آیت و حدیث میں کسی قسم کا تعارض باقی نہیں نہیں رہتا۔

جس طرح سیدہ عائشہ رضؓ متن حدیث پر غور کر کے اس پر نقد و جرح کرتین اور اسے قرآن کے معیار پر رکھ کر جانچتی پرکھتی تھیں۔ اسی طرح وہ راوی کے حفظ و ضبط کا امتحان بھی لیا کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ نے عروہ بن زبیر سے کہا اے بھانجے! مجھے پتہ چلا ہے۔ کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص ہمارے یہاں سے گزر کر حج کو جا رہے ہیں۔ ان کو مل کر چند مسائل پوچھیے۔ اس لیے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت استفادہ کیا تھا۔ جناب عروہ نے حسب ارشاد حضرت عبداللہ رضؓ کو مل کر چند باتیں دریافت کیں۔ ان کے جواب میں حضرت عبداللہ نے جو احادیث ذکر کیں۔ ان میں سے ایک حدیث یہ بھی تھی کہ حضورؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ یوں لوگوں کے سینوں سے علم کو جھٹ پٹ کھینچ نہیں لے گا۔ بلکہ وہ علما کو وفات دے دے گا۔ اور اس طرح علم لوگوں کے درمیان سے اٹھ جائے گا۔ لوگوں میں جاہل باقی رہ جائیں گے۔ جو بغیر دلیل و برہان کے فتویٰ دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے۔ اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔"

عروہ کا بیان ہے "جب میں نے یہ حدیث حضرت عائشہ کو سنائی تو انہیں بڑا تعجب

ہُوا۔ اور اس سے انکار کر دیا۔ کہنے لگیں "کیا یہ حدیث عبداللہ نے خود رسول اکرمؐ سے سُنی ہے؟ عروہ نے کہا" جی ہاں۔ ایک سال گزرنے پر جب پھر حضرت عبداللہ آئے تو حضرت عائشہؓ نے عُروہؓ سے کہا کہ حضرت عبداللہ سے مل کر پھر اسی حدیث کے بارے میں پوچھیے۔ عُروہ کہتے ہیں، میں نے مل کر حضرت عبداللہ سے اس حدیث کے بارے میں جب سوال کیا۔ تو انہوں نے وہ حدیث من وعن بیان کر دی۔ پھر میں نے حضرت عائشہؓ کو بتایا۔ فرمانے لگیں "میرا خیال ہے کہ ان کی بیان کردہ حدیث درست ہے۔ عبداللہ نے (ایک سال گزرنے کے باوجود) اس کے الفاظ میں کچھ کمی بیشی نہیں کی۔"

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۳)

حضرت عائشہؓ نے گویا حضرت عبداللہؓ کی قوت حفظ و ضبط کا امتحان لیا پہلی مرتبہ انہیں شک گزرا۔ جب دوسری مرتبہ معلوم ہُوا کہ عبداللہ نے حدیث کے الفاظ میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی۔ حالانکہ پورا ایک سال گزر چکا تو انہیں یقین آگیا کہ ان کا حافظہ مضبوط ہے۔ اس لیے ان کی تصدیق کی اور ان کی روایت کو قبول کر لیا۔

اس قسم کے آثار و اقوال جو بکثرت ہیں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ صحابہؓ حدیث کو بڑی لے دے کے بعد قبول کرتے تھے۔ وہ حدیث اور اس کے راوی کو نقد و جرح کے ترازو میں رکھ کر جانچتے پرکھتے تھے۔ اور حضورؐ کی وفات کے بعد یہ ایک فطری امر تھا۔ اس لیے کہ جب تک حضور بقید حیات تھے۔ اس وقت وہ آپ سے مل کر حدیث کے بارے میں سوال کر سکتے تھے۔ مگر آپ کی وفات کے بعد اس کا امکان نہ تھا۔

۵۔ عسیر الفہم احادیث روایت کرنے کی ممانعت: ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ ذہین و فطین صحابہؓ کو حضورؐ خصوصی علوم سے بہرہ ور کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ عوام کو ان علوم کو آشنا نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ وہ ان کے سمجھنے سے قاصر رہ کر فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔

ایک مرتبہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر سوار تھے اور حضرت معاذؓ آپ کے ہمرکاب تھے۔ فرمایا "اے معاذؓ بن جبل جو شخص بھی خلوص دل سے لا الٰہ الا اللہ کہہ دے۔ خدا اس پر آتش جہنم کو حرام کر دے گا"۔ حضرت معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ! میں لوگوں کو بتا نہ دوں، وہ سن کر خوش ہو جائیں گے"؟ فرمایا "نہیں۔ اس طرح وہ کلمہ پر ہی بھروسہ کر لیں گے۔ اور اعمال صالحہ ترک کر دیں گے"۔ جب حضرت معاذؓ فوت ہونے لگے تو یہ حدیث بیان کی۔ تاکہ وہ کتمانِ علم کے مرتکب نہ ٹھہریں۔ (صحیح بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ کو رسول کریمؐ نے حکم دیا تھا کہ مندرجہ صدر حدیثِ معاذؓ کے مضمون سے لوگوں کو آگاہ کر دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہوں نے ابوہریرہؓ کو اس اقدام سے باز رکھا اور نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئے کہ کیا آپ نے ابوہریرہؓ کو فلاں بات کا حکم دیا تھا؟ حضورؐ نے اثبات میں جواب دیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی حضور ایسا نہ کیجیے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں لوگ اسی پر بھروسہ نہ کر لیں۔ لہذا آپ لوگوں کو عمل کرتے دیجیے"۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان)

امام مسلمؒ نے مقدمہ صحیح مسلم میں روایت کی ہے کہ حضور نے فرمایا۔

"آدمی کے لیے یہی جھوٹ کافی ہے کہ جو بات سنے اسے بیان کر دے"۔

عوام کو ناقابل فہم باتیں بتانا شرعاً اس لیے ممنوع ہے کہ وہ ایسی باتیں سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک بات کو سمجھ نہ پائیں گے تو اسے جھٹلائیں گے اور اس طرح ان کا اعتماد اس راوی سے اُٹھ جائے گا۔ اور اگر وہ اس کی تکذیب نہ کریں گے اور جو بات سمجھ میں آ جائے اس پر عمل کریں گے۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے گی اس کو چھوڑ دیں گے۔ اس سے بعض شرعی احکام کا ترک کرنا لازم آئے گا۔ اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جس شخص نے وہ حدیث بتائی تھی۔ اس نے وہ حدیث بیان کر کے ان کو شرعی احکام پر عمل کرنے سے روک دیا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو ایسی باتیں بتانا،

جو ان کی سمجھ میں نہ آسکیں۔ ان کو دین کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دینے کے مترادف ہے۔ اسی لیے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

"لوگوں کو وہ بات بتائیے جو ان کی سمجھ میں آسکے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو جھٹلایا جائے"۔

خلافت راشدہ میں حضورؐ کے صحابہ آپ کی ہموار کردہ راہ پر گامزن رہے اور عوام کے لیے جو باتیں نا قابل فہم تھیں، ان کے بتانے سے احتراز کرتے رہے۔ مبادا وہ فتنہ میں مبتلا ہو کر بعض دینی فرائض کو چھوڑ بیٹھیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ جس قوم کو بھی آپ ایسی بات بتائیں گے جو ان کی سمجھ میں نہ آسکے، وہ بعض لوگوں کے لیے فتنہ کی موجب ہو گی۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتیں سن کر یاد کی تھیں۔ ایک لوگوں کو بتادی۔ اگر دوسری بھی بتا دوں تو میرا گلا کٹ جائے۔ (صحیح بخاری)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں "لوگوں کو وہ باتیں بتاؤ جو ان کی سمجھ میں آجائیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو جھٹلایا جائے"۔

امام ابن عبدالبرؒ نے اسی قسم کی ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کی ہے۔ غرض یہ کہ حضرات صحابہ، تابعین اور ائمہ کرام شروع ہی سے ایسی حدیثوں کو روایت کرنے سے روکتے رہے جو لوگوں کی کم فہمی کی وجہ سے فتنہ و فساد کی موجب و محرک ہو سکتی ہوں۔ یا جن کو اصحاب بدعت اور گمراہ سلاطین ان کے ظاہری الفاظ کی بنا پر اپنے نا روا مقاصد اور جور و استبداد کے لیے استعمال کر سکتے ہوں۔

حضرت انسؓ نے جب حجاج ثقفی کو قبیلہ عُرَینہ کے واقعہ پر مشتمل حدیث سنائی تو حضرت حسن بصری اس پر معترض ہوئے تھے۔ اس لیے کہ حجاج نے تاویل کر کے اس

سے ناروا خون ریزی کا جواز نکالا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ ان احادیث کی نقل و روایت سے منع کیا کرتے تھے جن کے ظاہری الفاظ سے حاکم وقت کے خلاف بغاوت کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ قاضی ابو یوسف ایسی احادیث کے روایت کرنے کو ناپسند کیا کرتے تھے۔ جن میں کوئی نرالی یا انوکھی بات بیان کی گئی ہو۔

ائمہ کرام نے ایسی احادیث کی نقل و روایت سے اسی لیے منع کیا تھا تاکہ دین اصحابِ بدعت کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہے اور امت مسلمہ ان فتنہ بازوں کے دام فریب میں نہ آنے پائے۔ اس لیے کہ باطل پرست اور اباحیت پسند لوگ احادیث کے ظاہری الفاظ سے استدلال کر کے اور دینی محرمات کو حلال ٹھہرا کر شعوری یا غیر شعوری طور پر کفر کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔ یہ بات اکثر و بیشتر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنے آپ کو دین کا داعی و مبلغ قرار دیتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جاہل داعیوں کی وجہ سے مذاہب آفات کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔" اسی لیے صحابہ ایسی احادیث کی نشر و اشاعت سے دامن بچاتے رہے جو کوتاہ نظری کے باعث غلط فہمی کا باعث بن سکتی ہوں یا جن سے اصحاب بدعات و اہواء ناجائز فائدہ اُٹھا سکتے ہوں۔ تاکہ خدا کی زمین فتنہ و فساد کی آماجگاہ نہ بننے پائے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۱۶۰)۔

۶۔ صحابہ کے طرزِ روایت پر اعتراض اور اس کا جواب:

معترض کہہ سکتا ہے کہ صحابہ روایتِ حدیث میں چنداں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس لیے کہ وہ صرف نصوصِ قرآنی اور احادیثِ مشہورہ پر عمل کرتے تھے۔ اس کے بعد اگر انہیں ضرورت لاحق ہوتی تو اپنی رائے پر عمل کرتے۔ اسی لیے وہ حدیثیں کم روایت کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ صحابہ کے بارے میں یہ بھی منقول ہے کہ وہ اکثر نو پید مسائل میں اپنی رائے کو معمول بہا بناتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بعض احادیث کو رد کر دیا تھا۔ اور بعض کی

صحت کے بارے میں شہادت طلب کی یا راوی کو حلف دلایا تھا۔ کہ اس نے فلاں روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ مندرجہ صدر امور سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ اخبار آحاد کو رد کرتے اور رائے کو نص کے مقابلہ میں ترجیح دیا کرتے تھے۔

اس اعتراض کے جوابات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ صحابہؓ نے تقلیل روایت کا حکم اس لیے دیا تھا کہ کثیر الروایت راوی سے غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ بخلاف ازیں قلیل الروایت راوی احادیث کو زیادہ محفوظ رکھ سکتا ہے۔ صحابہ کے کثرتِ روایت سے روکنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منافقین کو اس بات کا موقعہ نہ ملے کہ وہ اپنے حسب منشا احادیث وضع کر کے احادیث صحیحہ میں شامل کر دیں۔ علاوہ ازیں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اچھی طرح قرآن کریم نہ پڑھ سکتے تھے اور اس کا خطرہ دامنگیر تھا کہ اگر وہ کسی اور چیز میں مشغول ہو گئے تو قرآن کریم کی قرأت و تلاوت سے محروم رہیں گے۔ حالانکہ وہ دین اسلام کا اولین ماخذ ہے۔

۲۔ جہاں تک سماعِ حدیث کے بارے میں گواہ طلب کرنے یا راوی کو حلف دینے کا تعلق ہے۔ صحابہ ہمیشہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ بخلاف ازیں ایسا اس وقت کرتے تھے، جب انہیں راوی کے حفظ و ضبط کے بارے میں شک گزرتا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ بعض صحابہ کی ایسی روایت بھی قبول کر لیا کرتے تھے۔ جن کو ان کے سوا دوسرے کسی صحابیؓ نے روایت نہ کیا ہوتا تھا۔ بشرطیکہ صحابہؓ کو راوی کے حافظہ پر اعتماد ہو۔

مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضحاک بن سفیان کی یہ روایت قبول کر لی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضحاک کو لکھا تھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو اس کی دیت سے ورثہ دلایا جائے۔ حضرت عمرؓ نے ضحاک سے کوئی گواہ طلب نہ کیا۔ اسی طرح جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ جس جگہ وبا پڑ چکی ہو وہاں جانا نہیں چاہیے۔ تو حضرت عمرؓ جو کہ عازمِ شام تھے۔ یہ حدیث سن کر مقام سرغ سے واپس

مدینہ لوٹ آئے۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کے ساتھ جو مہاجرین و انصار موجود تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی یہ حدیث معلوم نہ تھی۔ جناب فاروقؓ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کوئی تائیدی شہادت طلب نہ کی۔

سابق الذکر حدیث میں حضرت علیؓ کا یہ مقولہ مذکور ہے کہ

وحدثنی ابوبکرؓ وصدق ابوبکرؓ (ابوبکر نے مجھے یہ حدیث سنائی اور ابوبکر نے سچ فرمایا)۔

چونکہ حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ کو صادق القول تصور کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ابوبکرؓ کو حلف نہ دیا۔ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰؓ اشعری کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "میں آپ پر تہمت نہیں لگاتا۔ صرف تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں نے گواہ طلب کیا ہے۔"

۳۔ باقی رہی یہ بات کہ صحابہؓ حدیث کو چھوڑ کر رائے پر عمل کرتے تھے تو یہ غلط ہے۔ اور واقعات و آثار اس کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"رائے سے احتراز کیجیے۔ اس لیے کہ اصحاب الرائے سنت کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ احادیث کو حفظ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ عنقریب ایک ایسی قوم ظہور پذیر ہوگی جو قرآن کی آیات متشابہات کا سہارا لے کر تم سے جھگڑے گی۔ احادیث کے ذریعے ان پر گرفت کرو۔ اس لیے کہ اصحاب الحدیث کتاب کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ جس طرح تم قرآن سیکھتے ہو، اسی طرح فرائض اور سنتیں سیکھا کرو۔"

رائے کے بارے میں صحابہؓ سے جو کچھ منقول ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلب و تلاش کے باوجود صحابہ کو حدیث نہ ملتی تو وہ رائے سے کام لیتے اور کہا کرتے تھے۔ "یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ اگر غلط نکلی تو ہمارا اور شیطان کا قصور ہے اور اگر

درست ثابت ہوئی تو یہ عنایتِ خداوندی ہے۔"

اگر اس کے بعد ان کو حدیث نبوی مل جاتی تو رائے کو ترک کر کے حدیث پر عمل کرتے۔ جناب میمون بن مہران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"جب کوئی نیا مسئلہ حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کیا جاتا تو اس کا فیصلہ کتاب اللہ میں تلاش کرتے۔ اگر اس کا حل مل جاتا، تو اس کے مطابق فیصلہ صادر کرتے۔ ورنہ حدیثِ رسولؐ میں تلاش کرتے۔ اگر تلاش کرتے میں کامیاب ہو جاتے تو اس کی روشنی میں فیصلہ کرتے۔ اور اگر تلاش میں کامیابی نہ ہوتی تو لوگوں سے پوچھتے کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضورؐ نے اس معاملہ میں کیا فیصلہ کیا ہے؟ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کچھ لوگ کھڑے ہو کر کہتے کہ حضورؐ نے اس ضمن میں یہ فیصلہ فرمایا تھا۔ اگر سنت رسولؐ میں اس کا حل نہ ملتا تو سر کردہ لوگوں کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ طلب کرتے۔ جب وہ ایک مسئلہ پر متفق ہو جاتے تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔"

میمون بن مہران مزید فرماتے ہیں۔

"حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا طریق کار بھی یہی تھا۔ جب کسی مسئلہ کا حل انہیں کتاب و سنت میں نہ ملتا تو پوچھتے کہ کیا ابوبکرؓ نے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہے؟ اگر کسی فیصلہ کا پتہ چلتا تو اس کے مطابق فتویٰ دیتے۔ ورنہ اہل علم صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کرتے۔ جب کسی بات پر ان کے یہاں اتفاق رائے ہو جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ صادر کرتے۔"

جناب فاروق اعظمؓ نے جب جناب شریح کو کوفہ کا قاضی بنا کر بھیجا تو یہ نصیحت فرمائی۔

"دیکھیے جو بات آپ کو قرآنِ عزیز میں نظر آئے، اس کے بارے میں کسی سے

مت پوچھیے۔ اور جو بات کتاب اللہ میں نہ ملے، اس میں سنتِ رسولؐ کی پیروی کیجیے۔ جو بات سنتِ رسول میں بھی نہ ملے، اس کے بارے میں اپنی رائے سے اجتہاد کیجیے"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

"جب کسی شخص کو کسی نئے مسئلہ سے سابقہ پڑے، وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر کتاب میں اس کا حل نہ ملے تو حدیثِ رسولؐ کی روشنی میں طے کرے۔ اگر ایسا حادثہ رونما ہو، جو کتاب اللہ میں بھی مذکور نہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس ضمن میں کوئی فیصلہ نہیں فرمایا۔ تو اس کو اس طرح حل کرے جس طرح خدا کے نیک بندوں نے کیا ہو۔ اگر اس کی نظیر بھی نہ مل سکے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے اور شرمائے نہیں"۔

اعلام الموقعین ج ا ص ۵۱ وحجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۲۹)

اس قسم کے اقوال و آثار لاتعداد ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے

صحابہؓ کرام سے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے سنتِ رسول سے انحراف کرکے اپنی رائے سے عمل کیا ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"اگر دین کا انحصار رائے پر ہوتا تو موزہ کی نچلی جانب مسح کرنا بالائی طرف کے مسح سے افضل ہوتا"۔

حضرات عبداللہ بن عباس، معاذ بن جبل، عبداللہ بن عمرؓ، سہل بن حُنَیف، معاویہ، ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم یہ تمام اکابر صحابہ رائے کی مذمت فرماتے اور اتباعِ سنت کی تاکید کرتے تھے"۔

مندرجہ صدر بیانات سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ حدیث نبوی صحابہ کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ وہ حدیث نبوی کی روشنی میں چلنے اور اس کو آخری درجہ کی اہمیت دیتے تھے۔ اور اگر کسی صحیح مقصد کی خاطر وہ روایتِ حدیث کم کرنے کا مشورہ

دیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ سنّت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اگر یہ بات ہوتی تو روایت کی قلت ہو یا کثرت، دونوں ان کے نزدیک شجرۂ ممنوعہ ہوتیں۔ یہ حقیقت قبل ازیں واضح ہو چکی ہے کہ صحابہ حدیث نبوی کے مرتبہ و مقام سے آشنا تھے اور اسی لیے وہ اس کو بے حد قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ قرآن کی طرح سنت کی جمع و تدوین انجام نہ دے سکے۔ اس کے وجوہ و اسباب ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ احادیث نبویہ کو انہوں نے اپنے سینوں میں جگہ دی اور اس کے حفظ و ضبط کا پورا پورا اہتمام کیا۔ اس پر مزید یہ کہ خداوندِ کریم نے ان کو عدیم النظیر قوتِ حافظہ سے بہرہ ور کیا ہوا تھا۔

صحابہؓ کے بارے میں جو یہ مذکور ہے کہ انہوں نے بعض احادیث کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ اس حدیث کے راوی کو ضعیف سمجھتے تھے یا ان کے نزدیک دوسری قوی تر حدیث اس کی ناسخ یا معارض ہوتی ہے۔ جس طرح حضرت عائشہ رضی نے اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا تھا، جس میں مذکور ہے کہ شبِ معراج حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ اور جس طرح حضرت عمرؓ نے فاطمہؓ بنت قیس کی اس روایت کو رد کر دیا تھا۔ کہ مطلقہ ثلاثہ ہونے کے باوجود حضورؐ نے اس کو نان و نفقہ اور سکونت نہیں دلوائی تھی۔ فاطمہ رضی کے بیان کے برعکس حضرت عمر رضی نے یہ فتویٰ دیا کہ جس عورت کو تین طلاقیں ہو جائیں اس کو نفقہ اور سکونت ملے گی۔ اس کی دلیل میں وہ یہ آیت پیش کرتے تھے۔

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ (الطلاق ۱)

ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس عورت کے جب کہ وہ ظاہر بے حیائی کی مرتکب ہوں۔

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ "ایک عورت (فاطمہ بنت قیس) کے کہنے پر ہم خدا کی کتاب اور نبی کی سُنّت کو نہیں چھوڑ سکتے۔ جب کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ سچ بولتی ہے یا

جھوٹ اور اسے یاد بھی ہے یا نہیں۔"

اور اس قسم کے دیگر واقعات جن میں صحابہ کسی حدیث کو تسلیم نہ کرنے کے لیے مجبور و معذور تھے۔ مگر حقیقت الامر سے ناآشنا شخص یہ سمجھتا ہے کہ صحابہ سنت پر عمل نہیں کرتے حالانکہ صحابہ کا دامن اس تہمت سے پاک ہے۔

اس بات کی تردید کہ صحابہ خبر واحد پر اعتماد نہیں کرتے تھے:

بعض لوگوں کے نزدیک اخبارِ آحاد اس لیے قابل احتجاج نہیں کہ صحابہ ان کے قبول کرنے میں توقف سے کام لیتے تھے اور ان پر عمل کرنے سے گریز کیا کرتے تھے۔ جمہور علماء کے نزدیک اخبار آحاد دین میں حجت ہیں۔ وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ صحابہؓ اخبار آحاد کو قبول کرنے میں اس لیے توقف نہیں کرتے تھے کہ وہ ان کو قابلِ استناد خیال نہیں کرتے تھے۔ بخلاف ازیں صحابہؓ کے نزدیک اس کے وجوہ و اسباب کچھ اور تھے۔ لہذا صحابہ کے توقف کرنے سے تمام اخبار آحاد کا رد کرنا لازم نہیں آتا۔ اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ بات ان لوگوں کے نزدیک درست ہوگی جو قبول روایت کے لیے تعددِ رواۃ کی شرط لگاتے ہیں۔ بخلاف ازیں جو لوگ قبول روایت کے لیے حدیث کا متواتر ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ استدلال درست نہ ہوگا۔

اخبار آحاد کی حجیت کے منکرین سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جن احادیث سے تم اخبار آحاد کی عدم حجیت پر استدلال کرتے ہو وہ بذات خود خبر واحد ہیں۔ پھر یہ بات کیوں کر صحیح ہے کہ تمام اخبار آحاد کی عدم حجیت پر اخبار آحاد ہی سے استدلال کر رہے ہو؟ کیا یہ کھلا ہوا تناقض نہیں؟ خلاصہ یہ کہ منکرین حجیت نے اخبار آحاد کو قبول نہ کرنے کے سلسلہ میں جو عذرات بارده پیش کیے ہیں۔ ان کو معلوم کرتے ہی ان کے استدلال کی کمزوری واضح ہو جاتی ہے۔

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر کی چار کے بجائے دو رکعتیں ادا کیں اور ذوالیدین رضؓ نامی صحابی نے عرض کی کہ حضورؐ! "کیا نماز کم ہو گئی یا آپ بھول گئے۔" تو آپ نے ان کی بات تسلیم کرنے میں توقف سے کام لیا۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ جب ذوالیدین رضؓ کے علاوہ نماز میں دیگر صحابہ بھی شریک تھے تو سوال کرنے میں وہ ذوالیدینؓ کے ہمنوا کیوں نہ ہوئے؟ اتنے صحابہؓ میں سے صرف ایک کا معترض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ غلطی پر ہے۔ اگر اس کا خیال درست ہوتا تو دیگر صحابہ رضؓ بھی اس کے ساتھ معترض ہوتے۔ ذوالیدینؓ کی بات کو تسلیم کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ صحابہ کو یہ بات سکھلانا چاہتے تھے کہ ایسے مواقع پر توقف ہی سے کام لینا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کی بات مان لی جائے اور خاموش رہنے والی اکثریت کو درخور اعتنا نہ خیال کیا جائے۔ خصوصاً جب کہ وہ شریک واقعہ بھی تھے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب مغیرہؓ کی روایت فی الفور اس لیے قبول نہ کی کہ وہ یہ بات معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آیا یہ حدیث منسوخ تو نہیں؟ یا اس لیے کہ تائیدی شہادت مل جانے سے حضرت مغیرہ کی روایت اور زیادہ پختہ ہو جائے گی۔ حضرت ابوبکرؓ کے توقف فرمانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ روایت حدیث میں سہل انگاری سے کام نہ لینے لگیں۔ ورنہ جناب صدیق کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آپ خبر واحد کو تسلیم کر لیا کرتے تھے۔ اور اس پر معترض نہیں ہوا کرتے تھے۔

جناب فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت کردہ طلب اذن سے متعلق حدیث میں جو توقف کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر احادیث کی نقل و روایت میں سہل انگاری سے کام لیا جاتا تو منافقین کے حوصلے بڑھ جاتے۔ اور وہ حسب منشا حدیثیں وضع کر کے ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیتے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے ابوموسیٰ اشعری کے حق میں

تائیدی شہادت دی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"میں آپ پر جھوٹ کی تہمت نہیں لگانا چاہتا۔ مجھے اس بات کا خطرہ دامنگیر تھا کہ مبادا لوگ حدیثیں گھڑ کر ان کو رسول کریمؐ کی جانب منسوب کر دیا کریں۔ امام و خلیفہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ جہاں اس قسم کی حکمت و مصلحت موجود ہو وہاں توقّف سے کام لے اور حدیث کو بلا تحقیق قبول نہ کرے۔"

اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اخبار آحاد کی حجیّت کے منکرین نے جن اقوال و آثار سے کام لیا ہے وہ ان کے مدّعا پر دلالت کرتے ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی معارض ایسی احادیث ہیں جو ان کی نسبت زیادہ صحیح اور مشہور تر ہیں۔ ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بعض اوقات صرف ایک ہی صحابی کو کوئی پیغام یا خط دے کر اطراف ملک میں بھیجتے اور لوگوں کے لیے آنحضورؐ کے دیئے ہوئے پیغام کو قبول کرنا ایک لازمی امر تھا۔ آج تک یہ بات نہیں سنی گئی کہ کسی شخص نے حضورؐ کے فرستادہ کی بات صرف اس لیے رد کر دی ہو کہ وہ ایک آدمی کی دی ہوئی خبر ہے۔ البتہ بیرونی قبائل آنحضور کی خدمت میں وفد اس لیے بھیجا کرتے تھے تاکہ وہ جو باتیں آپ سے سنیں پورے وثوق و اعتماد کے ساتھ اپنی قوم تک پہنچا دیں۔ نیز اس لیے کہ وہ آپ کی زیارتِ مقدّسہ سے مشرف ہوں اور آپ کے زرّیں نصائح سے اپنا دامن مالا مال کر کے واپس لوٹیں۔ (المستصفیٰ للغزالی)

تیسرا دور

حدیث خلافت راشدہ کے بعد تا اختتام

پہلی صدی ہجری

یہ باب مندرجہ ذیل مباحث پر مشتمل ہے۔

۱۔ خلافت راشدہ کے سیاسی حالات اور فرقوں کا ظہور وشیوع۔

۲۔ ظہور خوارج اور روایت حدیث پر ان کے اثرات۔

۳۔ فرقہ شیعہ، ان کے عقائد اور روایتِ حدیث پر ان کے اثرات۔

۴۔ حدیث کی جمع وتدوین میں صحابہ وتابعین کی مساعی جمیلہ۔

۵۔ حدیث کے اوّلین مؤلفین ومدونین۔

۶۔ مشاہیر صحابہ کا تعارف۔

۷۔ رُواۃِ حدیث تابعین کے سِیَر وسوانح۔

۸۔ اس عہد کی روایتِ حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب۔

اب ان کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ خلافتِ راشدہ کے سیاسی حالات اور فرقوں کا ظہور وشیوع: سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو بعض قبائل دینی ذمہ داریوں کا جؤا اتار کر آزاد منش ہو گئے چنانچہ بعض قبیلے ایسے تھے

جنہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ بعض اسلام سے اس لیے منحرف ہو گئے کہ آنحضور کی وفات کے ساتھ ہی دین اسلام بھی اپنی موت مر چکا ہے۔ حتیٰ کہ بعض گمراہ شعراء نے اس ضمن میں اشعار بھی نظم کیے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان حالات میں وہی کچھ کیا جس کی ایک غیور و جسور تجربہ کار قائد سے توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس فتنہ کو سر اُٹھاتے ہی کچل دیا۔ اور اس کے جراثیم کو بڑا ہونے سے پہلے ہی ختم کر دیا۔ جو لوگ دینِ اسلام پر حملہ آور ہوئے تھے، خائب و خاسر لَوٹے۔ اور ان کی گردنیں احکام خداوندی کے آگے جھک گئیں۔

حضرتِ ابوبکرؓ دو سال اور چند ماہ مسندِ خلافت پر متمکن رہے۔ اس قلیل مدت میں اسلام کا جھنڈا سرزمینِ فارس و روم پر لہرانے لگا۔ آپ نے قرآن عزیز کی جمع و تدوین کا کارنامہ سرانجام دیا۔ اور حدیث کے بارے میں احتیاطی اقدامات کیے۔

جناب صدیق نے حضرت عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین منتخب فرمایا۔ فاروقی عہد میں اسلامی فتوحات کا دائرہ شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً ہر جانب وسعت پذیر ہوا۔ ملک شام و مصر اور جزیرہ اسلامی حکومت کے زیرِ نگین ہوئے۔ آپ دس سال اور چند ماہ خلافت کے منصب پر فائز رہے۔ آپ کے عہد میں نہ قوی شخص آپ کے صبر و تحمل کا امیدوار ہو سکتا تھا اور نہ کمزور آدمی آپ کے عدل و انصاف سے مایوس رہ سکتا تھا۔ آپ با اثر آدمی کو اس کے جرم کی سزا دیتے اور ضعیف کو اس کا حق دلا کر چھوڑتے تھے۔ آپ نے احادیث نبویہ کو منافقین کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھا۔ آپ نے صحابہ کو حفظ قرآن اور حدیثیں کم روایت کرنے کا مشورہ دیا۔ غرض یہ کہ آپ کے جملہ امور و افعال سنّتِ نبویؐ کے زیرِ اثر تھے۔

خلافت فاروقی کے دوران مسلمانوں میں حد درجہ کی وحدت اور شیرازہ بندی پائی جاتی تھی۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت کو رونق بخشی تو اسلامی فتوحات کا

دائرہ مزید پھیلا۔ آپ نے جمع شدہ قرآن کریم کی نقلیں کروائیں اور ان کو اطراف ملک بھیج کر اس اختلاف کا خاتمہ کر دیا جو مسلمانوں کی تفریق کا باعث بننے والا تھا۔

آپ بارہ سال تک خلافت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ پہلے چھ سال کامل امن وامان اور خوش حالی و فارغ البالی میں گزرے۔ خلافت عثمانی کے نصف ثانی میں کچھ لوگوں نے آپ پر الزام لگایا کہ آپ اپنے اقارب کو کلیدی مناصب تفویض کر رہے ہیں غیر مسلموں نے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کو خلیفہ کے برخلاف بغاوت پر آمادہ کر کے فتنہ کی آگ بھڑکائی۔ دراصل ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں نزاع وجدال پیدا کر کے ملّت کا شیرازہ پراگندہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انھوں مختلف سنٹروں کے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف برانگیختہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں حضرت عثمانؓ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ شہادت عثمان سے قصرِ اسلام کی بنیادیں ایسی ہلیں کہ پھر انہیں وہ استحکام دوبارہ نصیب نہ ہو سکا۔ ملّتِ اسلامی کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ حضرت علیؓ بے شک خلیفہ بن گئے۔ مگر آپ کی خلافت کو امن وسکون کا ایک دن بھی میسر نہ آیا۔ اور نہ ہی تمام اسلامی بلاد آپ کے زیر نگیں ہوئے۔ ملک شام شروع ہی سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیر تسلط تھا۔ جو اب قصاص عثمانؓ کا دعویٰ لے کر کھڑے ہو گئے اور بیعتِ علیؓ سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ دونوں کے درمیان مہلک لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جن میں کثیر صحابہؓ مارے گئے۔ بے پناہ لڑائیوں کا سلسلہ جنگِ صفّین پر جا کر ختم ہوا۔ اس جنگ میں حضرت علیؓ کے رفقاء میں ایک فریق نے تحکیم کے فیصلہ کو قبول کر لیا۔ دوسرے انکار پر مُصِر رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ بھائی بھائی بن کر گئے تھے۔ مگر جب لوٹے تو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔

جنگ صفین کے بعد ملّتِ اسلامیہ تین فرقوں میں بٹ گئی۔

۱۔ <u>خوارج</u>: یہ لوگ تحکیم (حکم بنانا۔ کسی کو ثالث مقرر کرنا) قبول کرنے کو کفر تصور کرتے

تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ حضرت علیؓ اور ان کے ہمنوا تحکیم قبول کرنے کی بنا پر کافر ٹھہرے اس لیے کہ ان کے خیال میں حکم خدا کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔

۲۔ شیعہ: حضرت علیؓ کا ساتھ دینے کی وجہ سے ان کو شیعہ (گروہِ علی) کہا جانے لگا۔ انہوں نے حضرت علیؓ کی رفاقت میں تحکیم کے فیصلہ کو قبول کر لیا تھا۔ امامت کے بارے میں یہ خصوصی عقائد رکھتے ہیں۔ جو دوسرے کسی اسلامی فرقے میں نہیں پائے جاتے۔

۳۔ جمہور: یہ وہ لوگ تھے جو خروج و تشیع دونوں قسم کی بدعت سے آلودہ نہ ہوئے ان کا ایک گروہ حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور دوسرا امیر معاویہ کا ہمنوا تھا تیسرا غیر جانب دار تھا جو کسی کے ساتھ بھی شریک نہ ہوا۔

خوارج کا گروہ حضرت علیؓ کے لشکر کے لیے مستقل خطرہ بن گیا اور آپ ان کے ساتھ جنگوں میں الجھے رہے۔ اس سے حضرت معاویہؓ کو مزید تقویت ملی۔ یوں بھی آپ کا لشکر وفاداری میں بے نظیر تھا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ تین خارجی حضرت علیؓ و معاویہ اور عمرو بن العاص کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ خوارج سمجھتے تھے کہ تینوں اشخاص مسلمانوں کے لیے باعثِ فتنہ ہیں۔ اس لئے ان کا قلع قمع ضروری ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ اور امیر معاویہ تو اس سازش سے زندہ بچ نکلے مگر خارجی حضرت علیؓ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کو عبدالرحمٰن بن ملجم خارجی نے شہید کر دیا۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اہل کوفہ نے بالاتفاق ان کے بیٹے حضرت حسنؓ کی بیعت کر لی اور آپ چھ ماہ چند روز تک مسندِ خلافت پر فائز رہے۔ بعد ازاں مسلمانوں کو خوں ریزی سے بچانے کے لیے ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ ۴۱ھ کو اسی لیے "عام الجماعۃ" کہا جاتا ہے۔ کہ اس سال لوگ حضرت معاویہؓ کی خلافت پر جمع ہو گئے تھے۔ مگر حضرت حسنؓ کے امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہونے کے باوجود شیعہ و خوارج کے جذبات فرو نہ ہوئے۔ بخلاف ازیں دونوں فریق اپنے

عقائد و نظریات میں مبالغہ و افراط سے کام لیتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں مستقل گروہ بن گئے اور انہوں نے حدیث و فقہ پر خاصہ اثر ڈالا۔ اب ہم شیعہ و خوارج میں سے ہر ایک کے متعلق ایک جداگانہ فصل قائم کر کے ان کے مشہور عقائد و تعلیمات کا ذکر کریں گے اور بتائیں گے کہ انہوں نے حدیث نبویؐ پر کیا اثرات ڈالے۔

۲۔ خوارج اور خلافت کے بارے میں ان کے نظریات:

یہ وہی فرقہ ہے جس نے حضرت علیؓ کے تحکیم قبول کرنے کی بنا پر ان کے خلاف خروج کیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ پہلے انہوں نے تحکیم کو قبول کیا اور اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ جب کہ حضرت علیؓ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کے بدترین نتائج سے انہیں آگاہ کیا تھا۔ مگر خوارج بضد ہوئے اور انہوں نے حضرت علی کی بات نہ مانی۔

خوارج کے عام نظریات:

خوارج کی رائے میں خلافت کا انعقاد آزادانہ انتخاب سے ہوتا ہے۔ جب امام ایک دفعہ منتخب ہو جائے تو وہ اس سے نہ دست بردار ہو سکتا ہے نہ کسی کو حکم ٹھہرا سکتا ہے۔ خلافت کا تعلق نہ کسی خاص گھرانہ سے ہے اور نہ کسی خاص قبیلہ کے ساتھ۔ قبیلہ قریش کی بھی اس میں کچھ تخصیص نہیں۔ خوارج کے نزدیک کافر فاسق دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ بخلاف ازیں جو شخص بھی حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ فاسق ہے اور فاسق ان کے نزدیک کافر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوارج کی رائے میں عمل جزو ایمان ہے۔ اس لیے کبائر کا ارتکاب کرنے والا ان کی نگاہ میں کافر ہے۔

خوارج حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کا انتخاب صحیح طور پر ہوا تھا۔ حضرت عثمان کی خلافت کے ابتدائی سالوں کو وہ درست تسلیم کرتے تھے۔ کیونکہ ان میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی استوار کردہ راہ پر گامزن رہے۔ جب آپ

نے اپنے اقارب کو کلیدی مناصب تفویض کیے تو خوارج آپ کے خلاف بھڑک اٹھے۔ حضرت علیؓ کی خلافت بقول خوارج تحکیم کو قبول کرنے تک درست تھی۔ جب آپ نے جنگ صفین میں اپنے اور امیر معاویہؓ کے درمیان حکم مقرر کر لیے تو کافر ٹھہرے (نعوذ باللہ من ذالک)۔ خوارج اس کی دلیل یہ دیتے تھے کہ حضرت علیؓ نے خدا کے دین میں اشخاص و رجال کو حکم بنایا۔ حالانکہ فیصلہ صادر کرنا تو صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ وہ اس کی دلیل میں یہ آیت پیش کرتے تھے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ۔ (المائدہ ۴۴)

اور جو خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں۔

امیر معاویہؓ خوارج کی نگاہ میں جبراً خلافت پر قابض ہوئے تھے اور اس لیے غاصب تھے۔ ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ جو شخص امیر معاویہؓ کے ساتھ تعاون کرے اور حضرت عثمانؓ و علیؓ سے بیزاری کا اظہار نہ کرے وہ کافر اور مباح الدم ہے۔ بنابریں حضرت علیؓ اور ان کے ہمنوا اور اسی طرح امیر معاویہؓ اور ان کے رفقاء نیز حضرت عثمانؓ اور جو شخص بھی ان تمام لوگوں سے اظہار برأت نہیں کرتا خوارج کی رائے میں کافر اور مباح الدم ہے۔

کچھ یوں نظر آتا ہے کہ خوارج دراصل درشت طبع اور سنگدل قسم کے بدوی لوگ تھے۔ اسی قسم کے لوگوں کے بارے میں قرآن نے کہا ہے

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (التوبہ ۹۷)

بدوی لوگ کفر و نفاق میں نہایت سخت ہیں اور اس لائق ہیں کہ جو چیز اللہ نے اپنے رسولؐ پر اتاری ہے۔ اس کی حدود سے آگاہ نہ ہوں۔)

صحابہؓ جو نور نبوت سے مستنیر ہوئے تھے۔ اور جنہوں نے صحیح طور سے قرآن کریم کا فہم و ادراک حاصل کیا تھا، ان میں سے کوئی بھی خوارج میں موجود نہ تھا۔ اس لیے

خوارج کا ظواہرِ قرآن سے دھوکہ کھا جانا کچھ عجیب نہیں۔ اور اگر وہ قرآن عزیز میں فکر و نظر کی زحمت گوارا کرتے تو انہیں ایسی آیات ضرور مل جاتیں، جن میں حَکم بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔

مثلاً قرآن حکیم میں فرمایا۔

فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا۔ (النساء ۳۵)	پس ایک ثالث خاوند کے گھر والوں میں سے بھیجو اور ایک ثالث بیوی کے گھر والوں میں سے اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو توفیق سے ہمکنار کرے گا۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ کسی شخص کو فیصلہ کرنے کے لیے ثالث بنانا جائز ہے اور جن دو شخصوں کو حکم (ثالث) بنایا جائے گا وہ قرآن کریم ہی کی روشنی میں فیصلہ صادر کریں گے۔

نیز فرمایا۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ (النساء ۵۹)	اگر کسی بات میں تمہارے یہاں نزاع پیدا ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹا دو۔

حضرت علیؓ نے شروع میں تحکیم کو اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو حق پر تصور کرتے اور تحکیم کو ایک فریب سمجھتے تھے۔ بقول ان کے حضرت معاویہؓ اور عمروؓ بن العاصؓ نے تحکیم کی سلسلہ جنبانی اس وقت کی جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ کا لشکر ان پر غالب ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نیزوں پر قرآن کریم کے نسخے بلند کیے اور قرآن کو حکم بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر بباطن ان کا مقصد حضرت علیؓ کی فوج کو کمزور کرنا تھا۔ اور اگر حضرت علیؓ کے رفقاء تحکیم کو قبول نہ کرنے کے سلسلہ میں ان کی بات مان لیتے تو تاریخ کا دھارا بدل جاتا اور حضرت معاویہؓ اور اہل شام شیروں کے پنجوں میں پھنس جاتے مگر خدا کی تقدیر بدل نہیں سکتی۔

امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کو حکم اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ فریقین کی نمائندگی کریں۔ اور قرآنِ عزیز کی روشنی میں فیصلہ صادر کریں۔ اس لیے کہ یہ بات کسی طرح قرین قیاس نہ تھی کہ دونوں لشکر شور ڈالنے لگتے یا لشکر کے تمام افراد یکے بعد دیگرے اپنے دلائل ذکر کرتے۔ صحیح بات وہی تھی جو حضرت علیؓ نے تحکیم کو قبول کرنے کی صورت میں انجام دی۔ اس کے سوا دوسری کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ مگر متقدمین خوارج بدوی لوگ تھے۔ جنھوں نے قرآن کریم کے الفاظ ضرور پڑھے تھے۔ مگر سنّت نبوی کی روشنی میں فہم قرآن سے بہرہ ور نہ ہو سکے تھے۔ ان میں نہ کوئی فقیہ تھا اور نہ حضرات ابن مسعودؓ علیؓ۔ عائشہ۔ معاذ بن جبل۔ ابوالدرداء سلمان۔ زید۔ ابن عباس اور ابن عمرؓ رضی اللہ عنہم کے اصحاب و تلامذہ میں سے کوئی موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کی تکفیر کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک جاہل واقع ہوئے تھے۔ (الفِصَل ج ۴ ص ۱۵۶)۔

خوارج جمہور اہل اسلام کے ساتھ حرب و پیکار اور ان کے قتل کرنے کو جائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ خلفائے بنو امیہ کے خلاف لڑتے رہے اور جب تک اموی خلافت قائم رہی وہ اس کے حلق میں کھٹکتا خار بنے رہے۔ حتیٰ کہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اموی خلافت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ اموی خلافت کی جانب سے مہلّب بن ابی صفرہ نے خوارج کے خلاف حرب و ضرب کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور وہ بھی پامردی سے اس کا مقابلہ کرتے تھکتے نہ تھے۔ جب خلافتِ عباسیہ معرضِ وجود میں آئی تو شروع شروع میں خوارج اس کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ مگر طویل لڑائیوں نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اور ان کی عزت و شہرت کا شعلہ بجھ گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خوارج کے شر سے بچایا۔

فقہ الخوارج: خوارج، حدیث نبوی سے بالکل بیگانہ تھے۔ وہ دوسرے مسلمانوں سے حدیث کی نقل و روایت اس لیے نہیں کرتے تھے کہ وہ ان کے نزدیک جھوٹے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خوارج کی فقہ نہ صرف شرعی احکام کے خلاف بلکہ نصوص قرآنی سے بھی متصادم ہے۔ فقہ خوارج کے چند مسائل ملاحظہ ہوں۔

۱۔ بعض خوارج کے نزدیک تیمم ہر جگہ اور ہر وقت جائز ہے۔ حتیٰ کہ جو شخص کنوئیں کے نزدیک بیٹھا ہو۔ وہ بھی تیمم کرسکتا ہے۔

۲۔ نماز جو مسلمانوں پر فرض ہے وہ صرف اتنی ہے کہ ایک رکعت فجر کو اور ایک رکعت عشا کے وقت پڑھ لی جائے۔

۳۔ حج سال بھر کے تمام مہینوں میں کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ غیر خوارج کے بچے اور ان کی عورتیں بھی مباح الدم ہیں۔

۵۔ دختر زادی اور پوتی کے ساتھ نکاح جائز ہے۔

خوارج کے یہ فقہی مسائل اس امر کے آئینہ دار ہیں کہ وہ قرآنی نصوص سے آشنا نہ تھے۔ اس جہالت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خوارج عام مسلمانوں کی روایت کردہ احادیث کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ ان کو کافر تصوّر کرتے تھے۔ البتہ اپنے ائمہؒ کی مرویات پر اعتماد کرتے تھے۔ حالانکہ وہ سنت رسولؐ اور قرآن کے صحیح فہم و ادراک دونوں سے کورے تھے۔ مگر یہ بات تمام خوارج پر صادق نہیں آتی۔ بلاشبہ متاخرین خوارج میں بڑے بڑے محدثین و فقہا پیدا ہوئے۔ اور بقول ابن الصلاح امام بخاری جیسے نقادِ حدیث نے ان کی نقل و روایت کو بنظر استحسان دیکھا۔ مثلاً امام بخاریؒ، عمران بن حطّان کی مرویات سے احتجاج کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خوارج کے نزدیک جھوٹ بولنا کفر کے مترادف ہے۔ کیونکہ کبیرہ کا مرتکب ان کے نزدیک کافر ہے۔ اور کذب بھی کبائر میں شامل ہے۔

خوارج اور وضع حدیث: ایک طرف تو خوارج کاذب کو کافر قرار دیتے تھے اور دوسری جانب ان میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جو اپنے باطل عقائد و نظریات کی ترویج و اشاعت کے لیے حدیثیں وضع کر کے ان کو رسول کریم کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ محدث ابن الجوزی اپنی کتاب الموضوعات کے مقدمہ میں ابن لَہیعَہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک خارجی نے وضع حدیث سے توبہ کر لی تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ "یہ احادیث دین کا سرچشمہ ہیں۔ اس لیے ذرا دیکھ لیا کرو کہ تم کس شخص سے اپنا دین اخذ کر رہے ہو۔ ہماری حالت تو یہ تھی کہ جس بات کو پسند کرتے اس کے متعلق حدیث گھڑ لیا کرتے تھے۔ (موضوعات ابن الجوزی)

مشہور محدث عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں کہ لوگوں نے اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر رکھا ہے کہ حضور نے فرمایا، جب تمہیں میری کوئی حدیث ملے تو اسے کتاب اللہ پر پرکھ کر لیا کرو۔ اگر کتاب اللہ سے ہم آہنگ ہو۔ تو اسے میری بیان کردہ حدیث ہی سمجھو۔ حالانکہ اس کو خوارج اور زنادقہ نے وضع کر کے آنحضور کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ظاہر پرست اور عام اہل اسلام کی مرویات کو ٹھکرا دینے والی قوم سے یہ بات کچھ بعید نہیں۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ خوارج کی ساختہ پرداختہ احادیث شیعہ موضوعات کے مقابلہ میں نہایت کم ہیں۔ اس کے تین وجوہ ہیں۔

۱- خوارج کاذب کی تکفیر کرتے تھے۔ اس لیے کذب ان میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

۲- چونکہ خوارج غیر مہذب اور درشت طبع قسم کے دیہاتی لوگ تھے۔ اس لیے دیگر اقوام مثلاً ایرانیوں اور یہودیوں کو اپنی قوم میں سمونے کے لیے تیار نہ تھے۔ بخلاف ازیں عجمی لوگ شیعہ میں گھس آئے تھے اور انہوں نے بکثرت احادیث وضع کی تھیں۔

۳- خوارج اپنے اعداء و خصوم کے مقابلہ میں اپنے اسلحہ اور قوت و شجاعت سے کام لینے کے عادی تھے۔ وہ شیعہ کی طرح تقیہ سے آشنا نہ تھے۔ بلکہ اعلانیہ اپنے عقائد کا

اظہار پوری بے باکی سے کرتے تھے۔ اس لیے وہ اپنے دشمنوں کو نیچا دکھانے کے لیے جھوٹ کا سہارا نہیں لیتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی نگاہ میں کافر تھے۔ اور کفر سے بڑھ کر عیب و نقص اور کیا ہو سکتا ہے؟ وہ تلوار کے دھنی تھے اور بلا محابا اسے استعمال کرتے تھے۔

مندرجہ صدر عوامل و محرکات کے پیش نظر دیگر فرقہ ہائے اسلامی کے مقابلہ میں خوارج کے یہاں حدیث میں دروغ گوئی کی قلت پائی جاتی ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خوارج کا دامن وضع حدیث کی آلودگی سے پاک ہے۔ بلاشبہ ان میں حدیثیں وضع کرنے والے موجود تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی تعداد کم تھی۔

۳۔ شیعہ اور ان کے افکار و معتقدات: سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد حضرت علیؓ یا کسی اور کے حق میں خلافت کی وصیت نہیں فرمائی تھی۔ کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوا، کہ آپ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اسی طرح کسی روایت صحیحہ سے ثابت نہیں کہ حضرت علیؓ نے خود بھی اس کا دعویٰ کیا تھا اور اگر حضرت علیؓ کو اس قسم کی وصیت کا علم ہوتا تو یہ ممکن نہ تھا کہ آپ صحابہ سے اس کا ذکر نہ فرماتے۔ جو حضورؐ کی وصیت کے نافذ کرنے میں ذرا بھی لیت و لعل نہ کرتے۔ بخلاف ازیں جناب علی نے بالترتیب حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت کو تسلیم کیا اور ان کے دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔

شیعان علیؓ کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ چند صحابہ کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ بوجوہ حضورؐ کے بعد آپ کے جانشین ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ حضرت عباس عم رسولؐ کے بعد آپ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ دوسرے یہ کہ آپ سابق الاسلام تھے اور غزوۂ بدر اور دیگر غزوات میں شرکت کر چکے تھے۔ تیسرے یہ کہ آپ جگر گوشۂ رسولؐ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے خاوند تھے۔ حضرت علیؓ میں جو دیگر اوصاف و فضائل پائے

جاتے تھے۔ وہ اس پر مزید ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ حد درجہ شجاع اور اس کے ساتھ ساتھ بہترین قاضی و مفتی بھی تھے۔ اس میں آپ کو ضرب المثل کی حد تک شہرت حاصل تھی۔

حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت عباسؓ متاخر الاسلام تھے۔ آپ فتح مکہ کے دن حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ غزوۂ بدر میں قریش مکہ کی امداد کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ مزید برآں وہ ان خصوصیات سے عاری تھے، جو جناب علیؓ کا طرّۂ امتیاز تھیں۔ مگر حضرت علیؓ کے اعوان و انصار نے ملت کے شیرازہ کو پراگندگی سے بچانے کے لیے حضرت علیؓ کے فضائل کا اظہار نہ کیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ اسی طرح وہ جناب فاروق و عثمان غنی رضی اللہ عنہما کی بیعت سے بھی پیچھے نہ رہے۔ جب حضرت عثمانؓ کی شہادت سے اُمت میں فتنہ بازی کا ظہور ہوا تو شیعان علی نے باصرار ان کو خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے کہا۔ جس وقت امیر معاویہؓ قصاص عثمانؓ کا مطالبہ لے کر کھڑے ہوئے تو ان کے اور حضرت علیؓ کے مابین لڑائیوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ جس کا سلسلہ جنگِ صفّین پر جا کر ختم ہوا۔

جنگِ صفّین کے بعد شیعی فکر نے ایک نیا رُخ بدلا اور بکثرت زنادقہ منافقین اور اربابِ بدعات و اہواء دین میں فساد و بگاڑ پیدا کرنے کے لیے حضرت علیؓ کے اعوان و انصار کے ساتھ مل گئے۔ یہ لوگ آگے چل کر شیعہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت علیؓ رسول کریم کی وصیت پر خلافت کا اولین استحقاق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ حضرت علیؓ کو "وصی" کہا کرتے تھے۔ ان کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد خلافت کا حق ان کے بیٹوں کو پہنچتا ہے اور جو شخص ان کو ان کے جائز حق سے محروم رکھتا ہے وہ غاصب و ظالم ہے۔ اسی عقیدہ کے زیر اثر وہ جناب شیخین (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کی شان میں گستاخی کرنے لگے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کا حق غصب کر لیا تھا۔ حضرت علیؓ کے بعد وہ حضرت حسنؓ اور پھر حسینؓ کی خلافت کے قائل

تھے۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد وہ مختلف الرائے تھے کہ خلافت کا حقدار کون ہے؟ شیعہ کی ایک جماعت کے نزدیک خلافت کے مستحق حضرت علیؓ کی اولاد میں سب سے بڑے بیٹے محمد بن حنفیہ تھے۔ جب کہ دوسرا گروہ خلافت کو حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں محدود قرار دیتا تھا۔ اور اس اعتبار سے حضرت حسینؓ کے بعد ان کے بیٹے علی زین العابدینؒ کو مستحق خلافت قرار دیتا تھا۔ پھر زین العابدین کے بعد ان کے بیٹے محمد ابا قر۔ امام باقر کی وفات کے بعد شیعہ کے یہاں پھر اختلاف رُونما ہوا۔ شیعہ کی ایک جماعت زید بن علی کے حق میں تھی۔ جن کو زیدیہ کہا جاتا ہے۔ بخلاف ازیں دوسرا گروہ محمد باقر کے بیٹے جعفر صادق کو مستحقِ خلافت خیال کرتا تھا۔

شیعہ کے تمام فرقوں میں سے زیدیہ فرقہ اعتدال پسند اور مبالغہ آمیزی سے پاک تھا۔ یہ شیخین سے اظہارِ براُت نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں خلافت اس اولادِ علی میں محدود ہے جو حضرت فاطمہؓ کے بطن اطہر سے ہو۔ ان کے نزدیک امام کا تعیّن اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے اوصاف بیان کر دیئے جائیں۔ نام لے کر امام کا تعین نہیں کیا جاتا۔ امام جعفر صادق کے متبع بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ اولاد علیؓ میں سے جو بھی اوصاف امامت کے ساتھ متصف ہو، اس کی تائید و حمایت ان پر واجب ہے۔ بہر کیف شیعہ تین بڑے بڑے فرقوں میں بٹ گئے۔

۱۔ کیسانیہ :۔ یہ محمد بن حنفیہ کی امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

۲۔ امامیہ جعفریہ :۔ یہ امام جعفر صادق کو امام سمجھتے ہیں۔

۳۔ امامیہ زیدیہ :۔ یہ حضرت زید بن علی بن حسین کی امامت کے قائل ہیں۔

یہ فرقہ ہائے سہ گانہ شیعہ کے مشہور فرقے تھے۔ علاوہ ازیں شیعہ کے اور بھی بہت سے فرقے ہیں۔ جن کے ساتھ ہماری کوئی غرض وابستہ نہیں۔ اب ہم شیعہ کے عمومی نظریات بیان کرتے ہیں۔

شیعہ کے اہم عقائد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رجعت: شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ فوت نہیں ہوئے بلکہ وہ زندہ مگر پوشیدہ ہیں۔ وہ لوٹ کر آئیں گے اور جس طرح زمین ظلم و جور سے بھر گئی ہے اسی طرح وہ اسے عدل و انصاف سے معمور کر دیں گے۔ شیعہ کا فرقہ کیسانیہ اس بات کا معتقد ہے کہ امام بن حنفیہ رضوی کے پہاڑوں پر زندہ موجود ہیں ان کی ایک جانب شیر اور دوسری جانب چیتا ہے۔ فرشتے ان سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ صبح و شام ان کے پاس بافراغت رزق آتا ہے۔ وہ اس وقت تک موت سے ہمکنار نہ ہوں گے جب تک وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر نہ دیں۔ جس طرح وہ ظلم و جور سے پُر ہو چکی ہے۔

۲۔ نبوّت: شیعہ کے بعض فرقے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کے منصب پر فائز تھے۔ بعض شیعہ کا خیال ہے کہ جبریلؑ غلطی سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رسالت کا پیغام لائے۔ دراصل انہیں حضرت علیؓ کی جانب بھیجا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول کریمؐ کی شکل حضرت علی سے ملتی جلتی تھی۔ بعض شیعہ اس غلطی کی وجہ سے حضرت جبریل کو لعنت ملامت کا مستحق گردانتے بلکہ ان کی تکفیر بھی کرتے ہیں۔

۳۔ اُلوہیت: شیعہ میں سے ابن سبا حمیری کے اتباع و اعوان اُلوہیت علیؓ کے قائل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا تھا "آپ ہی وہی ہیں"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "کیا مطلب"؟ کہنے لگے "آپ اللہ ہیں"۔ حضرت علی نے یہ سن کر تعجب کیا اور ان کو آگ میں جھونک دیا۔ شیعہ کا ایک فرقہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُلوہیت کا عقیدہ رکھتا ہے۔

۴۔ تقیّہ: تقیہ کے معنی بچاؤ حاصل کرنے اور پوشیدہ رہنے کے ہیں۔ شیعہ کی یہ

عادت تھی کہ جو شخص مسندِ اقتدار پر فائز ہوتا اس کی اطاعت کرتے۔ اور جو امام بقول ان کے پوشیدہ ہے۔ اس کا حال اصحاب اقتدار پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔ پوشیدہ طور پر اپنی دعوت و تبلیغ کا کام بھی جاری رکھتے۔ جب ان کے اعوان و انصار کی تعداد کافی ہو جاتی تو انقلاب برپا کرنے کے لیے قوتِ حاکمہ کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتے شیعہ کے نزدیک تقیہ ایمان کا ایک لازمی جزو ہے۔ باطل تاویلات کا سہارا لے کر وہ اس کو قرآن کریم کی آیات سے ثابت کرنے کی سعیِ لاحاصل بھی کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں فرمایا۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا۔ — ان لوگوں کو دگنا اجر دیا جائے گا کیوں کہ انھوں نے صبر کیا۔

شیعہ کے نزدیک صبر سے اس آیت میں تقیہ پر صبر کرنا مراد ہے۔

حدیثِ نبوی پر تشیع کے اثرات:

شیعہ کے اکثر عقائد و افکار اس قسم کے ہیں کہ ان کی موجودگی میں شیعہ کے کفر میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مثلاً شیعہ کا یہ عقیدہ کہ اللہ کی ذات حضرت علیؓ میں حلول کر آئی ہے۔ یا یہ عقیدہ کہ حضرت علیؓ رسول کریمؐ کے بعد نبوت کے منصب پر فائز تھے۔ اسی طرح شیعہ قرآن کریم کی تاویلاتِ باطلہ کرتے اور کہتے ہیں کہ قرآن عزیز کے ستر بطن ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ کافر ہیں اور دین سے اس طرح باہر نکل چکے ہیں۔ جیسے تیر نشانہ پر لگ کر آگے نکل جاتا ہے۔ یہ لوگ ضلالت کی دعوت دینے والے ہیں۔ اور ان کے پاس مزعومہ الہام کے سوا کوئی دلیل سرے سے موجود ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی حقیقت کے اثبات کے لیے الہام کوئی حتمی دلیل نہیں۔ اس لیے کہ اگر ایک شخص الہام کی اساس پر کسی چیز کو ثابت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا مخالف اپنے الہام کی بنا پر اس چیز کی نقیض کو ثابت کر سکتا ہے۔ آخر ایک شخص کا الہام دوسرے کے

الہام پر فائق کیسے ہو سکتا ہے؟ در اصل الہام کوئی چیز نہیں۔ شرعی احکام و عقائد کے اثبات کے لیے صحیح معیار صرف عقل سلیم اور نقل صحیح ہے۔ جو نبی معصومؐ سے قطعی و حتمی دلائل و براہین کے ساتھ ثابت ہو۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تشیّع ایک اوٹ ہے۔ جس کے پیچھے اکثر اعدائے اسلام مثلاً ایرانی۔ رومی اور یہودی اس لیے چھپے رہتے تاکہ دینِ اسلام کو نقصان پہنچائیں اور اسلامی حکومت کے نظام کو تہ و بالا کر دیں۔ ایرانی اس زعمِ باطل میں مبتلا تھے کہ وہ شروع سے آزاد رہے اور لوگوں پر حکومت کرتے چلے آتے ہیں۔ سب لوگ ان کے نوکر چاکر اور غلام ہیں۔ جب عربوں کے ہاتھوں خداوند کریم نے ان کو ذلیل کیا اور ان کی حکومت چھین لی تو ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ یہ وہی عرب تھے۔ جن سے بڑھ کر ذلیل ان کی نظر میں دوسرا کوئی نہ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے سامنے سرنگوں ہونے کے لیے تیار نہ تھے اور ہمیشہ اس بات کے لیے مصروفِ جہد و سعی رہا کرتے تھے۔ کہ کسی طرح اپنا کھویا ہوا مجد و وقار واپس لے لیں۔ مگر یہ ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ لڑائیوں کے دوران ان پر یہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی کہ مسلمان ان سے زیادہ طاقتور زیادہ حوصلہ مند اور شجاع ہیں۔

چنانچہ عجمی کفار نے مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے حیلے بہانے تلاش کرنے شروع کر دیئے انہوں نے سوچا کہ مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لیے مکر و فریب سے بڑھ کر دوسرا کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر شیعہ کے ساتھ مل گئے اور حبِ اہل بیت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ بقول ان کے جن لوگوں نے حضرت علی پر مظالم ڈھائے تھے، یہ ان کے خلاف اظہار غیظ و غضب کرتے اور مسلمانوں کو فتنہ و ہلاکت کی وادیوں میں دھکیل دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں غلط سلط عقائد پھیلا کر ان کو صحیح اسلامی احکام و تعلیمات سے منحرف کر دیا۔ یہ عقائد اس قسم کے تھے جن سے

دین اسلام سرے سے قائم ہی نہیں رہتا۔ اور اس کی اساس و بنیاد منہدم ہو جاتی ہے۔

بقول مؤرخین اس فتنہ کا بانی و موسس ایک یہودی شخص تھا۔ جس کو عبداللہ بن سبا کہتے ہیں۔ اس نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ یہ شخص حضرت علیؓ کی مدح و ستائش میں اس حد تک غلو سے کام لیتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات جناب علیؓ میں حلول کر آئی ہے۔ یہ لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتا تھا۔ بقول امام ابن حزمؒ ابن سبا کی تعلیمات کے نتیجہ میں شیعہ کے دو فرقوں اسماعیلیہ و قرامطہ نے جنم لیا۔ یہ دونوں فرقے علانیہ اسلام کو چھوڑ کر مجوسیت کو اختیار کر چکے تھے۔

عجمی کفار اپنا لاؤ لشکر لے کر مسلمانوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ مگر مسلمانوں نے ناکام و نامراد ان کو واپس لوٹنے پر مجبور کیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ طاقت کے ذریعے کامیاب نہیں ہو سکتے تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف دام تزویر بچھانا شروع کر دیئے۔ سب سے پہلے ان کی نگاہ قرآنِ حکیم پر پڑی۔ مگر اس میں آگے اور پیچھے کسی طرف سے بھی باطل کا گزر ممکن نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ قرآن حکیم میں گو تغیر و تبدل کا کوئی امکان نہ تھا۔ تاہم رمز و تاویل کی گنجائش ضرور تھی۔ چنانچہ سبائیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ "آسمان سے محمدؐ اور زمین سے ان کے صحابہ مراد ہیں۔ صلوٰۃ سے امام کی دعا مقصود ہے۔" اور اس قسم کے دیگر اقوال باطلہ جن کو ذوقِ سلیم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جب وہ قرآن کا مقابلہ نہ کر سکے تو انہوں نے اپنی عنانِ التفات حدیثِ نبوی کی جانب موڑ دی۔ انہوں نے دیکھا کہ حدیث نبوی میں اپنے عقائد باطلہ کو ٹھونسنے اور دروغ آمیزی کرنے کے لیے ایک وسیع میدان موجود ہے۔

شیعہ کی دروغ بافی: ان شیعہ نما اعدائے دین نے اپنے اپنے اغراض و مقاصد اور اپنے عقائد و نظریات کی تائید میں حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں۔ ان وضع کردہ احادیث کا تعلق زیادہ تر حضرت علیؓ کی قدر و منزلت

اور امیر معاویہؓ کی تنقیص و توہین کے ساتھ ہے۔ چنانچہ موضوعات پر مشتمل کتب ایسی احادیث سے مملوّ ہیں۔ مثال کے طور پر ہم امام جلال الدین سیوطی کی کتاب "اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ" سے چند احادیث نقل کرتے ہیں۔

۱۔ جو شخص مر جائے اور اس کے دل میں علیؓ کا بغض ہو تو یہودی مرتا ہے یا نصرانی۔

۲۔ اے علی! میں تجھے نبوت کے ساتھ مختص کرتا ہوں حالانکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ سات باتوں کی بنا پر لوگ تجھ سے عداوت رکھیں گے۔ اور قریش میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ جھگڑا نہ کر سکے گا۔ آپ قریش میں سب سے پہلے ایمان لائے۔ آپ خدا کے عہد کو پورا کرنے والے اور خدا کے حکم پر سب سے زیادہ قائم رہنے والے ہیں۔ (یہ طویل حدیث ہے)۔

۳۔ میرے بعد ایک فتنہ بپا ہوگا۔ اگر تم میں سے کوئی اسے پالے، تو وہ دو چیزوں کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ ایک کتاب اللہ اور دوسرے علی ابن ابی طالب۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ علیؓ میرے بعد میرے جانشین ہوں گے۔

۴۔ ہر نبی کا ایک وصیؔ اور ایک وارث ہوتا ہے۔ میرے وارث اور وصیؔ علی ہیں۔

۵۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے تو آپ کے پاس حضرت عائشہؓ و حفصہؓ موجود تھیں۔ آپ نے فرمایا "میرے دوست کو بلاؤ"۔ ان دونوں نے حضرت ابوبکرؓ کو کہلا بھیجا اور وہ تشریف لائے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے کچھ نہ فرمایا۔ چنانچہ ابوبکرؓ اٹھ کر چلے گئے۔ حضورؐ نے پھر دونوں کو حکم دیا کہ میرے دوست کو بلاؤ۔ اب انہوں نے حضرت عمرؓ کو بلالیا۔ آپ آئے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ لیکن حضورؐ نے انہیں کچھ نہ کہا جب عمرؓ چلے گئے تو نبی کریمؐ نے پھر فرمایا میرے دوست کو بلاؤ۔ اب انہوں نے حضرت علیؓ کو بلایا۔ آپ آئے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے عائشہؓ و حفصہؓ

دونوں کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اور وہ چلی گئیں۔ حضورؐ نے فرمایا علیؓ! کاغذ اور دوات لائیے چنانچہ آپ لکھواتے اور علیؓ لکھتے گئے۔ حضرت جبریلؑ گواہ قرار پائے۔ پھر کاغذ لپیٹ لیے گئے۔ راوی کا بیان ہے کہ لکھنے لکھوانے اور شہادت دینے والے کے سوا اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں صحیفہ میں درج کردہ مضمون سے واقف ہوں، اس کی بات تسلیم نہ کیجیے۔

(اللآلی المصنوعہ ج اص ۳۲۳ تا ۳۶۷)۔

اور اس قسم کی دیگر احادیث موضوعہ جن میں حضرت علیؓ کے وصی ہونے یا ان کی خلافت و نبوت کا اثبات ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ کی جانب سے شیعی اکاذیب کی تردید:

یوں نظر آتا ہے کہ حضرت علیؓ کے وصی یا خلافت ہونے کا معاملہ خود ان کے زمانہ میں بھی مشہور ہو چکا تھا۔ چنانچہ بعض صحابہؓ نے اس ضمن میں حضرت علیؓ سے دریافت بھی کیا تھا۔ آپ نے جواب میں فرمایا، کہ نبی کریمؐ نے خلافت سے متعلق میرے حق میں کوئی وصیت نہیں فرمائی۔

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی سے پوچھا، کیا آپ کے پاس کوئی تحریری دستاویز ہے؟ فرمایا "نہیں"۔ ایک روایت یوں ہے کہ اس ذات کی قسم جس نے دانے کو اگایا اور روحوں کو پیدا کیا، میرے پاس کوئی تحریر نہیں ہے، صرف اللہ کی کتاب یا فہم و ادراک جو خداوند تعالیٰ کسی مسلم کو عطا کر دے۔ البتہ میرے پاس ایک رسالہ ہے۔ میں نے پوچھا اس رسالے میں کیا ہے؟ فرمایا اس میں دیت کے احکام اور قیدیوں کو آزاد کرنے سے متعلق مسائل مندرج ہیں۔ نیز یہ کہ کسی مسلم کو کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ (بخاری کتاب العلم)

مندرجہ صدر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو جحیفہؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا تھا کہ کیا آپ کو اسرارِ وحی میں سے کوئی ایسا راز بھی بتایا گیا تھا، جس کا علم دوسروں کو نہ ہو؟

اس سوال کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ ابوجُحَیفہ نے وصیت و خلافت کے بارے میں لوگوں کی زبانی کچھ باتیں سُنی ہوں گی۔ جب انہوں نے یہ بات حضرت علیؓ سے دریافت کی۔ تو آپ نے صریحًا اس سے انکار کیا۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق حلف بھی اُٹھایا۔ آپ نے استثناء کے طور پر جس رسالہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کا شیعی عقائد کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ یہ روایت متعدد طُرق سے مروی ہے۔ اور بعض میں کچھ زائد الفاظ بھی ہیں۔ مگر کسی روایت میں مذکور نہیں کہ نبی کریم نے حضرت علیؓ کے حق میں وصیت فرمائی تھی یا حضرت علیؓ کو کوئی خصوصی راز بتایا تھا۔ (فتح الباری کتاب العلم ج اص ۱۸۲)۔

اس کی دلیل وہ روایت بھی ہے جو ابن عساکر نے حضرت حسن سے نقل کی ہے کہ جب حضرت علیؓ کوفہ آئے تو ابن الکواء اور قیس بن عبادہ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا۔ ذرا یہ بتائیے کہ مسلمانوں کے خلیفہ بن کر آپ یہ سفر طے کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو باہم لڑا رہے ہیں۔ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے ساتھ کوئی عہد کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو بتائیے ہم آپ کی بات مان لیں گے۔ اس لیے کہ ہم آپ پر اعتماد کرتے اور آپ کو راست باز اور امین سمجھتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں فرمایا۔ جہاں تک آنحضورؐ کے عہد کا تعلق ہے، اس کا جواب نفی میں ہے۔ آپ نے میرے ساتھ کوئی عہد نہیں کیا۔ میں آپ پر سب سے پہلے ایمان لایا تھا۔ اب آپ پر جھوٹ باندھنے میں پہل کیسے کر سکتا ہوں؟ اگر مجھ سے نبی کریمؐ نے کوئی عہد کیا ہوتا تو میں ابوبکرؓ و عمرؓ کو منبر رسول پر کیوں کر کھڑا ہونے دیتا؟ اگر میرے پاس میری چادر کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی میں ان دونوں کے خلاف جنگ آزما ہوتا۔ مگر بات یہ ہے کہ رسول کریمؐ نہ قتل ہوئے نہ اچانک فوت ہوئے بخلاف ازیں آپ نے حالت مرض میں چند دن اور راتیں بسر کیں۔ مؤذن آپ کے پاس حاضر ہو کر نماز کی اطلاع دیتا اور آپ حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیتے۔ حالانکہ میں اس وقت موجود ہوتا تھا۔

جب ازواج مطہرات میں سے ایک نے حضورؐ کو ابوبکرؓ کو امام مقرر نہ کرنے کا مشورہ دیا، تو آپ نہ مانے اور ناراض ہوئے۔ آپ نے فرمایا اَنْتُنَّ صَوَاحِبُ یُوسُفَ (تم ان عورتوں کی طرح ہو جو حضرت یوسف کو بہکا رہی تھیں)۔

حضرت علیؓ نے کہا کہ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سفرِ آخرت فرمایا تو ہم نے اپنے معاملات پر غور فرمایا اور جس شخص کو رسول کریم نے ہمارے دینی اُمور (امامتِ صلوٰۃ) کے لیے منتخب کیا تھا، ہم نے اس کو اپنے دنیوی اُمور (خلافت) کے لیے چن لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نماز اسلام کی اصل واساس اور دین کا ستون ہے۔ چنانچہ ہم نے ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ جس کے وہ ہر لحاظ سے اہل تھے۔ ہم میں سے دو آدمیوں نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے وفات پائی تو عمر فاروق آپ کے جانشین قرار پائے اور ان کی ہموار کردہ راہ پر گامزن رہے۔ چنانچہ ہم نے عمر کی بیعت کر لی اور ہم میں سے دو آدمی بھی اس میں مختلف الرائے نہ ہوئے۔

جب حضرت عمر شہادت سے سرفراز ہوئے تو مجھے اپنی قرابت وسبقت اور عظمت وفضیلت یاد آئی۔ میں سمجھتا تھا کہ کوئی شخص میرا حریف نہیں ہو سکتا۔ دوسری جانب حضرت عمرؓ نے وفات سے پہلے یہ سوچا کہ "جو شخص بھی میرے بعد خلیفہ بنے گا اور کسی گناہ کا ارتکاب کرے گا تو میں قبر میں ہوتے ہوئے بھی اس کے گناہ میں برابر کا شریک ہوں گا۔" اس لیے آپ نے اپنی اولاد کو حقِ خلافت سے محروم کر دیا۔ آپ نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ جن میں سے ایک میں بھی تھا۔ جب یہ ممبران جمع ہوئے تو میں نے سوچا کہ میرے ساتھ انصاف نہیں کیا جائے گا۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہم سے عہد لیا کہ جو شخص بھی خلیفہ منتخب ہو گا۔ ہم لوگ اس کی اطاعت کریں گے۔ پھر عبدالرحمٰنؓ نے عثمانؓ کا ہاتھ پکڑا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ جب میں نے اپنے معاملہ پر غور کیا تو محسوس کیا کہ میں ہونے والے خلیفہ کی اطاعت کا عہد کر چکا ہوں۔ چنانچہ میں نے

عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ میں نے مقدور بھر ان کی اطاعت کا دم بھرا۔ ان کے لشکروں میں شامل ہو کر غزوات میں شریک ہوا۔ جب عثمان مجھے کچھ دیتے تو میں لے لیتا۔ جب لڑنے کا حکم دیتے تو میں اس کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس کے سامنے اپنے دُرّہ کے ساتھ لوگوں کو سزا دیتا۔ جب حضرت عثمان شہادت سے سرفراز ہوئے تو میں نے پھر اپنے معاملہ پر غور کیا۔ میں نے دیکھا کہ جن دو خلیفوں (ابوبکرؓ و عمرؓ) کو رسول کریمؐ نے نماز پڑھانے کا حکم دے کر ان کی امامت کی جانب اشارہ فرمایا تھا۔ وہ اب دنیا میں موجود نہیں اور جن کے لیے عبدالرحمٰن نے عہد لیا تھا وہ شہادت پا گئے۔ چنانچہ اہالیانِ مکہ و مدینہ اور کوفہ والوں نے میری بیعت کر لی۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک اور شخص (امیر معاویہؓ) درمیان میں کود پڑا۔ جو نہ میرے جیسا تھا اور نہ میری طرح رسول کریمؐ کا قریبی عزیز تھا۔ وہ مجھ جیسا علم و فضل بھی نہیں رکھتا تھا۔ اور میں ہر اعتبار سے خلافت کا اس سے زیادہ مستحق تھا۔" (تاریخ الخلفاء للسیوطی صفحہ ۱۱۹)۔

مندرجہ صدر روایت بشرطِ صحت ان توہمات کا خاتمہ کر دیتی ہے جو شیعہ نے نبی کریمؐ کی وصیت کے بارے میں پھیلا رکھے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ شیعہ کی یہ بات غلط ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ غاصب تھے۔ صحیح بخاری کی سابق الذکر روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

سابق الذکر بیانات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ شیعہ مطلب براری کے لیے رسول کریمؐ پر جھوٹ باندھنے میں کچھ باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جو شخص بھی سلطنت و اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ شیعہ کا لبادہ اوڑھ لیا کرتا تھا۔ مختار بن ابی عبید ثقفی ہی کو دیکھیے۔ پہلے وہ خارجی تھا۔ پھر عبداللہ بن زبیرؓ کا پیرو بن کر زبیری کہلایا۔ آخر میں کیسانی شیعہ بن گیا اور محمد بن حنفیہ کی دعوت دینے لگا۔ پھر اس دعوت سے اس نے ذاتی مفاد حاصل کیا اور حدیثیں وضع کرانے لگا۔

مختار ثقفی کے بارے میں منقول ہے کہ جب اس نے کوفہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ایک حدیث دان سے کہا نبی اکرمؐ کے نام پر ایک ایسی حدیث وضع کیجیے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہو کہ میرے بعد ایک خلیفہ ہو گا۔ جو میرے بیٹے (حضرت حسینؓ) کا قصاص لے گا۔ اس حدیث کے گھڑنے کے عوض میں آپ کو دس ہزار درہم اور اس کے علاوہ خلعت سواری اور خادم عطا کروں گا۔ اس شخص نے کہا میں نبی اکرمؐ کے نام پر تو ایسی حدیث وضع نہیں کر سکتا۔ البتہ کسی صحابی کے نام سے گھڑ لوں گا۔ آپ معاوضہ میں جو کمی کرنا چاہیں کر دیں۔ مختار کہنے لگا "نبی کریمؐ سے جو روایت منقول ہو گی، اس میں زیادہ تاکید ہو گی اور اس پر عذاب بھی سخت ملے گا۔"
(الملل والنحل ج ۱ ص ۱۹۷۔ نیز اللآلی المصنوعہ ج ۲ ص ۴۶۸)۔

شیعہ کی ملمّع سازی: شیعہ نے حدیث نبوی کے سلسلہ میں فریب دہی کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ اسانید صحیحہ کو جان پہچان کر ان کے ساتھ ایسی حدیثیں وضع کر کے چسپاں کر دیں جو ان کے نظریات کے ساتھ میل کھاتی ہیں۔ اس طرح لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں کیں کہ ان احادیث کی اسانید صحیح اور درست ہیں۔ مثلاً شیعہ کے دو راوی سُدّی اور ابن قُتَیبہ کے نام سے موسوم ہیں اور وہ ان سے روایت کرتے ہیں۔ اسماء الرّجال سے بے خبر شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ یہ دونوں اہل السنّت کے دو مشہور محدّث ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ دو شیعہ راوی بھی اسی نام کے ہیں جو حد درجہ کے غالی شیعہ ہیں۔

محدثین نے شیعہ کے دجل و فریب کا پردہ چاک کیا اور لوگوں کو حقیقتِ حال سے روشناس کرایا کہ سُدّی نام کے دو راوی ہیں۔ ایک سُدّی کبیر جو ثقہ راوی ہے اور دوسرا سُدّی صغیر جو کذّاب اور وضّاع ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ابن قُتَیبہ نام کے بھی دو راوی ہیں۔ ایک ابن قُتَیبہ شیعہ ہے اور دوسرا عبداللہ بن مسلم بن قُتَیبہ اہل السنّت

اور ثقہ راوی ہے۔ اسی پر بس نہیں، شیعہ نے اباطیل پر مشتمل کتب خود تصنیف کر کے ان کو اہل السنت علما کی طرف منسوب کر دیا مثلاً کتاب سرّ العارفین شیعہ نے مرتب کی اور اسے غزالی کی تصنیف قرار دیا۔

شیعہ نے حضرت علیؓ کے علمی معلومات کو ناقابل اعتماد ٹھہرانے کے سلسلہ میں بھی اہم پارٹ ادا کیا ہے اور وہ یوں کہ شیعہ نے اقاویل باطلہ اور نظریات فاسدہ کو حضرت علی کی جانب منسوب کر دیا۔ اور ان کی تائید میں حدیثیں وضع کرنے سے بھی احتراز نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محدثین حضرت علی کے اقوال وفتاویٰ کو تسلیم نہیں کرتے بجز ان اقوال کے جو حضرت علیؓ کے اہل بیت یا اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ مثلاً عبیدہ سلمانی یا شریح اور ابووائل سے مروی ومنقول ہوں (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۶)

دوسری جانب ضعیف الایمان مسلمانوں خصوصاً بنوامیہ کے اعوان وانصار پر شیعہ کی حدیث سازی کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ کی مدح وتوصیف میں حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں اور شیعہ نے ان کے اوپر جو اتہامات باندھے تھے، اس کا توڑ مہیا کیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ دشمن سے لڑنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ مگر دین اس انتقامی کارروائی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ یہ تو منافق کا طرز عمل ہے کہ جب لڑتا ہے تو گالی دینے پر اتر آتا ہے۔ خلفائے راشدین کے جو فضائل ومناقب احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں، کیا وہ ان کی عظمت وفضیلت کے اظہار وبیان کے لیے کافی نہ تھے؟ پھر اس دروغ بافی کا کیا مطلب؟ یوں نظر آتا ہے کہ سیاسی ہتھکنڈے بھی اس سلسلہ میں کارفرما تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہ کی فضیلت میں بکثرت حدیثیں وضع کی گئیں۔ ہم چند احادیث امام سیوطی کی کتاب "اللآلی المصنوعہ" سے نقل کرتے ہیں۔

۱۔ ایک دفعہ جبریلؑ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ ابوبکرؓ وہاں گزرے حضورؐ

نے فرمایا "یہ ابوبکر ہیں کیا آپ ان سے آشنا ہیں"؟ جبریلؑ نے کہا "جی ہاں۔ یہ آسمان پر زمین سے زیادہ مشہور ہیں۔ فرشتے ان کو "حلیم قریش" (قریش کا بردبار شخص) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ آپ کی زندگی میں آپ کے وزیر ہیں اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلیفہ ہوں گے۔"

۲۔ جب معراج کے موقع پر میں آسمانوں پر گیا تو میں نے دعا کی، اے اللہ! علی ابن طالب کو میرا جانشین بنا دے۔ یہ سن کر آسمان گونج اٹھے اور فرشتے ہر طرف سے پکارنے لگے، اے محمدؐ! یوں کہیے کہ جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ ابوبکرؓ آپ کے جانشین ہوں۔

۳۔ پہلے آسمان پر اسی ہزار فرشتے ہیں جو اس شخص کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں جو ابوبکرؓ و عمرؓ کو چاہتا ہو۔ اسی طرح دوسرے آسمان پر اسی ہزار فرشتے ہیں جو ان لوگوں پر لعنت بھیجتے ہیں جو ابوبکر و عمر سے عداوت رکھتے ہوں۔

۴۔ جنت میں جو بھی درخت ہے اس کے ہر پتہ پر کلمہ طیبہ اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے اسماء لکھے ہوئے ہیں۔

۵۔ امین اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین ہیں۔ ایک میں (حضرت محمدؐ) دوسرے جبریلؑ اور تیسرے امیر معاویہؓ۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ اور معاویہؓ کو اپنی وحی کا امین قرار دیا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ کثرت علم اور وحی کے امین ہونے کے اعتبار سے امیر معاویہؓ کو نبی بنا دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ معاویہؓ کے گناہ بخش دے گا اور اسے محاسبۂ اعمال سے بچائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی کتاب کا علم دیا اور اسے ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنایا۔

۷۔ جب تم معاویہؓ کو میرے منبر پر خطبہ دیتے سنو تو اسے قبول کر لو۔ اس لیے کہ وہ امین و مامون ہے۔ (اللآلی المصنوعہ للسیوطی)

۴۔ حدیث کی جمع و تدوین میں صحابہ و تابعین کی مساعی جمیلہ

شیعہ و خوارج اور ان کے ہمنواؤں کے علاوہ جمہور اہل اسلام تھے۔ جو تشیّع اور خروج کی آلودگی سے ملوث نہ ہوئے تھے۔ یہ لوگ احادیث صحیحہ سے تمسک کرتے اور اصحابِ بدعت سے منقول احادیث کو تسلیم نہیں کرتے تھے خواہ ان کا سیاسی مسلک کچھ بھی ہو۔ یہ لوگ حدیث نبوی کے سچے خدمت گار تھے۔ انہوں نے احادیث کو ہر قسم کی آمیزش سے پاک وصاف کر دیا اور اصحابِ بدعت نے ان میں جو ملاوٹ کی تھی، اس کو نکال باہر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دین کے اعلام و شعائر بدستور اپنی جگہ پر قائم و دائم رہے اس وقت تک بکثرت صحابہؓ زندہ تھے۔ علاوہ ازیں تابعین کرام کا گروہ بھی حدیث نبویؐ کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ان کے نقشِ قدم پر رواں دواں رہا۔ تابعین نے تشیّع کی آلودگی کو مٹانے اور دروغ پیشہ لوگوں کی اباطیل کے ازالہ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور ان باطل فرقوں کے مقابلہ میں ایک کوہ گراں ثابت ہوئے۔ جب سے فتنہ بازی کا ظہور ہوا صحابہ و تابعین صرف نقل و روایت کی بنا پر کسی حدیث کو تسلیم نہیں کرتے تھے وہ کسی حدیث کو اس وقت مانتے تھے، جب اس کی چھان پھٹک کر لیتے اور ایک ایک راوی کو جانچ پرکھ لیتے۔

ابن سیرینؒ بیان کرتے ہیں کہ لوگ پہلے سند کے بارے پوچھا نہیں کرتے تھے جب فتنہ کی گرم بازاری ہوئی تو لوگ کہنے لگے پہلے راویوں کا حال بتاؤ۔ چنانچہ اہل السنت کی روایت قبول کر لی جاتی اور بدعتی لوگوں کی روایت کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

اس فتنہ کے زیرِ اثر حدیث کی نقل و روایت کرنے والے تابعین نے صحابہ سے یہ کہنا شروع کیا کہ روایت حدیث کے وقت کھرے کھوٹے کی تمیز کر دیا کریں۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ رات کے لکڑہارے کی طرح جو لکڑیوں کے ساتھ اژدہے اور سانپوں کو بھی اپنے گٹھے میں باندھ لیتا ہے، وہ بھی رطب و یابس احادیث کا ذخیرہ جمع کر لیں۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ تابعین جس روایت کو بے اصل سمجھتے، ہرگز قبول نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں تحریر کیا کہ دینی احکام پر مشتمل مجھے ایک رسالہ لکھ بھیجیں اور جو بات پوشیدہ رکھنے کے قابل ہو، اسے پوشیدہ رکھیں۔ ابن عباسؓ نے یہ سن کر فرمایا "میرے نیک بیٹے نے مجھ سے ایک بات کی فرمائش کی ہے۔ میں اس پر عمل کروں گا اور جو چیز اس نے طلب کی ہے اسے وہی دوں گا۔ چنانچہ آپ نے حضرت علیؓ کے فتاویٰ طلب کیے اور ان میں سے کچھ لکھنا شروع کیا۔ حضرت علیؓ کے بعض فیصلے دیکھ کر آپ انہیں نظر انداز کر دیتے اور فرماتے، علیؓ نے یہ فیصلہ اسی صورت میں کیا ہوگا جب آپ گمراہ ہو گئے ہوں۔ (نعوذ باللہ من ذالک)۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ نہیں کیا)۔ (مقدمہ صحیح مسلم)۔

مندرجہ صدر واقعہ اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ شیعہ نے جناب علیؓ کے اقوال و فتاویٰ کو کس حد تک بگاڑ دیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ احادیث کی جانچ پڑتال میں کس ژرف نگاہی اور عمقِ فکر و نظر سے کام لیتے اور صحیح و سقیم کو ممتاز کرنے میں کتنی کوشش کرتے تھے۔ نیز یہ کہ اس دور کے رواۃ و رجال احادیث کی نقد و جرح میں کتنی دلچسپی لیتے اور اس ضمن میں جلیل القدر صحابہ کی جانب رجوع کرتے تھے۔

اس دور میں دروغ پیشہ لوگوں کی جسارت کا یہ عالم تھا کہ صحابہؓ کی موجودگی میں مساجد میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔ حالانکہ صحابہ بہت بُری طرح ان کی خبر لیتے اور مساجد سے نکال دیا کرتے تھے۔ اور بعض صحابہ تو ایسے لوگوں کو مسجد بدر کرنے کے لیے

پولیس کی مدد بھی حاصل کیا کرتے تھے۔

امام ابن ابی شیبہ اور امام مروزی مجاہد سے نقل کرتے ہیں کہ ایک واعظ آکر حضرت ابن عمرؓ کے پاس بیٹھ گیا۔ جب انہوں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے انکار کر دیا آپ نے پولیس بلا کر اسے چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

مندرجہ صدر اقوال و آثار اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ صحابہؓ و تابعینؒ ہمیشہ وضاعین کی گھات میں رہتے اور ان کے اقوال و افعال کی تردید کیا کرتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ عوام ان کے دام تزویر میں آکر سیدھی راہ سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔

صحابہؓ و تابعین نے جس طرح وضاعین کا مقابلہ کیا اور ان کی حقیقت کو طشت ازبام کیا تھا۔ اسی طرح انہوں نے حدیث نبوی کی جمع و تالیف نقل و روایت اور تعلیم و تعلم کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

اسلامی فتوحات کی وسعت: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام کی مساعی جمیلہ کی بدولت اسلامی حکومت کے دائرہ میں بڑی وسعت آئی۔ اور یہ وعدۂ ربانی پورا ہوا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (النور - ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اعمال صالحہ انجام دیئے۔ ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین کا خلیفہ بنائے گا۔ جس طرح ان لوگوں کو خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے۔

چنانچہ ۱۷ھ میں عراق اور شام مکمل طور پر فتح کر لیے گئے۔ ۲۰ھ میں سرزمین مصر کو زیر نگین کیا گیا۔ ۲۱ھ میں فارس کا علاقہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوا۔ ۵۶ھ میں مسلمان ارض سمرقند میں داخل ہوئے اور ۹۳ھ کو جرمنی پر قبضہ کیا گیا۔

ان فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے رہنے والے حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور

اسلامی تعلیمات کو سیکھنے کا تقاضا کرنے لگے۔ چنانچہ مسلم حکام پر لازم ٹھہرا کہ دینی احکام سکھلانے کے لیے صحابہؓ کو ان شہروں میں بھیجا جائے۔ مزید برآں بعض صحابہؓ اپنی مرضی سے ان شہروں میں جاکر لوگوں کو اسلامی احکام سے آگاہ کرنے لگے تھے۔ بعض صحابہؓ نے ان شہروں کو پسند کرکے اپنا وطن بنا لیا تھا اور زندگی بھر وہ انہی میں مقیم رہے۔

صحابہ کرام کے مختلف بلاد و دیار میں بس جانے سے گویا وہاں کتاب و سنت کی تعلیم و تدریس کے مدارس کھل گئے، مختلف علاقوں کے طلبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے چشمۂ علم سے اپنی پیاس بجھاتے اور ان سے وہ فیوض حاصل کرتے جو انہوں نے سرور کائنات سے ورثہ میں پائے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مفتوحہ علاقوں کے ہر گوشہ سے تابعین کا ایک گروہ فارغ التحصیل ہوکر نکلا جو آگے چل کر احادیث کا حامی و محافظ اور راوی و ناقل ثابت ہُوا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ عصر حاضر کی طرح اس دَور میں باقاعدہ مدارس اور کالج کھلے ہوئے تھے۔ جہاں خصوصی انتظامات تھے اور لیکچر دینے کے لیے کلاس روم ہُوا کرتے تھے۔

بخلاف ازیں اس دَور میں عصر حاضر کے باقاعدہ تعلیمی اداروں والی کوئی بات نہ تھی۔ لوگ فطری سادگی کو اپنائے ہوئے تھے۔ صحابہؓ کے سینے دینی علوم کا مخزن تھے۔ مسجدیں اس دَور میں تعلیم گاہ اور دارالحدیث کی حیثیت رکھتی تھیں۔ صحابہ مسجدیں بیٹھ جاتے اور ان کے اتباع و تلامذہ ان کے گرد حلقہ باندھ کر ان کی باتیں سنتے اور ان کو اپنے سینوں میں جاگزیں کرتے۔ تلامذہ سوال کرتے اور صحابہ ان کو کتاب و سنت یا اس اجتہاد کی روشنی میں جواب دیتے جو قرآن و سنت ہی ماخوذ ہوتا تھا۔ اس دَور میں مختلف بلاد و امصار میں جو دارالحدیث پائے جاتے تھے۔ اب ہم ان کا مختصر حال بیان کرتے ہیں۔

بلادِ مختلفہ میں دار الحدیث

۱۔ دار الحدیث مدینہ منوّرہ: مدینہ منورہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی ہجرت گاہ تھا اور وہیں آپ نے اکثر احادیث بیان فرمائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شرعی احکام زیادہ تر مدینہ ہی میں نازل ہوئے۔ مہاجرین مدینہ کی بود و باش کو پسند کرتے تھے اور مکّہ یا کسی دوسری جگہ نقل مکانی کرنا انہیں گوارا نہ تھا۔ سرکارِ دو عالم کی وفات کے بعد مدینہ ملّتِ اسلامیہ اور خلافتِ راشدہ کا مرکز و محور اور کبار صحابہؓ کی اقامت گاہ تھا۔ اس اعتبار سے مدینہ کو صحابہؓ کے اوّلین وطن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ جس کو وہ دوسرے مقامات پر ترجیح دیتے اور آنحضورؐ کی زندگی میں ان کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوتے تھے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد بھی صحابہؓ مدینہ کو کسی خاص سیاسی، معاشی یا تعلیمی مجبوری کی بنا پر ہی ترک کرتے تھے۔

ابن سعد محمد بن عمر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ہمارے علم کی حد تک کسی بدوی مہاجر صحابی نے آنحضورؐ کی وفات کے بعد مدینہ کو چھوڑ کر مکّہ کی سکونت اختیار نہیں کی تھی۔ ماسوا ابو سبرہؓ صحابی کے۔ ابو سبرہؓ سرور کائنات کی وفات کے بعد مکّہ میں آ کر بس گئے تھے۔ جسے مسلمانوں نے ناپسند کیا تھا۔ ان کے بچے تک ان پر معترض ہوتے تھے کہ انہوں نے ہجرت مدینہ کے بعد مکّہ کی سکونت کیوں اختیار کی؟ (طبقات ابن سعد)

مدینہ میں متعدد صحابہؓ ایسے تھے، جنہوں نے حدیث و فقہ میں بڑی شہرت حاصل کی۔ ان میں مندرجہ ذیل قابل ذکر تھے۔

ابو بکرؓ۔ عمرؓ، علیؓ (کوفہ سکونت اختیار کرنے سے قبل)۔ ابو ہریرہ۔ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ عبد اللہ بن عمرؓ۔ ابو سعید خدریؓ اور زید بن ثابتؓ۔ مؤخر الذکر کتاب و سنت سے احکام اخذ کرنے اور اجتہادِ صحیح میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ حضرت عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ

رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں قضاء و فتویٰ و قراءت و فرائض کے نگران رہے۔ اور ۴۵ھ میں امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

مذکورہ صدر صحابہ کرام کے آغوشِ علم و فضل میں جن تابعین نے تربیت پائی، ان میں سے مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

سعید بن المسیّب۔ عروہ بن زبیر۔ ابن شہاب زہری۔ عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود۔ سالم بن عبداللہ بن عمر۔ قاسم بن محمد بن ابی بکر۔ نافع مولیٰ ابن عمر اور دیگر حفاظِ حدیث جو اس عصر و عہد میں حدیث و فتویٰ کے مرجع و مرکز تھے۔

دار الحدیث مکہ مکرمہ: جب آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو فتح کیا تو قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور حلال و حرام کے مسائل سکھلانے کے لیے حضرت معاذ بن جبلؓ کو وہاں قیام کرنے کا حکم دیا۔ حضرت معاذؓ علم و حلم اور جُود و سخاوت کے اعتبار سے انصاری صحابہ میں ممتاز تھے۔ آپ تمام غزوات میں شرکت کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ اور صحابہ میں حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم شمار ہوتے تھے۔ حضرت معاذؓ سے ان کے بیٹے حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ نے روایت کی ہے۔ آگے چل کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ بصرہ سے لوٹ کر مکہ آ گئے تو وہاں کے دار الحدیث کے رئیس و زعیم قرار پائے۔ مکہ کو جو علمی شہرت حاصل ہوئی۔ وہ انہی کی مساعی جمیلہ کی ثمرہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جناب ابن عباس مخزن علم اور جلیل القدر حافظِ حدیث تھے۔ اس دَور میں مکہ میں اور بھی بہت سے صحابہؓ تھے، جن کا تذکرہ محدّث حاکم نے اپنی کتاب "معرفتہ علوم حدیث" میں کیا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن سائب مخزومی۔ عتّاب بن اسید۔ خالد بن اُسید۔ حکم بن ابی العاص۔ عثمان بن طلحہ وغیرہ۔

مکہ کے دار الحدیث میں عبداللہ بن عباسؓ کے زیر اثر جن تابعین نے استفادہ کیا، ان میں مشہور ترین حسب ذیل ہیں۔

مجاہد بن جبر۔ عکرمہ مولیٰ ابن عباس۔ عطا بن ابی رباح و دیگر تابعین۔

حدیث نبوی کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں مکہ و مدینہ کو جو امتیاز جملہ بلادِ اسلامیہ کے مقابلہ میں تا عصرِ حاضر حاصل رہا ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ ہر سال ایک بین الاقوامی اجتماع انہی دو شہروں منعقد ہوتا ہے اور مسلمان دور دراز کا سفر طے کر کے یہاں حاضر ہوتے ہیں۔ اس عظیم اجتماع کے جو اثرات علوم و معارف کی اشاعت پر مترتب ہوتے ہیں۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ عصرِ صحابہ میں لوگ اس موقع پر ایک دوسرے سے ملتے اور احادیث کی نقد و جرح پر بحث و تمحیص کیا کرتے تھے۔ اس طرح انہیں احادیث اور ان کے رواۃ و رجال کا پورا علم حاصل ہو جایا کرتا تھا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حج ایک عظیم ترین رابطہ ہے جس نے مختلف بلادِ اسلامیہ کی علمی زندگی کو ان دو شہروں کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔ مگر اس سے جملہ اکنافِ ارضی کی علمی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے بکثرت صحابہ دعوت و ارشاد کی خاطر اطرافِ عالم میں پھیل گئے۔

دار الحدیث کوفہ: کوفہ ان دنوں اسلامی افواج کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فتوحات کے دَور میں بکثرت صحابہ وہاں جا بسے اور وہیں دفن ہوئے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت علیؓ۔ عبداللہ بن مسعودؓ۔ سعد بن ابی وقاصؓ۔ سعید بن زید۔ خباب بن ارتؓ۔ سلمان فارسی۔ حذیفہ بن یمانؓ۔ عمار بن یاسرؓ۔ ابو موسیٰ اشعریؓ۔ براء بن عازب۔ مغیرہ بن شعبہؓ۔ نعمان بن بشیرؓ۔ ابو الطفیلؓ۔ ابو جحیفہ وغیرہم رضی اللہ عنہم (علوم الحدیث للحاکم)

کوفہ کے دار الحدیث کی قیادت و سیادت کا سہرا حضرت ابن مسعود کے سر ہے۔ اس لیے کہ ساکنانِ کوفہ میں وہ کثیر العلم تھے۔ اور ان کا زمانۂ قیام بھی دوسرے صحابہ کی نسبت طویل تھا۔ ان کے اصحاب و تلامذہ میں سے مندرجہ ذیل نے بڑی شہرت حاصل کی۔

۱۔ مسروق بن اجدع ہمدانی۔

۲۔ عبیدہ بن عمرو سلمانی۔ ان کے بارے میں شعبی کا بیان ہے کہ یہ قاضی شریح کے ہم پلہ تھے۔

۳۔ اسود بن یزید نخعی۔

۴۔ شریح بن حارث کندی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں ان کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا تھا اور حجاج ثقفی کے زمانہ تک یہ اس منصب پر فائز رہے۔ پھر اپنی موت سے ایک سال پہلے اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔

۵۔ ابراہیم بن یزید نخعی فقیہ العراق۔

۶۔ سعید بن جُبَیر۔

۷۔ عامر بن شراحیل شعبی علامۃ التابعین۔ یہ جلیل القدر حافظ حدیث تھے۔

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۰)

۴۔ دار الحدیث بصرہ: دار الحدیث بصرہ کے سرخیل حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہ بھی بصرہ میں سکونت گزیں تھے۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ یہ حضرت علیؓ کی جانب سے بصرہ کے والی تھے۔

۲۔ عتبہ بن غزوان۔

۳۔ عمران بن حُصَین۔

۴۔ ابو برزہ اسلمی۔

۵۔ مَعقِل بن یسار۔

۶۔ ابوبکرہ۔

۷۔ عبدالرحمٰن بن سَمُرہ

۸۔ عبداللہ بن شِخّیر۔

۹۔ جاریہ بن قدامہ و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (علوم الحدیث للحاکم ص ۱۹)۔

اس دار الحدیث کے فارغ التحصیل تابعین میں مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

ابو العالیہ رفیع بن مہران الریاحی۔ حسن بصری، جو پانچ صحابہ سے مل چکے تھے۔ محمد بن سیرین ابو الشعثاء بن جابر بن زید۔ قتادہ بن دعامہ۔ مطرف بن عبداللہ بن شخیر۔ ابو بردہ بن ابی موسیٰ و تابعین دیگر تابعین رحمہم اللہ۔

۵۔ دار الحدیث شام: جب مسلمانوں نے شام کے علاقہ کو فتح کیا تو بکثرت اہل شام حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ خلفائے راشدین نے سرزمین شام کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور بڑے بڑے فاضل صحابہ کو وہاں دعوت و تبلیغ کے لئے بھیجا۔ ان میں سے ایک معاذ بن جبلؓ تھے۔ حضرت معاذ کا علمی پایہ بڑا بلند تھا۔ رسول کریمؐ نے پہلے ان کو یمن بھیجا اور جب مکہ فتح ہوا تو لوگوں کو حلال و حرام کی تعلیم دینے کے لیے وہاں مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو دینی تعلیم دینے کے لیے ان کو ملک شام روانہ کیا۔

ابن سعد طبقات میں ابو مسلم خولانی سے روایت کرتے ہیں کہ جب میں حمص کی مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہاں ادھیڑ عمر کے تیس صحابہ موجود ہیں۔ اور ان میں سیاہ آنکھوں اور چمکتے ہوئے دانتوں والا ایک حسین نوجوان بھی موجود ہے۔ یہ نوجوان چپ بیٹھا تھا اور بات چیت نہیں کرتا تھا۔ جب لوگوں کو کسی بات کا شبہ گزرتا تو اس کی جانب متوجہ ہو کر اس سے دریافت کرتے۔ میں نے اپنے ہم نشین سے پوچھا یہ کون ہے؟ اس نے کہا یہ معاذ بن جبلؓ ہیں۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب معاذ بن جبلؓ شام جانے لگے تو مدینہ میں ان کی وجہ سے بڑا خلا محسوس کیا جانے لگا۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کو دینی احکام و فتاویٰ بتایا کرتے تھے۔ میں نے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں عرض کی کہ لوگوں کی ضروریات کے پیش نظر ان کو روک لینا چاہیے۔ مگر انہوں نے انکار کیا کہنے لگے، ایک شخص شہادت کی نیت سے جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ بھلا میں اسے کیسے روک سکتا ہوں؟ میں نے عرض کی، بخدا اس شخص کو تو بستر

پر لیٹے لیٹے شہادت کا اجر مل سکتا ہے۔ (طبقات)

ملک شام میں جن لوگوں نے تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں قابل خدمات انجام دیں۔ ان میں سے ایک حضرت عبادہ بن صامتؓ بھی تھے۔ حضرت عبادہ نے قرآن کی جمع و تدوین کے سلسلہ میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ دینی امور میں بڑے سمجھ دار اور ذوفہم واقع ہوئے تھے۔ حق و صداقت کے اظہار و اعلان میں بڑے بے باک تھے۔ اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آپ نے امیر معاویہؓ کو کئی باتوں پر ٹوکا تھا۔ ملک شام میں تبلیغی خدمات انجام دینے والے دوسرے صحابی حضرت ابو الدرداءؓ انصاری تھے۔ یہ حفاظِ حدیث اور فقہاء صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عبادہ بن صامت اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کو حضرت معاذ کی رفاقت میں یزید بن ابو سفیان کے طلب کرنے پر ملک شام بھیجا تھا۔ یزید نے جناب فاروق کو بلا بھیجا تھا کہ اہل شام کو دینی معلمین کی ضرورت ہے۔ اس لیے آپ ان تینوں صحابہ کو شام بھیج دیں۔ (تاریخ بخاری)

مذکورہ صدر ہر سہ صحابہ دیار شام میں حدیث نبوی کی نشر و اشاعت کرنے کے سلسلہ میں سنگِ میل ثابت ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن غنم کو بھی اسی مقصد کے لیے شام بھیجا تھا۔ چونکہ عبدالرحمٰن زیادہ تر حضرت معاذؓ کی صحبت میں رہتے تھے۔ اس لیے صاحبِ معاذ کہلاتے تھے۔ سابق الذکر صحابہ کے علاوہ کچھ اور بزرگ بھی تھے۔ جنہوں نے سرزمین شام میں دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دیئے۔ مثلاً حضرت شُرَحْبِیل بن حسنہؓ اور حضرت فضل بن عباس، جو بقول امام حاکم اردن میں مدفون ہیں۔ نیز ابو مالک اشعری و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم۔

سابق الذکر صحابہ کی تعلیم و تربیت سے بکثرت تابعین دیار شام میں مستفید ہوئے۔ جن میں مندرجہ ذیل ہیں۔

ابو ادریس خولانی، قبیصہ بن ذُویب۔ مکحول بن ابی مسلم۔ رجا بن حَیوہ کندی۔ یہ بڑے ثقہ اور فاضل تھے۔

۶۔ دار الحدیث مصر: جب مسلمانوں نے سرزمین مصر کو فتح کیا تو وہاں کے اکثر باشندے مشرف باسلام ہو گئے۔ اسلامی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں بکثرت صحابہؓ نے دیار مصر کو اپنے قدم میمنت لزوم سے نوازا۔ ان میں مشہور تر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے۔ جو احادیث کی کثرت روایت میں تمام صحابہ میں ممتاز تھے۔ جب امیر معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو شام کا والی بنایا تو ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بھی ہمراہ گئے۔ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے وفات پائی تو ان کے بیٹے حضرت عبداللہ مصر ہی میں مقیم رہے۔ حج و عمرہ کے لیے مکہ جاتے اور پھر واپس مصر لوٹ آتے حتیٰ کہ ایک قول کے مطابق مصر ہی میں وفات پائی۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے علاوہ بکثرت صحابہ مصر میں بس گئے اور لوگوں کو دینی احکام کی تعلیم دیتے رہے۔ ان میں مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

عقبہ بن عامر الجُہنی۔ خارجہ بن حذافہ۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔ محمیہ بن جزء۔ عبداللہ بن حارث بن جزء۔ ابو بصرہ غفاری۔ ابوسعد الخیر۔ معاذ بن انس الجُہنی وغیرہم۔

محمد بن ربیع الجیزی نے ایک مستقل کتاب ان صحابہ کے ذکر میں لکھی ہے۔ جو مصر میں سکونت گزیں ہوئے تھے۔ ان کی تعداد اس نے ایک سو چالیس سے کچھ اوپر تحریر کی ہے۔ اس تالیف میں اس نے ان صحابہ کی مرویات بھی درج کی ہیں۔

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۱ و علوم الحدیث للحاکم ص ۱۹۳)

سابق الذکر صحابہ کے فیض تربیت سے تابعین کی ایک جماعت مستفید ہوئی۔ جن میں اہم مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ابوالخیر مرثد بن عبداللہ الیزنی مفتی اہل مصر۔ یہ ابوایوب انصاری ابو بصرہ غفاری اور عقبہ بن عامر جُہنی سے روایت کرتے ہیں۔

۲۔ یزید بن ابی حبیب۔ یہ بعض صحابہ سے حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ لیکن ان کی

اکثر و بیشتر روایات تابعین سے منقول ہیں۔ یہ در اصل بربری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد دنقلہ نامی شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ مگر یزید بن ابی حبیب مصر میں پیدا ہوئے۔

زیر تبصرہ عصر و عہد میں جو مدارس اور دار الحدیث مختلف بلادِ اسلامیہ میں پائے جاتے تھے، یہ ان کا مختصر بیان ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ و تابعین نے حدیث نبوی کی نقل و روایت اور اشاعت میں کس مستعدی اور جانفشانی سے کام لیا تھا۔

طلبِ حدیث میں علما کے سفر

حفظِ حدیث کے سلسلہ میں صحابہ میں فرقِ مراتب: آپ دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی فتوحات کا دائرہ کس قدر پھیلا اور اس کے زیرِ اثر صحابہ مختلف بلاد و دیار میں بکھر کر دین اسلام اور احادیث نبویہ کی نشر واشاعت کرنے لگے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ صحابہ احادیث کے حفظ و تالیف میں یکساں نہ تھے۔ بلکہ اس ضمن میں مختلف الدرجات تھے۔ مثلاً بعض صحابہ ایسے تھے جن کو صرف ایک حدیث یاد تھی۔ بعض کو دو یا اس سے کم وبیش۔ بعض لوگوں کی موجودگی میں حضورؐ نے ایسی حدیث سنائی جو دوسروں کے سامنے بیان نہ فرمائی۔ بعض لوگ ایسے سانحہ میں مبتلا ہوئے جو دوسروں کو پیش نہ آیا۔ اس لیے مشہور تابعی مسروقؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرات صحابہؓ کا شرفِ ہم نشینی حاصل ہے۔ میں نے انہیں ایک چشمہ کی طرح پایا۔ بعض چشمے ایسے ہوتے ہیں جن سے ایک ہی آدمی سیر ہو سکتا ہے۔ بعض سے دو اور بعض سے دس۔ بعض چشمے ایک صد اشخاص تک کو سیر کر سکتے ہیں۔ اور بعض اس سے بھی بڑھ کر اتنے وسیع ہوتے ہیں۔ کہ اگر تمام رُوئے زمین کے باشندے اس پر اپنی پیاس بجھانے کے لیے اُتر پڑیں تو ان سب کو سیر کر دیں۔

ذرا غور فرمائیے جب صحابہؓ کی حالت یہ تھی جو بیان ہوئی تو ان کے اطرافِ ارضی میں بکھر جانے کا کیا نتیجہ ہوا ہوگا؟ یہی نا کہ ان کے ادھر اُدھر پھیل جانے سے احادیث نبویہ بھی مختلف دیار و بلاد میں بکھر گئیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن عزیز اور دینی احکام کے فہم وادراک کے لیے احادیث ازبس ناگزیر تھیں۔ بلاشبہ عثمانی خلافت میں قرآن کریم جمع ہو گیا تھا اور اس کے نسخے اطرافِ ملک میں پھیل گئے تھے۔ مسلمانوں نے اسے حفظ کر لیا تھا اور اس میں

کسی اختلاف کی گنجائش نہ تھی۔ مگر سُنت جو تفسیرِ قرآن کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی کیفیت ایسی نہ تھی۔ چنانچہ نہ تو اس کی کتابت عہدِ رسالت ہی میں عمل میں آئی اور نہ ہی خلافتِ راشدہ کے دوران پہلی صدی ہجری کے اختتام تک متعدد وجوہ و اسباب کے پیش نظر اس ضمن میں کوئی اہم قدم اُٹھایا جا سکا۔

طلب حدیث کے لیے سفر کی ضرورت: جب صورتِ حال یہ تھی تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مختلف بلاد کے لوگوں کو نئے نئے حوادث و مسائل پیش آتے تھے تو وہ کیا کرتے؟ ایسے میں ان کے سامنے صرف ایک ہی دروازہ کھلا تھا۔ جسے وہ کھٹکھٹا سکتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کے کھٹکھٹانے میں انہیں کتنی بھی مالی و جانی قربانیاں دینی پڑیں — وہ دروازہ طلب علم کے لیے رحلت کرنا تھا — اس میں شبہ نہیں کہ حضرات صحابہ، تابعین بلکہ اتباعِ تابعین نے اسی دروازہ پر دستک دی۔ انہوں نے طلب حدیث کی راہ میں سعی وجہد کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ شرق و غرب کو چھان مارا۔ اور حدیثوں کی تلاش میں ہر سرد و گرم کو چکھا اور آزمایا۔ صحابہ تابعین اتباعِ تابعین اور ان کے بعد آنے والے جن لوگوں نے احادیث کے کتبِ حدیث میں مدون ہونے تک خدماتِ جلیلہ انجام دی تھیں۔ ان کے سِیَر و سوانح کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سیرت نویس ایک راوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ فلاں بن فلاں مکی ثم مدنی ثم کوفی ثم بصری ثم شامی ثم مصری ہے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تاثر دینا ہوتا ہے کہ وہ راوی حدیث کی طلب و تلاش میں ہر جگہ کی خاک چھانتا رہا۔

حدیث کی چھان بین پر رحلت کے اثرات: اس میں شبہ نہیں کہ علماء کی خدمت میں حاضری دینے اور حُفّاظِ حدیث کے باہم ملنے جلنے سے عقلِ انسانی کو جلا اور علوم کی تنقیح و تہذیب اور

احادیث کی چھان پھٹک میں بڑی مدد ملتی ہے۔ طالب حدیث سفر کر کے ہی حدیث کے رُواۃ ورجال اور ان کی سیرت و کردار سے آگاہ ہو سکتا اور یہ جان سکتا ہے کہ آیا وہ قابل اعتماد راوی ہے یا ضعیف۔ مزید برآں سفر کرنے سے ایک طالب حدیث کے علم میں اضافہ ہوتا اور اس کے علم میں ایسی احادیث آتی ہیں جو اس کے ہم شہر علما کے یہاں موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت سے علماء کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ علم کی تلاش میں مارے مارے پھرتے اور ہر دشت کی گرد ان چھانتے رہے ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عصر حاضر میں اُمت اسلامیہ پر تغافل و تکاسل کا بھوت سوار رہے اور لوگ محنت و کاوش کی اس راہ سے ہٹ گئے ہیں جو ان کے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھی۔

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ جو صحابہ مدینہ سے دُور رہتے تھے، سوار ہو کر مدینہ جاتے اور آنحضورؐ سے علمی مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی صحابہ کا یہ معمول رہا کہ وہ طلب حدیث کے سلسلہ میں سفر کر کے ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ آگے چل کر جب اسلامی فتوحات کا دائرہ پھیلا اور صحابہ ادھر اُدھر منتشر ہو گئے تو حدیث کے طلب گار صحابہ و تابعین میں علمی رحلت کا بڑا چرچا ہُوا۔ اور یہ لوگ طلب علم کی خاطر عام طور سے سفر کرنے لگے۔ اس ضمن میں ہم صحابہ و تابعین کے چند واقعات بیان کریں گے۔ تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ ہمارے اسلاف نے حدیث کی جمع و تدوین کے سلسلہ میں کس قدر نمایاں خدمات انجام دی تھیں اور وہ سنّتِ رسولؐ کے کس حد تک شیفتہ و فریفتہ تھے۔

۱۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ایک حدیث سننے کی خاطر مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر حضرت عقبہ کی خدمت میں مصر حاضر ہوئے۔ جب امیر مصر مسلمہ بن مخلد انصاری کے گھر پہنچے تو بڑے تپاک سے ملے۔ معانقہ کیا اور زحمت فرمائی کی وجہ پوچھی۔ فرمانے لگے۔ "میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سُنی تھی۔ آج رُوئے زمین پر میرے اور

عقبہ کے سوا دوسرا کوئی شخص موجود نہیں۔ جس نے یہ حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ آپ میرے ساتھ کسی ایسے شخص کو بھیجیں جو مجھے عقبہ کے گھر تک پہنچا دے۔ جب عقبہ کے گھر پہنچے تو انہوں نے گھر سے نکل کر معانقہ کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ حضرت ابوایوبؓ نے سبب بیان کیا۔ عقبہؓ کہنے لگے میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "جس شخص نے مومن کے کسی عیب کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔" ابوایوبؓ کہنے لگے "آپ نے بجا فرمایا۔" پھر ابوایوبؓ اپنی ناقہ پر سوار ہو کر مدینہ لوٹ آئے۔ اور اس کا کجاوہ بھی نہ کھول پائے۔ اور جب امیر مسلمہ بن مخلد کا بھیجا ہوا قافلہ ان کی تلاش میں نکلا تو وہ عریش مصر کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔

ذرا غور فرمائیے کہ اصحابِ رسولؐ کی نگاہ میں دنیوی ساز و سامان کس قدر بے وقعت اور تحفظِ حدیث کی راہ میں آلام و مصائب کا برداشت کرتے چلے جانا کس قدر آسان تھا چنانچہ وہ حدیث نبوی کی طلب و تلاش میں اپنی ہر راحت کو تج دیتے اور بڑے بڑے جنگلوں اور صحراؤں کو عبور کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ جناب ابوایوبؓ مدینہ سے مصر تک کا طویل اور دشوار گزار راستہ اختیار کرتے اور جب مقصد پورا ہو جاتا ہے اسی وقت لوٹ آتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں سوچتے ہیں، کہ ایک دو دن مصر میں ٹھہر کر آرام کر لیں۔

۲۔ عمرو بن ابی سلمہ نے ایک مرتبہ امام اوزاعیؒ سے کہا "میں چار روز سے آپ کی صحبت میں ہوں اور ابھی تک آپ سے صرف تیس احادیث سن سکا ہوں۔" امام اوزاعیؒ نے فرمایا۔ کیا چار روز میں تیس احادیث آپ کے نزدیک کم ہیں؟ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے صرف ایک حدیث کی خاطر ایک ناقہ خرید کر اور اس پر سوار ہو کر مصر میں حضرت عقبہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر مدینہ لوٹے۔ اور آپ چار دن میں تیس احادیث کو کچھ اہمیت ہی نہیں دے رہے۔

اندازہ لگائیے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا شمار کثیر الروایت صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ تاہم انہیں ایک حدیث سے ناآشنائی گوارا نہیں۔ چنانچہ وہ مدینہ سے مصر تک کا دُور دراز سفر اختیار کرتے اور اس مقصد کے لیے ایک ناقہ بھی خریدتے ہیں۔ یہ واقعہ اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ صحابہ میں خدمتِ دین کا جذبہ کس حد تک تھا اور وہ احادیث کی جمع و تالیف کی خاطر کس قدر مصائب گوارا کرتے تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ حدیث کے اخذ و روایت کے شرف سے محروم نہ رہیں۔

۳۔ مشہور تابعی حضرت سعید بن المسیبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں ایک حدیث کی خاطر کئی کئی دنوں اور راتوں کا سفر طے کیا کرتا تھا۔ ایسے تمام آثار کے لیے ملاحظہ فرمائیے معرفت علوم الحدیث للحاکم ص ۷ - ۸۔

۴۔ صالح ہمدانی شعبی سے، وہ ابو بردہ سے اور ابو بُردہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص کی ملکیت کوئی لونڈی ہو اور وہ اچھی طرح سے اسے تعلیم و تربیت دے کر آزاد کرے اور پھر اس کو اپنے نکاح میں لے آئے۔ تو اس کو دو اَجر ملیں گے۔ اور اہل کتاب میں سے جو شخص پہلے اپنے نبی پر ایمان لائے اور پھر مجھ پر تو اسے دو اَجر ملیں گے۔ جو غلام اپنے آقا اور اپنے رب دونوں کے حقوق سے عہدہ برا ہو۔ اس کو دو اجر ملیں گے۔" امام شعبی جب یہ حدیث بیان کرکے فارغ ہوئے تو اپنے شاگرد کو مخاطب کرکے فرمایا۔

"اس حدیث کو مفت میں لے لو۔ کبھی وہ زمانہ تھا جب ایک شخص صرف ایک حدیث کی خاطر عازمِ مدینہ ہوا کرتا تھا۔"

امام شعبی جیسے جلیل القدر تابعی کے یہ الفاظ اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں، کہ علماء صحابہ و تابعین ایک چھوٹی سی حدیث کو سیکھنے کے لئے مدینہ کا طویل سفر اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کیا کرتے تھے۔

۵۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک صحابی کے پاس مجھے ایک حدیث کا پتہ چلا۔ چنانچہ میں نے ایک اُونٹ خرید کر اس پر کجاوا کسا اور ایک مہینہ بھر چل کر ملک شام پہنچا۔ میں نے حضرت عبداللہ بن انیس کے گھر پہنچ کر پیغام بھجوایا کہ جابر دروازے پر کھڑا آپ کا منتظر ہے۔ اتنے میں عبداللہ بن انیس گھر سے نکل کر مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ میں نے کہا "مجھے انسانی حقوق سے متعلق ایک حدیث کے بارے میں پتہ چلا ہے کہ وہ آپ کو یاد ہے مگر میں نے حضورؐ سے وہ حدیث نہیں سُنی۔ اس لیے حاضر ہوا ہوں۔ پھر عبداللہ بن انیسؓ نے وہ حدیث بیان کی۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں "مجھے کسی صحابی کے بارے میں پتہ چلتا کہ انہیں نبی اکرمؐ کی کوئی حدیث یاد ہے۔ اگر میں چاہتا تو یوں بھی کر سکتا تھا کہ انہیں پیغام بھجوا کر بلا لیتا۔ مگر میں بذاتِ خود ان کے درِ دولت پر حاضر ہوتا اور دروازہ پر پڑ کر سو رہتا حتیٰ کہ وہ گھر سے باہر آ کر مجھے حدیث سناتے۔" (جامع بیان العلم لابن البرؒ)

۷۔ بُسر بن عبداللہ حضرمی فرماتے ہیں "میں صرف ایک حدیث کی تلاش میں دُور دراز کا سفر کرتا اور جا کر وہ حدیث سنتا۔" (جامع بیان العلم)

حافظ ابن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک باب "ذکر الرحلۃ فی طلب العلم" کے عنوان سے باندھا ہے جس میں اس قسم کے متعدد واقعات ذکر کیے ہیں۔ خطیب بغدادی نے ابوالعالیہ کا یہ قول کیا ہے کہ

"ہم اصحابِ رسول سے بالواسطہ احادیث سُنا کرتے تھے۔ ہمیں یہ بات پسند نہ آئی اور ہم نے خود ان کی خدمت میں حاضری دے کر حدیثیں سُنیں۔"

مندرجہ صدر واقعات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ علماء حدیث نبوی کی صیانت و حفاظت کا فریضہ اسی طرح ادا کرتے رہے۔ وہ باہم ایک دوسرے سے ملاقات کرتے اور حدیث رسولؐ کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ

فروگزاشت نہ کرتے۔ انھوں نے بعد میں آنے والے محدثین کے لیے ایک راہ ہموار کردی۔ جس پر وہ آگے چل کر رواں دواں رہے۔ حدیث نبوی کے عصرِ تدوین میں علمی رحلت کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ جو شخص صرف اپنے شہر میں مقیم رہ کر حدیثیں لکھا کرتا اور حدیث کی طلب وتلاش میں زحمتِ سفر گوارا نہ کرتا تھا، اس کو جادۂ رشد وہدایت سے برگشتہ تصور کیا جاتا تھا۔ مشہور محدث یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔ چار آدمی ہیں جن سے رُشد وخیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۱۔ وہ شخص جو کسی درّہ پر محافظ مقرر ہو۔

۲۔ جج اور منصف کا دربان۔

۳۔ محدث کا بیٹا۔

۴۔ وہ شخص جو گھر پہ مقیم رہ کر حدیثیں لکھتا ہو اور طلب علم کی خاطر سفر نہ کرتا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے "طالب علم کے جوتے لوہے سے بنے ہوئے ہونے چاہئیں"۔ (تاکہ وہ عام طور سے سفر کرسکے اور جوتا ٹوٹنے کا ڈر نہ ہو)۔

ذرا غور فرمائیے! یہ اس زمانے کی بات ہے جب ذرائع مواصلات کا فقدان تھا۔ نہ پختہ سڑکیں تھیں نہ موٹریں نہ طیارے۔ گھوڑوں اور اونٹوں سے سواری کا کام لیا جاتا تھا۔ خطرناک صحراؤں سے گزرنا پڑتا تھا۔ راستہ میں کہیں سنگلاخ زمین سے گزرنا پڑتا، کہیں میدانی علاقہ، کہیں پہاڑ اور بڑے بڑے ٹیلے۔ شیروں، بھیڑیوں اور درندوں کی کمی نہ تھی۔ کبھی صحرا کی گرمی انہیں جھلس کر رکھ دیتی اور گاہے سردی کے مارے ٹھٹھرنے لگتے راتوں کی تاریکی میں سفر کرتے، جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ مگر یہ تمام آلام وحوادث ان کی نگاہ میں ہیچ تھے۔ اور ان میں سے کوئی چیز بھی ان کو حدیثِ رسول کی جمع وتالیف سے باز نہ رکھ سکی۔ فجزاہم اللہ عن المسلمین خیر الجزاء۔

روایتِ حدیث کی اشاعت اور تعدّدِ طُرق پر رحلت کے اثرات: صحابہؓ اہل علم

مختلف اسلامی بلاد و دیار میں پھیل کر حدیث نبوی کی نقل و روایت کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ چونکہ حفظِ حدیث میں سب صحابہ یکساں نہ تھے۔ اس لیے اس دَور میں علمی رحلت کا بڑا چرچا ہوا اور علما جمع و تالیف حدیث کی خاطر ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانے لگے۔ اسلامی فتوحات کے دائرہ میں وسعت آئی، تو اس کے نتیجہ میں حوادث و مسائل میں بھی اضافہ ہوا۔ چنانچہ اہل علم صحابہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے احکام و فتاوی کی نشر و تشہیر شروع کر دی۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف بلاد و امصار کے علماء ایک دوسرے سے حدیثیں روایت کرنے لگے۔

مثلاً قبل ازیں ایک مصری راوی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور صرف ان لوگوں سے حدیثیں روایت کرتا تھا جو سرزمین مصر میں بس گئے تھے۔ مگر اب مصری محدثین حضرت معاذ بن جبلؓ، ابوالدرداءؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابن عباسؓ و جابر بن عبداللہ اور عبداللہ بن عمر و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے حدیثیں روایت کرنے لگے۔ اس لیے کہ یہ تمام صحابہ مصر تشریف لے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ قبل ازیں حدیث کا راوی صرف ایک ہی سند سے حدیث روایت کیا کرتا تھا۔ اب متعدد طُرق سے روایتِ حدیث اور احکام و قضایا اور عبادات و معاملات کی نقل و روایت کا چرچا ہونے لگا اس کی وجہ وجیہہ علمائے حدیث کے وہ طویل سفر تھے، جو طلب حدیث کی خاطر انہوں طے کیے۔ اس کی حدّ یہ ہے کہ رسول کریمؐ کا ایک صحابی مدینہ سے جو مہبطِ وحی اور حدیث رسول کا ملجا و مرکز تھا، چل کر صرف ایک حدیث کی خاطر مصر پہنچتا ہے۔ یہ حدیث ان کے رفیق کار نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔

حدیث میں دروغ گوئی کا آغاز:

یہ ایک نیک فال تھا کہ اس دَور میں مختلف اسلامی بلاد و دیار میں روایت حدیث کا بڑا چرچا ہُوا۔ اس امر کے مفید ہونے میں بھی شبہ نہیں کہ تابعین بڑے ذوق شوق کے ساتھ صحابہ سے حدیثیں اخذ کرتے رہے۔ یہ بات بھی کچھ کم مسرت انگیز نہیں کہ مسلمان احادیث نبویہ کی روشنی میں اپنے دینی و دنیوی امور سرانجام دیتے رہے۔ مگر مت بھولیے کہ اعدائے دین ہمیشہ گھات میں بیٹھ کر اسلام کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہے ہیں۔ جب خلیفۂ ثالث کی شہادت اور مسلمانوں کے شیعہ وخوارج اور جمہور اہل اسلام میں بٹ جانے سے اسلام میں عظیم فتنہ نمودار ہُوا تو دشمنانِ اسلام اہل ایران کو ایک اوٹ نظر آئی جس کے پیچھے بیٹھ کر وہ پسِ پردہ دین اسلام کے مٹانے کے لیے کام کر سکتے تھے۔ وہ اوٹ یہ تھی کہ جھوٹی حدیثیں وضع کریں اور مسلمانوں میں پھیلا دیں جب روایتِ حدیث کا چرچا ہُوا اور اس کے دائرہ میں وسعت آئی تو ان فریب کاروں کو اپنے زہریلے خیالات پھیلانے اور جھوٹی احادیث کو مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے بڑی سازگار فضا میسّر آئی۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم خلافت راشدہ میں مدینہ منوّرہ کو کسی ناگزیر ضرورت کے بغیر ترک نہیں کرتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت لڑائیوں میں صَرف ہوتا تھا۔ اس دَور میں صرف ایک مدینہ ہی دارالحدیث تھا۔ حدیث کی کوئی دوسری درس گاہ نہ تھی۔ جناب صدیقؓ وفاروقؓ نے کمال حزم و احتیاط سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو حدیثیں کم روایت کرنے کا حکم دیا تھا۔ مبادا کثرتِ روایت کو جاہل لوگ جھوٹ کا ذریعہ بنالیں اور اس طرح مسلمانوں میں شر وفساد کی تخم ریزی کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ تجربہ بڑی حد تک کامیاب رہا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حدیث نبوی کو کذّاب لوگوں کے شر سے بچالیا۔

جب خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا۔ اور مسلمانوں میں انتشار و خلفشار کا ظہور ہوا، تو دوسرے مذاہب کے ان کذاب اور منافق لوگوں نے سر اُٹھانا شروع ہوا۔ ان لوگوں نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا مگر ایمان ان کے گلے سے نیچے نہیں اُتر پایا تھا۔ ان کا کچھ حال ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ جب اسلامی بلاد و دیار میں حدیث نبوی کی نقل و روایت کا چرچا ہوا تو دوسرے مذاہب کے یہ دجال رونما ہو کر کمال بے حیائی اور ڈھیٹ پن کے ساتھ صحابہؓ پر دروغ بافی کرنے لگے۔ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ صحابہؓ نے فلاں حدیث روایت کی ہے۔ حالانکہ نہ انھوں نے صحابہ کو دیکھا اور نہ ان سے حدیثیں سنیں۔

ان جھوٹے لوگوں نے ایسے ایسے سیاہ کارنامے انجام دیئے۔ جن کی نہ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی تھی اور نہ رسول کریم ﷺ نے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ جابر بن یزید بن حارث جعفی ابو عبداللہ کوفی شیعہ ہے۔ اس کی وفات ۱۲۷ھ میں ہوئی۔ یہ کہا کرتا تھا میرے پاس پچاس ہزار احادیث ہیں۔ جن میں سے میں نے ابھی تک کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ اس کے بارے میں سفیان کہتے ہیں کہ میں نے جابر کو تیس ہزار ایسی حدیثیں بیان کرتے سنا، جن میں سے میں کسی روایت کے ذکر کرنے کو بھی حلال نہیں سمجھتا۔ خواہ مجھے کتنی بڑی رقم کیوں نہ دی جائے۔ حمیدی سفیان سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک شخص سے سنا کہ وہ جابر سے اس آیت کی تفسیر دریافت کر رہا تھا۔

لَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِىْٓ اَبِىْٓ۔ (سورہ یوسف) — (میں اسی جگہ رہوں گا یہاں تک کہ میرا باپ مجھے اجازت دے۔

جابر نے کہا ابھی اس آیت کی تفسیر ظاہر نہیں ہوئی۔ سفیان نے کہا کہ جابر نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ ہم نے پوچھا، آخر جابر کا مطلب کیا تھا؟ سفیان نے کہا

شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ ابھی تک بادلوں میں ہیں۔ لہذا جو لوگ حضرت علیؓ کی اولاد میں سے امامت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہم ان کی امداد کے لیے اس وقت تک نہیں نکلیں گے، جب تک حضرت علیؓ آسمان سے پکاریں نہیں کہ فلاں شخص کی امداد کے لیے نکل پڑو۔ جابر کے نزدیک آیت کی تفسیر یہ ہے۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے۔ دراصل آیت کا تعلق برادرانِ یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہے۔

۲۔ ہمام کا بیان ہے کہ ابوداؤد نابینا ہمارے پاس آکر کہنے لگا کہ مجھے براء بن عازبؓ نے حدیث سنائی۔ مجھے زیدؓ بن ارقم نے حدیث سنائی۔ ہم نے جب قتادہ سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے ابوداؤد جھوٹ کہتا ہے۔ اس نے ان صحابہؓ سے حدیثیں نہیں سنیں۔ وہ تو ۶۳ھ میں طاعونِ جارف کے زمانہ میں گداگر تھا۔ اور لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔ ہمام کہتے ہیں کہ ابوداؤد نابینا قتادہ کے پاس آیا۔ جب اُٹھ کر چلا گیا تو لوگوں نے کہا اس کا دعویٰ ہے کہ وہ اٹھارہ بدری صحابہ سے مل چکا ہے۔ قتادہ کہنے لگے یہ طاعونِ جارف سے پہلے گداگر تھا اور علم حدیث کے ساتھ اس کو کچھ سروکار نہ تھا۔ بخدا حسن بصری اور سعید بن المسیب جیسے تابعین نے بھی بدری صحابہؓ سے براہِ راست سن کر ہمیں کوئی حدیث نہیں سنائی۔ البتہ سعد بن ابی وقاصؓ سے ضرور ملے تھے۔

ذرا غور فرمائیے کہ اس اندھے کا یہ دعویٰ کس قدر حیرت ناک ہے کہ وہ اٹھارہ بدری صحابہ سے مل چکا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور سعید بن المسیب دونوں عمر میں اس سے بڑے تھے۔ حدیث نبوی کے ساتھ انہیں لگاؤ بھی زیادہ تھا۔ اور اجتہاداتِ صحابہؓ کے بھی وہ بڑھ کر عالم تھے۔ مگر ان دونوں میں سے کسی نے بھی کسی ایک بدری صحابیؓ سے حدیث روایت کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر ابوداؤد نابینا کا یہ دعویٰ کیونکر حق بجانب ہے کہ وہ اٹھارہ بدری صحابہ سے مل چکا ہے۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔

۳۔ مگر صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم نے واضعین کے سب راستے بند کر دیئے اور ان

کے لیے کوئی راستہ بھی کھلا نہ چھوڑا۔ چنانچہ امام شعبی جب مشہور کذاب حارث اعور کا ذکر کرتے تو کہا کرتے تھے کہ وہ "کذاب" ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو جب حضرت علیؓ کے چند فیصلے دکھائی دیئے جو ایک تھیلہ میں رکھے گئے تھے۔ تو آپ نے انہیں مٹا دیا اور صرف چند فیصلے باقی رہنے دیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ نے حضرت علیؓ کے علم میں آمیزش کر کے اس کو بگاڑ دیا ہے۔

اسی طرح بشیر بن کعب نے حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر چند حدیثیں سنائیں۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ فلاں فلاں حدیث کا اعادہ کیجئے۔ اس نے اعادہ کر دیا اور پھر حدیثیں سنانے لگا۔ ابن عباسؓ نے پھر کہا "فلاں فلاں حدیث دہرائیے۔ اس نے تعمیل ارشاد کر دی۔ بشیر بن کعب نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ آیا آپ نے میری روایت کردہ سب احادیث کو صحیح قرار دیا۔ بجز ان روایات کے جن کو دُہرانے کا حکم دیا؟ یا سب احادیث کو مجروح سمجھا اور صرف اُن احادیث کو صحیح ٹھہرایا جن کے اعادہ کا حکم دیا؟

یہ سن کر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "ہم حدیثیں اس وقت روایت کیا کرتے تھے۔ جب لوگ حدیثِ رسولؐ میں جھوٹ کی آمیزش نہیں کیا کرتے تھے۔ اور جب ہر کس و ناکس نے اس پیشہ کو اختیار کر لیا تو ہم نے یہ مشغلہ ترک کر دیا۔

مجاہد بیان کرتے ہیں کہ بشیر العدوی حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں بیان کرنے اور کہنے لگا رسول کریمؐ نے یوں فرمایا اور رسول کریمؐ نے اس طرح فرمایا۔ مگر ابن عباسؓ نہ اس کی حدیثیں سنتے اور نہ اس کی طرف توجہ مبذول کرتے تھے۔ وہ کہنے لگا، ابن عباسؓ! کیا بات ہے کہ میں آپ کو حدیثیں سنا رہا ہوں اور آپ ہیں کہ توجہ ہی نہیں دیتے ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا "ایک زمانہ تھا کہ جب کوئی شخص حدیثیں روایت کرتا تھا تو ہماری نگاہیں اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اور ہمہ تن گوش ہو کر ہم انہی کی

باتیں سنتے تھے۔ جب ہر کس وناکس نے یہ کام سنبھال لیا تو ہم انہی احادیث کو تسلیم کرنے لگے جن سے ہم آشنا تھے۔" (مقدمہ صحیح مسلم)

۴۔ خیال رہے کہ وضاعین کی ایک قسم حدیث نبوی کے لیے بڑی خطرناک ثابت ہوئی ہے اور وہ واعظ قسم کے لوگ ہیں جن کا کام منکر قسم کی روایات بیان کرنا ہے۔ وہ ایسی عجیب وغریب مگر بے اصل احادیث روایت کرتے ہیں کہ لوگ کلیجہ تھام کر رہ جاتے ہیں۔ دَورِ زیرِ تبصرہ بھی ایسے لوگوں کے وجودِ نامسعود سے خالی نہ تھا۔

امام شعبی (۲۱ھ تا ۱۰۴ھ) جلیل القدر تابعی اور پہلی صدی ہجری میں حدیث نبوی کے ستون تھے۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ خلیفہ عبدالملک بن مروان بیٹھا تھا اور اس کی مجلس میں رؤسائے شام موجود تھے۔ عبدالملک نے دریافت کیا، اس دَور میں عراق کا عظیم تر عالم کون ہے؟ حاضرین نے کہا ہمارے خیال میں عامر شعبی سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔

امام شعبی کہتے ہیں کہ عبدالملک نے مجھے خط لکھ کر بلایا۔ چنانچہ میں اس کی ملاقات کے لیے روانہ ہوا اور جمعہ کے روز مقام "تدمر" پہنچا۔ نماز کا وقت تھا مسجد میں حاضر ہوا۔ میرے پاس ہی ایک لمبی داڑھی والا شخص بیٹھا تھا۔ جس کو لوگوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ حدیث بیان کرنے لگا کہ مجھے فلاں آدمی نے نبی کریمؐ سے سُن کر یہ حدیث سنائی کہ "اللہ تعالیٰ نے دو صُور (سینگ کی مانند چیز، جس میں اسرافیل قیامت کے دن پھونکیں گے) پیدا کیے۔ ہر صُور میں دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ ایک دفعہ سب چیزوں کو بے ہوش کرنے کے لیے اور دوسری مرتبہ ان کو اُٹھانے کے لیے۔" شعبی کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر ضبط نہ کر سکا۔ چنانچہ میں نے جلدی نماز ختم کی اور کہا "اے شیخ! خدا سے ڈر اور غلط حدیث بیان نہ کر۔ اللہ تعالیٰ نے صرف ایک صُور پیدا کیا ہے۔ جس میں دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ ایک دفعہ بے ہوش کرنے کے لیے اور دوسری دفعہ اٹھانے کے لیے۔" شیخ

یہ سن کر کہنے لگا اے فاجر! میں فلاں شخص سے حدیث روایت کر رہا ہوں اور آپ مجھے جھٹلا رہے ہیں۔ پھر جوتا پکڑ کر مجھے پیٹنا شروع کر دیا، لوگ بھی اس کے ساتھ مل کر مجھے پیٹنے لگے۔ بخدا وہ اس وقت باز آئے جب حلف اٹھا کر میں نے کہا کہ خدا نے تیس صور پیدا کیے ہیں۔ اور ہر صور میں ایک نفخہ ہے۔ شعبی فرماتے ہیں کہ میں نے دمشق میں حاضر ہو کر عبدالملک کو سلام کہا۔ اس نے کہا شعبی! اپنے سفر کی کوئی عجیب ترین بات سنائیے میں نے ماجرا بیان کیا تو عبدالملک ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ ہو ہو گیا۔

(تحذیر الخواص للسیوطی ص ۵۱)

ذرا غور فرمائیے کہ اس دور میں رسول کریمؐ پر کذب بیانی کو کس قدر فروغ حاصل ہو چکا تھا اور عوام جھوٹی احادیث کو کتنے ذوق شوق کے ساتھ سنتے تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ جب کوئی ناصح ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تو اس کی توہین کرتے اور اسے پیٹتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں محدثین کا کام کس قدر کٹھن اور دشوار تھا۔ وعظ گو اور زنادقہ نے عوام کے ذوق کو بگاڑ کر خرافات کا عادی بنا دیا تھا۔ ہر زمانہ میں عوام کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ عجیب و غریب باتوں کو پسند کرتے اور افسانہ گو قسم کے لوگوں کی ہم نشینی اختیار کیا کرتے ہیں، خصوصاً جبکہ ان کی باتوں میں انوکھا پن پایا جاتا ہو۔ اور وہ عقل انسانی کے دائرہ سے باہر ہوں یا وہ دلوں کو نرم کرنے والی ہوں۔ اور ان کے سننے سے بے ساختہ انسان رونے پر مجبور ہو جاتا ہو۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ حضرت ابن عمرؓ ایک افسانہ گو شخص کو مسجد سے نکل جانے کا حکم دیتے ہیں مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ حضرت ابن عمرؓ پولیس کے سپاہی کو بلوا کر اس کو جبراً مسجد سے باہر نکال دیا۔

ہم آگے چل کر ایک خاص فصل میں بتائیں گے کہ وضع حدیث کا آغاز کیوں کر ہوا؟ اس کی تاریخ کیا ہے۔ اور علمائے وضاعین کے مقابلہ کے لیے کون سی مساعی جمیلہ انجام

دیں ۹ ہم کتاب کے خاتمہ پر "انواع الحدیث" کے ضمن میں اس پر تفصیلی گفتگو کریں گے.
اس لیے کہ وضعِ حدیث کا دَور زیر تبصرہ کے ساتھ کوئی خصوصی تعلق نہیں ہے. بلکہ یہ تمام
عصور وازمنہ کی مشترکہ پیداوار ہے۔ اس لیے اب اسی پر اکتفا کرتے ہیں.

کتابتِ حدیث

عربوں میں کتابت قبل از اسلام: کتابت شہریت کی علامت اور اجتماع و تمدن کے آثار میں سے ایک عظیم نشان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب اقوام نے ہمیشہ اس میں سبقت حاصل کی ہے اور ناشائستہ و غیر مہذب قومیں اس سے دُور رہی ہیں۔ چونکہ عرب فطری طور پر بدوی تھے۔ اس لیے نتیجۃً اُمّی تھے۔ اور لکھنے پڑھنے سے آگاہ و آشنا نہ تھے۔ بجز ان علاقوں کے، جہاں کے لوگ تہذیب و حضارت سے بہرہ ور تھے۔ مثلاً یمن وغیرہ۔ چنانچہ یمنی لوگ لکھنا جانتے تھے اور ان کے خط کو "خطِ مسند" کہتے ہیں۔ مگر کتابت وہاں عام طور سے شائع نہ تھی کہ سب لوگ اس سے آگاہ ہوں۔ بخلاف ازیں کتابت کا فن خواص تک محدود تھا۔

یمن سے منتقل ہو کر کتابت کا فن حیرہ اور انبار کے علاقوں تک پہنچا۔ اس لیے کہ یمن کے ان علاقوں کے ساتھ گہرے روابط استوار تھے۔ یہ لوگ اپنے علاقہ کے خط کو "خطِ جزم" کہتے تھے۔ کیونکہ وہ خطِ مسند حمیری سے اخذ کیا گیا تھا۔ حیرہ سے نقل مکانی کر کے یہ خط حرب بن اُمیہ کے ذریعے مکہ پہنچا۔ حرب بن اُمیہ ایک سیاح آدمی تھا۔ اس کے عہد سے مکہ میں کتابت کا آغاز ہوا۔ چنانچہ چند قریشی لوگ فن کتابت سے آشنا ہو گئے۔

قبل از اسلام یہ تین علاقے تھے جہاں جزوی طور پر کتابت کا رواج پایا جاتا تھا۔ یہ شہری عربوں کا حال تھا۔ جہاں تک بدوی عربوں کا تعلق ہے وہ نہ صرف کتابت بلکہ تمام شہری صنعتوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

تقدیرِ خداوندی سے قبل از اسلام کتابت کا حیرہ سے مکہ منتقل ہونا اس امر کا

پیش خیمہ ثابت ہُوا کہ یہ فن حفاظتِ کتاب وسنت کے عوامل میں سے ایک قوی ترین عامل ٹھہرا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتابت کا رواج عام نہ تھا بلکہ اس کا دائرہ صرف چند لوگوں تک محدود تھا۔ لہٰذا بحیثیت مجموعی امّتِ عربیہ کو ایک اُمّی قوم کہہ سکتے ہیں۔ جو لکھنے پڑھنے سے نابلد تھی۔ حتیٰ کہ جب اسلام آیا تو قرآن نے اس اُمّت کو اُمّی کہہ کر پکارا۔ قرآن میں فرمایا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ۔ (الجمعۃ)

خدا کی ذات وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا)۔

خدا کو یہی منظور تھا۔ کہ عربوں میں عام طور سے کتابت کا شائع نہ ہونا ان کے ملکۂ حفظ کو جلا دینے کا سبب بنا۔ چنانچہ عربوں نے اہم اشعار وانساب اور مفاخر وایام کے جمع کرنے میں صرف اپنی قوتِ حافظہ ہی پر اعتماد کیا۔ انسانی جسم کی یہ خصوصیت ہے کہ جس قوت کو زیادہ استعمال کیا جائے وہ بڑھتی اور نشو ونما پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی کوئی قوم تاہنوز قوتِ حافظہ میں عربوں کی حریف ثابت نہیں ہو سکی۔

ظہورِ اسلام کے وقت مکّہ میں کتابت: بہرکیف جب اسلام آیا تو مکّہ کے پورے شہر میں سترہ اشخاص کے سوا دوسرا کوئی شخص کتابت سے آشنا نہ تھا۔ ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔

عمر بن الخطابؓ۔ علی ابن ابی طالبؓ۔ عثمان بن عفانؓ۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ۔ طلحہؓ یزید بن ابی سفیان۔ معاویہ بن ابی سفیان۔ ابو سفیان بن حرب۔ ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ حاطب بن عمرو۔ ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی۔

مندرجہ ذیل خواتین بھی لکھنا جانتی تھیں۔

شفا بنت عبداللہ عدویہ۔ حفصہ بنت عمرؓ۔ ام کلثوم بنت عقبہ۔ کریمہ بنت مقداد۔

و دیگر خواتین۔

مدینہ میں کتابت بوقت ہجرت: اہل مدینہ میں سے اوس و خزرج کے قبیلوں میں کسی حد تک کتابت کا رواج پایا جاتا تھا۔ بعض یہودی عربی کتابت سے آگاہ تھے اور اپنے بچوں کو مدینہ میں لکھنا سکھایا کرتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اوس و خزرج کے کچھ لوگ لکھنا جانتے تھے۔ جن میں سے مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

سعد بن عبادہ۔ منذر بن عمرو۔ اُبی بن کعب۔ زید بن ثابت۔ رافع بن مالک اُسید بن حُضَیر وغیرہم۔

مؤرخ بلاذری نے گیارہ آدمیوں کے نام گنائے ہیں جو لکھنا جانتے تھے۔

رسولِ کریمؐ اور اشاعتِ کتابت: اسلام نے کتابت کی نشر و اشاعت میں بڑی مدد دی اور وحی کی حفاظت اور ملوک و سلاطین تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی وجہ سے کتابت کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت کی طرف بڑی توجہ مبذول فرمائی۔ چنانچہ غزوہ بدر کے قیدیوں میں سے جو لکھنے پڑھنے سے آشنا تھے، ان کی رہائی کے لیے یہ شرط ٹھہرائی کہ وہ مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ ان کو اسی صورت میں رہا کیا جائے گا جب وہ یہ شرط پوری کریں گے۔

قرآن کریم کی جمع و تدوین اور ملوک و سلاطین کے نام تحریر کردہ دعوتِ اسلام پر مشتمل خطوط کے سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت سے فائدہ اٹھایا تھا۔ آپ نے اس مقصد کے لیے چند صحابہ کو کاتب مقرر کر رکھا تھا۔ ہم ان کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے حضورؐ نے مکہ میں قریش میں سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو اپنا

کاتب مقرر کیا۔ وہ بعد میں مرتد ہوگیا۔ اور مدینہ سے بھاگ کر مکہ پہنچ گیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد پھر اسلام لایا۔

۲۔ مدینہ میں حضورؐ کے اوّلین کاتب حضرت اُبی بن کعبؓ تھے۔ جب یہ موجود نہ ہوتے تو آپ زید بن ثابتؓ سے لکھواتے۔ حضرت اُبی بن کعبؓ اور زیدؓ دونوں وحی اور خطوط لکھا کرتے تھے۔

۳۔ جب فتح مکہ ہونے پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے تو حضور نے ان کو کاتبِ وحی قرار دیا۔

علاوہ ازیں اور بھی بہت سے صحابہ کتابتِ وحی کا کام انجام دیتے تھے۔ مثلاً خلفاءِ راشدین و ابان بن سعید و زید بن ارقم و حنظلہ بن ربیع وغیرہم رضی اللہ عنہم۔

(فتوح البلدان ص ۴۵۸)

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم بتمامہ عہد رسالت میں لکھا جا چکا تھا۔ چونکہ کاغذ ان دنوں مفقود تھا۔ اس لیے قرآن کریم کو چمڑے کے ٹکڑوں، چوڑی ہڈیوں اور نرم پتھر پر لکھا جاتا تھا۔ قرآن کریم حسب موقعہ ومقام وبلحاظ ضرورت تدریجاً نازل ہوتا رہا۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور کاتب وحی صحابی کو بلاکر حکم دیا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت کی فلاں جگہ لکھ لیا جائے۔ حضورؐ کی بعثت سے لے کر تاوفات تئیس ۲۳ سالوں تک یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہا۔

کیا قرآن کی طرح حدیث کی کتابت بھی عہد رسالت میں شروع ہوگئی تھی؟

کتابتِ حدیث سے ممانعت کی وجہ:۔ جیساکہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں، قرآن کریم آیت آیت اور سورت سورت کر کے قسط وار نازل ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی کتابت کے لیے صحابہ کو مقرر کر رکھا تھا۔ اگرچہ قرآن کریم جزالت معانی ضخامت الفاظ

اور حسنِ نظم و ترتیب کے اعتبار سے انسانی کلام سے ممتاز ہے اور بڑے بلغاء اس کے مقابلہ سے عاجز آچکے ہیں۔ تاہم جو شخص فنِ بلاغت سے بہرہ ور نہ ہو وہ غلطی میں مبتلا ہو سکتا ہے ایسا شخص دقائق بلاغت کا راز دان نہ ہونے کی وجہ سے قرآن کریم اور حدیثِ نبوی میں فرق نہیں کر سکتا۔ لہذا اس اشتباہ والتباس سے بچنے اور تغیر و تبدل کے خطرہ سے محفوظ رہنے کے لیے، جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو کتابت حدیث سے روک دیا تھا۔ تاکہ قرآن کریم کے لیے وسیع میدان موجود رہے۔ اور اسے حفظ و کتابت کے ذریعے محفوظ کیا جا سکے۔ وہ حفاظ کے سینوں میں اپنے قدم جمالے۔ صحابہؓ کے کان اس کے نغموں سے مانوس ہو جائیں اور اس طرح التباس کا خطرہ باقی نہ رہے۔ ان وجوہ و اسباب کے پیش نظر حضورؐ نے صحابہؓ کو حدیثیں لکھنے سے روک دیا تھا۔

حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قرآن کے سوا مجھ سے سن کر کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا کوئی بات مجھ سے لکھی ہو، اسے مٹا دے۔ (صحیح مسلم)

جیسا کہ مذکورہ صدر حدیث میں مذکور ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو کتابت حدیث سے روکا اور حافظہ پر اعتماد کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے حدیث کی نقل و روایت سے روکا نہیں تھا بلکہ اس کی اجازت مرحمت فرمائی اور دروغ گوئی سے اجتناب کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں صحابہ کی قوتِ حافظہ ضرب المثل کی حد تک مشہور تھی۔ اس لیے حدیثوں کے ضائع ہونے کا خطرہ ہرگز دامن گیر نہ تھا۔ کتابتِ حدیث سے منع کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ صحابہؓ کی قوت حافظہ ضائع نہ ہونے پائے۔ اگر وہ لکھنا شروع کر دیتے تو تحریر پر بھروسہ کر کے وہ قوت حافظہ سے کام لینا چھوڑ دیتے اور اس طرح رفتہ رفتہ ان کی قوتِ حافظہ جواب

دے دیتی۔ اس پر تیسری وجہ کا اضافہ فرمائیے۔ جو یہ ہے کہ کتابت اس دور میں عام نہ تھی کہ حفظ کی جگہ لے سکتی۔ بخلاف ازیں کتابت کا دائرہ صرف چند افراد تک محدود تھا۔ اور وہ صرف قرآن لکھنے اور حضورؐ کے دعوتی خطوط کی تحریر و تسوید کے سلسلہ میں کتابت سے مدد لیتے تھے۔ بجز اس کے ان کے یہاں کتابت کا دوسرا کوئی استعمال سرے سے تھا ہی نہیں۔ بنابریں اگر ان کو حدیثیں لکھنے کے لیے مکلف و مامور کیا جاتا تو بڑی دشواری میں مبتلا ہو جاتے اور کتاب و سنت میں فرق و امتیاز نہ کر پاتے۔

منع و جوازِ کتابت کی احادیث میں تطبیق:

سوال:۔ معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ منع کتابت کے پہلو بہ پہلو ایسی احادیث بھی موجود ہیں۔ جن میں حضورؐ نے حدیثیں لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ مثلاً یہ حدیث کہ فتح مکہ کے دن جو خطبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا یمن کے ایک شخص ابو شاہؓ نے حضورؐ سے درخواست کی کہ مجھے لکھوا دیا جائے۔ آپ نے فرمایا یہ خطبہ ابوشاہ کو لکھ دو۔ (بخاری کتاب العلم)۔ اسی طرح ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ میں عبداللہ بن عمرو بن العاص کے سوا دوسرا کوئی شخص مجھ سے زیادہ حدیثیں نہیں جانتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ لکھ لیا کرتا تھا اور میں نہ لکھتا تھا۔ اور اس قسم کے دیگر آثار و شواہد جو اباحتِ کتابت پر دلالت کرتے ہیں، بظاہر ابوسعید خدریؓ کی منع کتابت پر مشتمل حدیث سے متعارض ہیں۔ اب قابل استفسار امر یہ ہے کہ اس کا جواب کیا ہے؟

جواب:۔ اس سوال کے متعدد جواب ہیں۔

۱۔ آپ نے کتابتِ حدیث سے اس وقت منع فرمایا تھا جب قرآن نازل ہو رہا تھا مبادا قرآن و حدیث دونوں باہم مل جل جائیں۔ لکھنے کی اجازت اس وقت دی، جب التباس کا خطرہ ٹل گیا۔

۲۔ ممانعت کا مطلب یہ تھا کہ قرآن و حدیث دونوں کو ایک ہی صفحہ پر ایک جگہ نہ لکھا جائے۔ اگر دونوں کو الگ الگ لکھا جائے۔ اور التباس کا خطرہ نہ ہو تو لکھنے کی اجازت ہے۔

۳۔ آپ نے پہلے کتابتِ حدیث سے اس خطرہ کے پیش نظر منع فرمایا کہ کتاب و سنت دونوں مخلوط نہ ہو جائیں۔ یا اس لیے فرمایا کہ لوگ تحریر پر بھروسہ کر کے قوت حافظہ کی اہمیت سے غافل نہ ہو جائیں اور اس طرح قوتِ حافظہ بیکار ہو جائے۔ جب التباس کا خطرہ باقی نہ رہا اور اس بات کا بھی اطمینان ہو گیا کہ لوگ تحریر پر بھروسہ نہیں کریں گے تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔ لہٰذا دوسرا حکم پہلے حکم کا ناسخ ہے۔

۴۔ بعض علماء اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت کردہ حدیث دراصل حدیث نہیں بلکہ یہ ان کا اپنا قول ہے۔ امام بخاری اور دیگر محدثین نے اسی خیال کا اظہار کیا جائے۔

بہرکیف یہ مسلمہ صداقت ہے کہ عہد رسالت میں حدیث کی کتابت اس طرح نہیں ہوئی تھی جس طرح قرآن کریم کی۔ چنانچہ حضورؐ نے کسی کاتب کو حدیثیں لکھنے کا حکم نہیں دیا تھا بعض صحابہؓ سے عہد رسالت میں حدیثیں لکھنے کا جو ثبوت ملتا ہے وہ بہت کم ہے۔ زیادہ تر ان کا اعتماد اس دور میں قوت حافظہ پر تھا۔ اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت ابو سعید خدری کی روایت کردہ حدیث موقوف نہیں جیسا کہ بعض محدثین نے کہا ہے بلکہ مرفوع ہے تاہم ہمارا زاویہ نگاہ اس ضمن میں یہ ہے کہ حضورؐ کا آخری حکم کتابتِ حدیث کی اجازت پر مشتمل تھا۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ مرض الموت میں جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدت اختیار کر گئی۔ تو آپ نے فرمایا میرے پاس لکھنے کا سامان لاؤ تاکہ میں ایسی چیز لکھ دوں جس کی موجودگی میں تم میرے بعد گمراہ نہ ہو سکو۔ (آخر تک)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں صحابہ

کے لیے کچھ لکھوانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ تاکہ آپ کی وفات کے بعد ان میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی بات کا ارادہ کر سکتے ہیں جو جائز اور درست ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت میں منعِ کتابت حدیث کا جو حکم دیا گیا وہ اس حدیث سے منسوخ ہے۔

امام احمد نے مسند میں، بیہقی نے مدخل میں اور محدث عُقیلی نے متعدد طُرق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ تمام صحابہ میں عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے سوا کوئی مجھ سے زیادہ حدیثیں جاننے والا نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبداللہؓ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی اجازت طلب کی تھی کہ جو آپ سے سنوں، اسے لکھ لیا کروں۔ حضورؐ نے اس کی اجازت دے دی تھی۔

کتابت حدیث کے بارے میں عبداللہ بن عمرو کا اجازت طلب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آغازِ اسلام میں یہ ممنوع تھا۔ جب انہوں نے حضورؐ سے اس کی اجازت چاہی تو آپ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ ظاہر ہے کہ اس میں حضرت عبداللہؓ کی کچھ خصوصیت نہیں بلکہ یہ اجازت تمام صحابہ کے لیے تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت وفات پائی، جب کتابتِ حدیث کی عام اجازت دے دی گئی تھی۔

(فتح البخاری ج ۱ ص ۱۸۲)

عہدِ رسالت کے بعد کتابت حدیث: جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو حدیث کی تدوین اس طرح نہیں ہوئی تھی۔ جس طرح قرآنِ عزیز مدون ہو چکا تھا۔ اس کے وجوہ و اسباب ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ خلفائے راشدین نے بھی اپنے عصر و عہد میں احادیث نبویہ کو اوراق و صحف میں جمع نہ کیا۔ مبادا لوگ ان کو قرآنی صحیفے سمجھنے لگیں۔ اور اس طرح قرآن وحدیث آپس میں مل جائیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ قرآن کے درس و تلاوت

سے باز رہیں گے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ خلفائے راشدین نے اس خطرہ کے پیش نظر قلتِ روایت کا حکم دیا تھا کہ لوگ کہیں حدیث میں منہمک ہو کر قرآن کو خیر باد نہ کہہ دیں خصوصاً جب کہ لوگوں کی اکثریت اس عہد میں نیا نیا اسلام تھی اور قرآن ان کے سینوں میں ابھی راسخ نہ ہو پایا تھا۔

یہی خدشات تھے جن کو ملحوظ رکھتے ہوئے جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اصحابؓ رسولؐ کو جمع کر کے کتابتِ حدیث کے بارے میں مشورہ لیا۔ اور انہوں نے حدیثیں لکھنے کی رائے دی تھی۔ تاہم آپ کتابتِ حدیث سے باز رہے کہ مبادا لوگ ان سے قرآنی صحیفوں کا سا سلوک کرنے لگیں اور عوام قرآن و حدیث میں فرق و امتیاز کرنے سے قاصر رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر لوگ اسی غلطی میں مبتلا ہو جائیں۔ جس میں اہل کتاب ہوئے تھے۔ اہل کتاب کا یہ شیوہ تھا کہ اپنے ہاتھوں کے ساتھ ایک تحریر لکھتے اور اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرتے کہ وہ من جانب اللہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے کتاب خداوندی کو پس پشت ڈال دیا۔ قرآن عزیز میں فرمایا۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ۔	اور اُن (اہل کتاب) میں سے ان پڑھ لوگ ہیں جو کتاب کو نہیں جانتے وہ صرف اپنی خواہشات سے واقف ہیں۔ اور صرف اندازے لگاتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے۔ جو اپنے ہاتھوں کے ساتھ تحریر لکھتے ہیں پھر کہتے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

امام بیہقی مدخل میں عروہ بن زبیرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حدیثیں لکھنے کا ارادہ کیا اور اس ضمن میں اصحابِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا۔ انہوں نے حدیثیں لکھنے کی رائے دی۔ بعد ازاں حضرت عمرؓ اس مسئلہ میں

ایک ماہ تک استخارہ کرتے رہے۔ ایک صبح بڑے وثوق کے ساتھ فرمایا کہ میں نے حدیثیں لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ مجھے ایک قوم یاد آگئی جو تم سے پہلے آباد تھی۔ اس قوم نے اپنے ہاتھوں کے ساتھ کچھ تحریریں لکھیں۔ پھر ان پر جم گئے اور کتاب خداوندی کو پس پشت ڈال دیا۔ بخدا میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی چیز کو مل جل جانے کی اجازت نہ دوں گا۔ (تدریب الراوی ص ۱۵۱)

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے اس عصر و عہد سے بالکل ہم آہنگ تھی جس میں آپ بقیدِ حیات تھے۔ وہ لوگ ابھی نئے نئے قرآن سے آشنا ہوئے تھے۔ خصوصاً وہ لوگ جو بیرونی ممالک سے آکر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ اگر حدیثیں اس دور میں مدوّن ہوکر لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچ جاتیں اور لوگ ان کے حفظ و درس میں لگ جاتے تو قرآن عزیز کے ساتھ ان کا تصادم ہو جاتا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ قرآن و حدیث دونوں باہم مخلوط ہو جاتے اور بہت سے لوگ ان میں فرق نہ کر سکتے۔ اس لیے جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی خداداد بصیرت و فراست کے پیشِ نظر یہ چاہا کہ لوگوں کو قرآن کریم تک محدود رکھیں۔ مقدور بھر اس بات کی کوشش کی جائے کہ قرآن لوگوں کے سینوں میں جگہ پالے۔ اور عام و خاص میں پھیل جائے۔ امکانی حد تک لوگوں کو شکوک و اوہام سے بچایا جائے۔ اس لیے پہلے آپ نے قلتِ روایت کا حکم دیا اور پھر حدیثیں لکھنے سے اس لیے روک دیا کہ فتنہ و فساد کا یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیثوں کو ضائع کر دیا۔ اس لیے کہ اس دور کے لوگ نیکی پر قائم تھے۔ ان کی قوتِ حافظہ نہایت زبردست تھی اور احادیث کو محفوظ رکھ سکتی تھی۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے بعد آنے والے خلفاء ان کے نقشِ قدم پر رواں دواں رہے اور کسی نے بھی تدوینِ حدیث کی کوشش نہ کی۔ اور نہ ہی لوگوں کو اس بات کا

حکم دیا۔ جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا زمانہ آیا تو آپ نے عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حدیثیں جمع کرنے کا حکم دیا۔ ان کے زمانہ تک کتاب الٰہی حفاظت کے تمام مدارج طے کر چکی تھی۔ اور احادیث کے ساتھ التباس و اشتباہ کا خدشہ باقی نہ رہا تھا۔

اولین خلیفہ جس نے تدوین کا آغاز کیا: پہلی صدی ہجری ختم ہونے کو تھی۔ ابھی تک کسی خلیفہ نے علماء کو حدیث کی جمع و تدوین حکم نہیں دیا تھا۔ حدیث نبوی کا انحصار اب تک یا تو لوگوں کی قوت حافظہ پر تھا اور یا اُن ذاتی تحریروں پر جو بعض صحابہ کے پاس محفوظ تھیں۔ وہ ان تحریری مسودات سے خود استفادہ کرتے یا طلب کرنے والے کو دے دیتے۔ عہدِ رسالت سے لے کر اس قدر طویل عرصہ گزر جانے کا اثر یہ ہوا کہ قرآن لوگوں کے قلب و ذہن میں راسخ ہو گیا۔ دُور و نزدیک کے رہنے والے خاص و عام قرآن عزیز کی تلاوت بلاشک و اختلاف کرنے لگے۔ جونہی ایک مسلم قرآن کا ایک حرف سنتا تو فوراً پہچان جاتا کہ یہ قرآن کے سوا کچھ اور نہیں۔ قرآنی الفاظ کی متانت، اس کی جزالتِ اُسلوب اور قوتِ اعجاز اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی زندہ دلیل تھی۔

عہد رسالت کے بعد اس مدت مدید کے گزر جانے کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ حدیث نبوی کے حامل صحابہؓ و تابعینؒ فوت ہو گئے اور بکثرت اہل بدعت مثلاً روافض و خوارج کو یہ موقع ملا کہ انہوں نے حسبِ مرضی حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں۔ اس دَور میں عرب و عجم اقوام میں اختلاط کے مواقع پیدا ہوئے۔ وہ باہم شادی بیاہ کرنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب و عجم کے میل جول سے ایک نئی قوم معرضِ وجود میں آئی جس میں حفظ و ضبط کی اس قوت کا فقدان تھا جو عربوں کی خصوصیت چلی آتی تھی۔

جب ۹۹ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مسندِ خلافت کو زینت بخشی

تو آپ نے خداداد فراست وبصیرت سے حدیث نبوی پر نگاہ ڈالی اور اس کی کتابت و تدوین کو ایک فریضہ تصور کیا۔ ان کے عصر وعہد میں کتابتِ حدیث کے موانع زائل ہو چکے تھے۔ اور جمع و تدوین کے محرکات و دواعی بے شمار تھے۔ ان کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے علما کو حدیث کی جمع و تدوین کا حکم صادر فرمایا۔ آپ نے ابوبکر بن حزم کے نام ایک خط میں تحریر کیا۔

"احادیث نبویہ جہاں بھی ملیں، ان کو لکھ لو۔ اس لیے کہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علما کے رخصت ہو جانے کا خدشہ دامنگیر ہے۔ حدیث نبوی کے سوا اور کچھ قبول نہ کیجیے۔ علم کی اشاعت کیجیے اور بیٹھ کر درس دیجیے۔ تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ جان لے۔ یاد رکھیے کہ علم اس وقت تک معدوم نہیں ہوتا جب تک اسے پوشیدہ نہ رکھا جائے۔" (صحیح بخاری)

ابو نعیم لکھتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اطراف ملک میں یہ حکم لکھ بھیجا کہ احادیث نبویہ کو تلاش کر کے جمع کیجیے۔ (تاریخ اصبہان)

امام محمد بن حسن امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے مدینہ کے گورنر ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو لکھا کہ احادیث نبویہ تلاش کر کے لکھیے۔ اس لیے کہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علماء کے رخصت ہو جانے کا ڈر ہے۔ (موطا امام مالک)

سابق الذکر روایات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتی ہیں کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اطرافِ ملک میں حدیثیں لکھنے پر مشتمل احکام بھیجے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ احادیث کی جمع و تدوین میں سبقت و تقدم کا شرف کس کے حصے میں آیا؟ حفاظ حدیث کا متفقہ بیان یہ ہے کہ سب سے پہلے امام ابن شہاب زہری نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایما پر احادیث کی جمع و تدوین کی داغ بیل ڈالی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کتابتِ حدیث کو ناپسند کرتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح انھوں نے وہ احادیث اپنے حافظہ میں محفوظ رکھیں۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی ان احادیث کو یاد کرلیں۔ مگر جب ہمتیں پست ہوگئیں اور علماء و علم کے ضائع ہوجانے سے ڈرنے لگے تو انھوں نے احادیث کو مدوّن کرلیا۔ اس ضمن میں سبقت کا شرف امام ابن شہاب زہری کو حاصل ہؤا۔ آپ نے پہلی صدی ہجری کے اختتام پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے حدیثیں جمع کیں۔ پھر تدوین و تصنیف کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اور اس سے (ملتِ اسلامیہ کو) بڑا فائدہ پہنچا۔

(فتح الباری ج ۱ ص ۱۵۸)

اس دَور میں تدوین حدیث کا طریقہ یہ تھا کہ ایک کتاب میں ایک موضوع سے متعلق احادیث کو یکجا کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً نماز سے متعلق احادیث کو ایک جداگانہ تصنیف میں جمع کر دیتے۔ اسی طرح روزہ، زکوٰۃ اور طلاق وغیرہ کے مسائل کو الگ الگ تصانیف میں تحریر کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ اس عہد کی کوئی تصنیف ہم تک نہیں پہنچی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علما نے ان تصانیف کو اپنی کتب میں ضم کر لیا اور اس طرح ان کی جداگانہ حیثیت باقی نہ رہی۔ چونکہ یہ تصانیف جن احادیث پر مشتمل تھیں۔ وہ علماء کو زبانی یاد بھی تھیں۔ اس لیے وہ ان احادیث کو اپنی تصانیف میں سمونے کے لیے حق بجانب تھے۔

اس شخص پر کیا جاتا ہے جسے طویل عرصہ تک حضورؐ کی ہم نشینی کا شرف حاصل رہا ہو اور وہ آپ سے اخذ و استفادہ بھی کرتا رہا ہو۔ چنانچہ علمائے اصول کا زاویہ نگاہ یہی ہے بمعانی،

محدث ابن الصلاح فرماتے ہیں۔

"ہم نے شعبہ سے روایت کی۔ انہوں نے موسیٰ سیلانی سے کہ میں نے حضرت انسؓ بن مالک کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ کیا آپ کے سوا صحابہ میں سے اور بھی کوئی صاحب بقید حیات ہیں؟ فرمانے لگے چند بدوی موجود ہیں۔ جنہوں نے حضورؐ کو دیکھا تھا۔ البتہ آپ کی صحبت سے مستفید ہونے والا کوئی شخص اب باقی نہیں۔" (مقدمہ ابن الصلاح)

اس کی سند جید ہے۔ امام مسلم نے ابو زرعہ کی موجودگی میں یہ روایت بیان کی۔

یہ قول علمائے اصول کے نظریہ سے ہم آہنگ ہے۔

کسی شخص کا صحابی ہونا مندرجہ ذیل امور سے معلوم ہوتا ہے:۔

صحابی کی پہچان:

۱۔ اُمت کے تواتر سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص صحابی ہے، مثلاً خلفائے اربعہ۔

۲۔ کسی شخص کا صحابی ہونا اس شہرت سے ثابت ہوتا ہے جو تواتر کے درجہ تک پہنچنے سے قاصر ہو، مثلاً حضرت ضمامؓ بن ثعلبہ اور عکاشہؓ بن محصن۔

۳۔ جب کوئی معروف صحابی کسی شخص کے بارے میں شہادت دے کہ وہ صحابی ہے، تو اس سے اس کا صحابی ہونا ثابت ہو جائے گا۔ مثلاً حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حُمَمہ بن ابی حُمَمہ دَوسی کے بارے میں شہادت دی تھی کہ وہ صحابی ہیں۔ یہ صاحب اصبہان کے شہر میں بمرض اسہال فوت ہوئے تھے۔

۴۔ کسی شخص کا صحابی ہونا اس بات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود صحابی ہونے کا دعویٰ کرے۔ بشرطیکہ وہ آپ کا معاصر ہو اور اس کی عدالت بھی ثابت ہو۔

۵۔ اگر کوئی تابعی کسی شخص کے بارے میں یہ کہے کہ وہ صحابی ہے تو اس سے مذکورہ

مشاہیر صحابہؓ کا تعارف

اب ہم مشاہیر صحابہؓ کا تعارف کرائیں گے۔ جس سے یہ ظاہر ہو گا کہ حدیث نبوی کے ساتھ انہیں کس حد تک لگاؤ تھا اور وہ اس کو سیکھنے کے کس قدر دلدادہ تھے۔ قبل اس کے کہ صحابہ کا تعارف کرایا جائے ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ صحابی کی تعریف کیا ہے۔ اور ان کی توثیق و عدالت کے بارے میں علما کی کیا رائے ہے؟

صحابی کون ہے؟

محققین اہل الحدیث مثلاً امام بخاری اور امام احمد بن حنبل کی رائے میں صحابی اس شخص کو کہتے ہیں جو بحالتِ ایمان سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہو۔ اور اس کی موت بھی مسلمان ہونے کی حالت میں واقع ہوئی ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ زیادہ عرصہ تک حضورؐ کی صحبت میں رہا یا کم عرصہ۔ اس نے آپ سے روایت کی یا نہیں اور آپ کی رفاقت میں کسی غزوہ میں شریک ہوا یا نہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں۔

"جو شخص حضورؐ کی صحبت سے مستفید ہوا یا اس نے مسلمان ہوتے ہوئے آپ کو دیکھا وہ صحابی ہے"۔ (صحیح بخاری)

ابو مظفر سمعانی رقمطراز ہیں۔

"جس شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث یا ایک لفظ بھی روایت کیا ہو۔ محدثین اس کو صحابی قرار دیتے ہیں۔ لفظ صحابی میں وسعت پیدا کرتے ہوئے اہل الحدیث اس شخص پر بھی صحابی کا اطلاق کرتے ہیں جس نے حضورؐ کو صرف ایک بار دیکھا ہو۔ حضورؐ کی عظمتِ شان کے پیش نظر وہ صرف آپ کو دیکھنے والے کو بھی صحابہ میں شمار کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ صحابی کا اطلاق لغت اور ظاہر کے اعتبار سے

شخص کا صحابی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس قول کی اساس اس بات پر رکھی گئی ہے کہ اگر ایک عادل شخص بھی کسی شخص کی صفائی پیش کرے تو اس کی شہادت مقبول ہے۔ یہی قول راجح ہے۔

عدالتِ صحابہ پر اجماع: تمام صحابہ کی عظیم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کی عدالت کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات علما کے نزدیک مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ جمیع صحابہ نصوصِ کتاب و سنت اور اجماع اُمت کے پیش نظر عدول ہیں۔ قرآن عزیز میں فرمایا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ — محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ — کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں رحم کرنے والے ہیں۔

عدالتِ صحابہؓ کے بارے میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں

۱۔ حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرے صحابہؓ کو بُرا نہ کہو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ حضرت عبداللہ بن مغفل بیان کرتے ہیں کہ سرور کائنات ؐ نے فرمایا، میرے صحابہؓ کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ میرے بعد ان کو نشانہ نہ بناؤ جس نے ان کو دوست بنایا، اس نے محبت کی وجہ ہی سے ان کو دوست بنایا۔ اور جس نے ان سے عداوت رکھی، اس نے میری عداوت ہی کی وجہ سے ان سے عداوت رکھی جس نے ان کو دکھ پہنچایا، اس نے مجھے دکھ پہنچایا اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی۔ اور جس نے اللہ کو ایذا دی، وہ اسے پکڑے گا۔ (ترمذی۔ ابن حبان)

جب خداوند کریم اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو عدول قرار دیا ہے تو اس کے بعد کسی اور کی تبدیل کی حاجت نہیں حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اللہ اور اس کا

رسولؐ صحابہؓ کی تعدیل نہ بھی کرتے تو بھی ان کا عدول ہونا واضح اور عیاں ہے۔ اور اس کی وجہ ان کے اعمالِ جلیلہ ہیں جو انہوں نے انجام دیئے۔ مثلاً ہجرتِ مدینہ۔ جہاد۔ نصرت و حمایتِ اسلام۔ مال و جان کی قربانی و خدا کی راہ میں آباء و ابناء کا قتل، دین کی خیر خواہی، قوتِ ایمان و ایقان اور دیگر اعمالِ صالحہ۔

امام ابو زُرعہ رازی فرماتے ہیں :۔

"جب کسی شخص کو صحابہؓ کی توہین کا ارتکاب کرتے دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کا رسولؐ حق ہے۔ قرآن بھی حق ہے۔ جو کچھ رسول کریم نے فرمایا وہ سب کچھ حق ہے اور یہ سب چیزیں ہم تک صحابہ کے ذریعہ پہنچیں۔ زنادقہ کتاب و سنت کو باطل ٹھہرانے کے لئے ہمارے گواہوں کو مجروح کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ان کو کیوں نہ مجروح قرار دیا جائے۔"

محدّث ابن الصلاح فرماتے ہیں۔

"پوری اُمت جمیع صحابہ کی عدالت پر متفق ہے۔ صحابہؓ میں سے جو لوگ فتنوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے، وہ بھی عدول ہیں۔ اس پر علما کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ صحابہ کے فضائل و مآثر کے پیش نظر ان پر حسن ظن رکھنا واجب ہے۔ خداوند کریم نے صحابہ کی عدالت پر اجماع اسی لیے مقدر کر رکھا تھا کہ وہ شریعت اسلامیہ کو ہم تک پہنچانے والے ہیں۔"

صحابہ کی تعداد: صحابہؓ کی تعداد بہت زیادہ ہے اور صحیح طور پر اس کی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ علما نے اندازہ سے ان کی تعداد بتائی ہے۔ صحیح عدد معلوم نہیں۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہنے کے واقعہ میں بیان کرتے ہیں کہ اصحابِ رسولؐ کی تعداد بہت زیادہ ہے اور کسی کتاب میں ان کی گنتی مذکور نہیں۔ (صحیح بخاری)

محدث ابو زرعہ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے کہ احادیث نبویہ کی تعداد چار ہزار ہے؟ فرمانے لگے یہ زنادقہ کا قول ہے۔ احادیث رسولؐ کو کون شمار کر سکتا ہے؟ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ اس وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ موجود تھے اور ان سب نے آپ سے حدیثیں سنیں اور روایت کیں۔ پھر ان سے سوال کیا گیا، یہ صحابہ کہاں تھے اور انہوں نے کس جگہ آپ سے حدیثیں سنیں؟

فرمانے لگے صحابہ مکہ و مدینہ اور ان کے آس پاس بود و باش رکھتے تھے۔ کچھ دیہاتی تھے اور وہ بھی جو حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ کے ہمراہ تھے۔ ان سب نے آپ کو عرفات کے میدان میں دیکھا اور آپ کے ارشادات گرامی سنے۔

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ حدیثیں روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا ہم صرف انہی صحابہ کا ذکر کریں گے جو روایت حدیث میں شہرت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ان کے مختصر سیر و سوانح بھی قلم بند کریں گے۔

حضرت ابوہریرہؓ:

اسم گرامی عبدالرحمٰن بن صخر اور کنیت ابوہریرہؓ ہے۔ ۷ھ ماہ محرم میں غزوہ خیبر والے سال مشرف باسلام ہو کر زیارت نبوی کی سعادت حاصل کی۔ امام شافعی اور دیگر محدثین کے قول کے مطابق یہ صحابہ میں سب سے بڑے حافظِ حدیث تھے۔ حالانکہ ان کو صحبت نبوی کی سعادت بہت کم حاصل ہوئی بہت کم عرصہ صحبت نبوی سے مستفید ہونے کے باوجود ان کے کثیر الروایۃ ہونے کے وجوہ و اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ یہ ہمیشہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر رہتے تھے۔ اور شاذ و نادر ہی غیر حاضر ہوتے تھے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ "تم کہتے ہو کہ ابوہریرہ حدیثیں بہت کم روایت کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک مسکین آدمی تھا۔ پیٹ بھر کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے سوا مجھے کوئی کام نہ تھا۔ مہاجرین بازار

ہیں کاروبار کرتے تھے۔ انصارِ مدینہ اپنے مالوں کی حفاظت میں مصروف رہا کرتے تھے۔
میں حضور کی ایک مجلس میں حاضر تھا۔ آپ نے فرمایا کون ہے جو میرے بات ختم کرنے تک چادر پھیلائے اور پھر اسے سمیٹ لے اور پھر اس کے بعد اسے سُنی ہوئی بات کبھی نہ بھولے۔ یہ سُن کر میں نے اپنی چادر بچھادی۔ جب آپ نے سلسلۂ کلام ختم کیا تو میں نے وہ چادر سمیٹ لی۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس کے بعد مجھے کوئی بات کبھی نہیں بھولی۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ تحصیل علم کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور حضورؐ نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی کہ انہیں نسیان کی بیماری لاحق نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف تین سال صحبتِ نبوی میں رہنے کے باوجود کثرتِ روایت میں سب صحابہ پر فوقیت لے گئے تھے۔ امام نسائیؒ نے باب العلم میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت زید بن ثابتؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر چند مسائل دریافت کیے۔ حضرت زیدؓ کہنے لگے ابوہریرہ سے پوچھیے۔ پھر انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک دن میں ابوہریرہؓ اور ایک شخص مسجد میں بیٹھے ذکر الٰہی میں مصروف تھے اسی دوران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاکر ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ ہم خاموش ہو گئے۔ فرمایا جو کام آپ کر رہے تھے اسے جاری رکھیے۔ زیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے اور میرے ساتھی نے ابوہریرہؓ سے پہلے دعا مانگی اور رسولِ کریمؐ نے آمین کہی۔ پھر ابوہریرہ نے دعا مانگی اور کہا "اے اللہ میرے ساتھیوں نے تجھ سے جو کچھ طلب کیا ہے۔ میں وہ طلب کرتا ہوں اور تجھ سے ایسے علم کا طالب ہوں جو فراموش نہ ہونے پائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ نے آمین کہا۔ حضرت زید نے کہا کہ ہم بھی اللہ سے نہ بھولنے والے علم کے خواستگار ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "دوسی لڑکا (ابوہریرہ) اس بات میں تم سے سبقت لے گیا۔" (سنن نسائی)

حضرت ابوہریرہؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "روزِ قیامت

آپ کی شفاعت کی سعادت سب سے زیادہ کس کو حاصل ہوگی؟ حضورؐ نے فرمایا "میرا خیال تھا کہ آپ سے پہلے کوئی شخص مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ آپ حدیثوں کے بہت مشتاق ہیں۔ میری شفاعت کی سعادت سب سے بڑھ کر روز قیامت اس شخص کو نصیب ہوگی جو خلوص دل سے لا الٰہ الا اللہ پڑھے۔ (بخاری)

۳۔ کثرت روایت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ ابوہریرہؓ نے کبار صحابہ سے مل کر استفادہ کیا تھا۔ اس لیے ان کا علم کامل اور وسعت پذیر ہوگیا۔

۴۔ ابوہریرہ نے حضورؐ کے بعد طویل عمر پائی۔ آپ نبی کریمؐ کے بعد سینتالیس سال بقید حیات رہ کر حدیث نبوی کی نشر و اشاعت کرتے رہے۔ آپ مناصب و مشاغل اور فتنوں سے دور رہے۔

مندرجہ صدر وجوہ و اسباب کے پیش نظر حضرت ابوہریرہؓ تمام صحابہؓ میں عظیم تر حافظ حدیث تھے۔ اور حدیث کے اخذ و تحمل اور روایت دونوں میں سب صحابہ پر فائق تھے۔ ابوہریرہؓ بحیثیت مجموعی جن احادیث کے حافظ تھے وہ انفرادی طور پر تمام یا اکثر صحابہ کو یاد تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر صحابہؓ پیش آمدہ مسائل کے حل میں حضرت ابوہریرہ کی جانب رجوع کرتے اور ان پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے جنازہ کے موقع پر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا تھا، ابوہریرہؓ مسلمانوں کے لیے نبی اکرمؐ کی احادیث محفوظ رکھا کرتے تھے۔ بقول امام بخاری حضرت ابوہریرہ سے قریباً آٹھ سو اہل علم صحابہ و تابعین نے حدیثیں روایت کی ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) احادیث مروی ہیں۔ ان میں بخاری و مسلم میں تین سو پچیس (۳۲۵) روایات ہیں۔ صرف بخاری میں ترانوے اور صرف مسلم میں ایک سو چوراسی حدیثیں ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے مدینہ میں ۵۷ھ میں بعمر اٹھتر سال وفات پائی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ: نام و نسب سعد بن مالک بن سنان خدری انصاری خزرجی ہے۔ ان کے والد غزوہ اُحد میں شہید ہو گئے اور کوئی ورثہ باقی نہ چھوڑا۔ اس طرح ابوسعید بچپن ہی میں عُسرت و افلاس کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مگر ان کی اقتصادی بدحالی ان کو آنحضور کی مجلس میں حاضر ہو کر استفادہ کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔ چنانچہ یہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ احادیث نبوی کی تحصیل کرتے رہے اور احادیث کا اس قدر ذخیرہ جمع کیا کہ ان جیسی معاشی مشکلات میں مبتلا کوئی شخص اس باب میں ان کا حریف ثابت نہ ہو سکا۔ حضرت ابوسعیدؓ کا شمار کثیر الروایۃ اور محدث و فاضل صحابہؓ میں ہوتا ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ آنحضورؐ کے بعد چونسٹھ سال زندہ رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے کبار صحابہ سے حدیثیں اخذ کیں اور انہیں لوگوں تک پہنچایا۔ اسی لیے ان کی مرویات ایک ہزار ایک سو ستر تک پہنچ گئیں۔ ان میں سے چھیالیس احادیث بخاری و مسلم دونوں میں ہیں۔ سولہ احادیث کے روایت کرنے میں امام بخاری منفرد ہیں۔ امام مسلم باون احادیث کے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔

حضرت ابوسعید سے کثیر صحابہ و تابعین نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ صحابہ میں سے آپ سے حضرت جابر، زید بن ثابت، ابن عباس، انس، ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم نے روایت کی ہے۔ تابعین میں سے سعید بن المسیب، ابوسلمہ، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ، عطا بن یسار اور دیگر حضرات نے استفادہ کیا ہے۔

حضرت ابوسعیدؓ نے بارہ غزوات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کی۔ ان میں سب سے پہلا غزوہ خندق ہے۔ یہ بڑے بے باک حق گو تھے اور کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ حضرت ابوسعید نے مدینہ میں ۷۴ھ میں بعمر اسّی سال اور کچھ زائد وفات پائی۔ حضرات صحابہؓ ان کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حضرت جابر بن عبداللہ: نام و نسب جابر بن عبداللہ انصاری ہے۔ آپ کے والد بھی صحابی تھے۔ یہ بڑے کثیر الروایۃ صحابی تھے۔

حضرت جابرؓ نے نبی اکرمؐ اور کثیر صحابہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ سے حدیثیں روایت کیں حضرت جابر سے ان کے بیٹوں، عبدالرحمٰن، عقیل، محمد اور اکابر تابعین مثلاً سعید بن المسیب عمرو بن دینار حسن بصری وغیرہم نے استفادہ کیا۔

حضرت جابر بن عبداللہ کے والد غزوۂ اُحد میں شہادت سے سرفراز ہوئے اور پسماندگان میں چند کم عمر بیٹیاں چھوڑ گئے۔ علاوہ ازیں واجب الادا قرض بھی باقی چھوڑا جس کی وجہ سے حضرت جابرؓ عسرت و افلاس کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کرم نوازی سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ حضورؐ نے حضرت جابرؓ کا قرض بھی ادا کر دیا۔ مگر صعوبات و مشکلات کا یہ ہجوم حضرت جابرؓ کو حدیث نبویؐ کے اخذ و استفادہ سے باز نہ رکھ سکا۔ چنانچہ آپ تمام غزوات میں حضورؐ کے ساتھ شریک رہے۔ چونکہ حضورؐ کی وفات کے وقت آپ صغیر السن تھے۔ اور آپ نے اس کے بعد طویل عمر پائی اور کبار صحابہ سے ملے۔ اس لیے آپ کو حدیث نبوی کے اخذ و تحمل اور نشر و اشاعت کا خوب موقع ملا۔ مسجد نبوی میں آپ کا ایک حلقہ تھا۔ لوگ اس میں حاضر ہو کر حضرت جابرؓ سے استفادہ کیا کرتے تھے۔

حضرت جابرؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ کے بعد چونسٹھ سال تک زندہ رہے۔ آپ نے یہ مدت حدیث نبوی کی خدمت و اشاعت میں گزاری۔ آپ کی مرویات کی تعداد ایک ہزار پانچ سو چالیس ہے۔ بخاری و مسلم ساٹھ احادیث کے روایت کرنے پر متفق ہیں۔ چھبیس احادیث کے روایت کرنے میں بخاری منفرد ہیں۔ صحیح مسلم نے صرف ایک سو چھبیس احادیث روایت کی ہیں۔

حضرت جابر کے اوصاف و مناقب بے شمار ہیں۔ چنانچہ بخاری و مسلم خود ان سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صلح حدیبیہ کے روز فرمایا "تم آج تمام روئے زمین کے لوگوں سے افضل ہو"۔ ہماری تعداد اس دن چودہ سو تھی۔ حضرت جابر کہتے ہیں۔ اگر میری نظر ہوتی تو میں تمہیں اس درخت کی جگہ دکھاتا (جس کے نیچے بیٹھ کر حضورؐ نے بیعت رضوان لی تھی)، عمر کے آخری حصہ میں آپ نابینا ہو گئے تھے۔ آپ نے ایک قول کے مطابق ۷۴ھ میں وفات پائی۔

حضرت انس بن مالک: نام و نسب انس بن مالک بن نضر انصاری خزرجی ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے۔ آگے چل کر بصرہ میں سکونت گزیں ہو گئے تھے۔ جب حضورؐ مدینہ تشریف لائے تو ان کی والدہ اُم سُلیمؓ ان کو آپ کی خدمت میں لائیں اور کہا یہ لڑکا آپ کی خدمت کرے گا۔ آپ نے اس پیش کش کو قبول فرمایا۔

حضور اکرمؐ کی صورت میں انس بن مالکؓ کو اپنے والد کا نعم البدل مل گیا۔ چنانچہ وہ خانوادۂ نبوت میں پروان چڑھے اور ان اُمور کو بچشم خود دیکھا جن کا مشاہدہ دوسرے لوگ نہ کر سکے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و احوال سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضرت انس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تراسی برس زندہ رہے اس عرصہ میں ان کو احادیث نبویہ کے اخذ و استفادہ اور نشر و اشاعت کا خوب موقع ملا۔

مدینہ منورہ کے بعد یہ بصرہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ کثیر تابعین ائمہ حدیث مثلاً حسن بصری، ابن سیرین، حُمید الطویل، ثابت بنانی وغیرہم نے ان سے خوب استفادہ کیا۔ حضرت انس سے ایک ہزار دو سو چھیاسی احادیث منقول ہیں۔ بخاری و مسلم ان میں سے ایک سو اڑسٹھ احادیث روایت کرنے میں متفق ہیں۔ صرف صحیح بخاری میں تراسی

احادیث ہیں اور مسلم میں صرف اکتیر۔

امام بخاری اپنی تاریخ میں قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت انسؓ نے وفات پائی تو مُورّق نے کہا آج سے آدھا علم رخصت ہو گیا۔ ان سے دریافت کیا گیا یہ کیوں کر؟ کہنے لگے جب کوئی بدعتی شخص حدیث کے بارے میں ہماری مخالفت کرتا تو ہم کہتے آؤ اس شخص کے پاس، جس نے یہ حدیث خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے۔

حضرت انسؓ کی وفات بصرہ سے چار میل دُور وقوع پذیر ہوئی۔ آپ کو اس جگہ دفن کیا گیا۔ جسے "قصر انس" کہتے ہیں۔ بقول صحیح تر آپ کی وفات ۹۳ھ میں ہوئی۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ: حضرت ابوبکر صدّیقؓ کی دختر نیک اختر اُمّہات المؤمنین میں سے ایک ہیں۔ آپ کی ولادت حضورؐ کی بعثت کے دو سال بعد مکّہ میں ہوئی۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضور نے جب ان کے ساتھ عقد نکاح کیا ان کی عمر چھ سال تھی۔ جب نو برس کی ہوئیں تو اپنے گھر میں آباد ہوئیں۔ یہ ماہ شوال اور ہجرت کے سالِ اول کا واقعہ ہے۔ ایک قول کے مطابق حضرت عائشہؓ کو حضورؐ نے غزوہ بدر سے واپس آکر ہجرت کے دوسرے سال شرفِ خانہ آبادی بخشا۔

زوجۂ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے جو شرف صحبت حضرت عائشہ کو میسر تھا۔ وہ آپ کے لیے تحصیل علم کے سلسلہ میں بڑا مفید ثابت ہُوا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی ذہانت و فطانت اور فراست و بصیرت اور رغبتِ علم نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے احادیث نبویہ اور علوم القرآن میں دسترس حاصل کر لی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ صحابہؓ کے مابین جب بھی کسی مسئلہ میں اختلاف رونما ہوتا تو ان کی جانب رجوع کیا جاتا ہے۔ اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں کہ کبار صحابہؓ نے آپ کے چشمۂ فیض سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ رسول کریمؐ کی صحبت میں رہنے کے باوجود

حضرت عمرؓ نے آپ سے حدیثیں روایت کیں۔ مزید براں حضرت عائشہؓ حضورؐ کی وفات کے بعد اٹھالیس سال تک بقید حیات رہیں۔ اور لوگ آپ کے بحر علم سے مستفیض ہوتے رہے۔

بنابریں حضرت عائشہؓ کا کثیر الروایۃ ہونا کچھ بھی محل تعجب نہیں چنانچہ آپ سے دو ہزار دو سو دس احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے بخاری و مسلم ایک سو چوہتر احادیث روایت کرنے میں متفق ہیں۔ بخاری چوّن احادیث روایت کرنے میں منفرد ہیں اور امام مسلم چونسٹھ روایات۔ مسروق تابعی کا قول ہے کہ میں نے اکابر صحابہؓ کو حضرت عائشہ سے تقسیم وراثت کے مسائل دریافت کرتے دیکھا ہے۔ آپ نے ۵۸ھ میں وفات پائی۔

حضرت عبداللہ بن عباس: نام و نسب عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے اور امّ المومنین میمونہؓ بنت حارث کے بھانجے تھے۔ بقول صحیح تر ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے۔ جب حضورؐ نے وفات پائی، اس وقت ابن عباسؓ کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی کریمؐ نے ان کو سینہ سے لگا کر یہ دعا فرمائی کہ "اے اللہ اسے حکمت سکھا دے۔

چونکہ ابن عباس حضورؐ کے قریبی رشتہ دار اور صغیر السن تھے۔ اس لیے ان کو آپ کے گھر میں آنے جانے کے بکثرت مواقع حاصل تھے۔ اسی وجہ سے آپ صحابہ میں بڑے کثیر الروایۃ مشہور تھے۔ مزید براں آپ کے اندر تحصیل علم کا جو طبعی ذوق پایا جاتا تھا۔ اس نے آپ کو نبی کریمؐ کی خصوصی شفقت کا مرکز بنا دیا تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔ یہ تمام عوامل و محرکات اس جلیل القدر صحابی کی شخصیت پر اثر انداز ہوئے اور سان کے زیر اثر ابن عباسؓ ترجمان القرآن حبر الامت کے نام سے مشہور

ہوئے اور آپ کو کثیر الروایۃ صحابہ میں شمار کیا جانے لگا۔

حضرت ابن عباس حضورؐ کی وفات کے بعد اٹھاون برس تک زندہ رہے۔ اس طویل مدت میں آپ نے صغار و کبار سے خوب خوب استفادہ کیا۔ حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو میں نے ایک انصاری سے کہا "آج کل بکثرت صحابہ بقید حیات ہیں۔ آئیے ان سے کسب فیض کریں"۔ وہ کہنے لگے "تعجب کی بات ہے کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ آپ کے پاس دینی مسائل دریافت کرنے کے لیے آیا کریں گے"؟ ابن عباسؓ کہتے ہیں، میں نے اس شخص کو نظر انداز کر کے صحابہ سے استفادہ کرنے کا آغاز کر دیا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کسی شخص کے بارے میں مجھے پتہ چلتا کہ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث یاد ہے۔ چنانچہ جب میں اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچتا تو وہ سو رہا ہوتا۔ میں اسی حالت میں اپنی چادر کو تکیہ بنائے اس کے دروازہ کے سامنے لیٹ جاتا۔ ہوا کے جھونکے آتے اور مجھ پر مٹی اڑاتے ہوئے گزر جاتے۔ گھر کا مالک باہر نکل کر دیکھتا تو کہتا اے رسول کریمؐ کے چچا زاد بھائی کیسے تشریف فرما ہوئے؟ آپ نے مجھے کیوں نہ بلا لیا؟ میں اس کے جواب میں کہتا کہ نہیں مجھے ہی آنا چاہیے تھا۔ میں آپ سے ایک حدیث کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ سابق الذکر انصاری شخص اس وقت بقید حیات تھے۔ اس نے بچشم خود دیکھا کہ لوگ میرے ارد گرد کھڑے مجھ سے دینی مسائل دریافت کر رہے ہیں۔ انصاری کہنے لگا۔ "یہ نوجوان مجھ سے زیادہ دانشمند نکلا۔"

مندرجہ واقعہ اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کس قدر ذہین و فطین تھے اور حدیث نبوی کے ساتھ انہیں کس قدر والہانہ شغف تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس حدیث نبوی میں امامت کے درجہ پر فائز تھے اور ان پر ہر وقت حدیث کی نشر و اشاعت کی دھن سوار رہتی تھی۔ لوگ آپ کے ارد گرد

جمع ہوتے اور آپ سے حدیثیں سنتے تھے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ علمی مہارت وحذاقت کے باوجود انہیں جب کسی دقیق دینی مسئلہ سے سابقہ پڑتا تو ابن عباس سے کہتے "ہمیں ایک پیچیدہ مسئلہ سے واسطہ پڑا ہے حل کیجیے"۔ پھر جو حل ابن عباس پیش کرتے اسے قبول فرماتے۔

حضرت ابن عباسؓ متعدد علوم مثلاً حدیث و فقہ و تاویل و حساب علم الفرائض اور عربیت میں دیگر اصحاب پر فائق تھے۔ آپ کا معمول یہ تھا کہ ایک دن صرف فقہی مسائل بیان کرتے۔ ایک دن تاویل و تفسیر کے لیے۔ ایک دن مغازی کے لیے اور ایک ایام العرب بیان کرنے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ جس عالم کو بھی آپ کی ہم نشینی کا موقع ملا، آپ کے علم سے متاثر ہوا اور جو مسئلہ بھی پوچھا اس کا جواب موجود پایا۔ مشہور تابعی طاؤس، سے سوال کیا گیا کہ آپ اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اس نوجوان (ابن عباسؓ) کے وابستہ دامن کیوں کر ہو گئے ؟ کہنے لگے "میں نے ستر صحابہ کو دیکھا ہے جب ان کے یہاں کسی مسئلہ میں نزاع پیدا ہوتا تو ابن عباس کی جانب رجوع کرتے "۔

خلاصہ یہ کہ حضرت ابن عباسؓ علم حدیث میں تنہا ایک جماعت کے برابر تھے آپ کی مرویات کی تعداد ایک ہزار چھ سو ساٹھ ہے۔ ان میں سے پچانوے احادیث بخاری و مسلم دونوں نے روایت کی ہیں۔ امام بخاری ایک سو بیس احادیث کے روایت کرنے میں منفرد ہیں اور امام مسلم انچاس روایات۔

حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں ابن عباسؓ کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا تھا حضرت علیؓ کی شہادت سے قبل آپ نے یہ منصب ترک کر دیا اور حجاز لوٹ آئے۔ زندگی کے باقی دن آپ نے مکہ میں گزارے۔ وہاں لوگوں کو دینی احکام کی تعلیم دیتے رہے آپ نے طائف میں ۶۸ھ میں وفات پائی۔

حضرت عبداللہ بچپن ہی میں مشرف باسلام ہو گئے تھے

حضرت عبداللہ بن عمر: ہو گئے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ ہجرتِ مدینہ کی سعادت حاصل کی۔ ایک قول کے مطابق اپنے والد سے پہلے ہجرت کی۔ غزوۂ خندق اور اس کے بعد وقوع پذیر ہونے والے غزوات میں شرکت کی۔ حضور کی وفات کے بعد فتح یرموک، فتح مصر اور افریقیہ میں شریک ہوئے۔ یہ حد درجہ متبع سنت تھے۔

حضرت عبداللہ نے نبی اکرمؐ، اپنے والد، اپنے چچا زیدؓ، اپنی ہمشیرہ اُم المومنین حضرت حفصہؓ نیز حضرت ابوبکرؓ وعثمانؓ وعلیؓ وبلالؓ وزید بن ثابتؓ وصہیبؓ وابن مسعودؓ وعائشہؓ ورافعؓ بن خدیج و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے حدیثیں روایت کیں۔ حضرت عبداللہ سے بے شمار لوگوں نے حدیثیں روایت کیں۔ صحابہ میں سے ابن عباسؓ، جابرؓ، اغرؓ مزنی اور دیگر بزرگوں نے آپ سے استفادہ کیا۔ تابعین میں سے آپ کے چاروں بیٹے بلال وحمزہ وسالم و عبداللہ آپ کے آزاد کردہ غلام نافع نیز حضرت عمرؓ کے آزاد کردہ غلام اسلم اور ان کے دونوں بیٹے زید وخالد اور علاوہ ازیں عروہ بن زبیر اور دیگر اکابر نے آپ سے حدیثیں روایت کیں۔

زبیر بن بکار فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رسول کریمؐ سے جو کچھ سنتے اسے یاد کر لیتے۔ جب حضورؐ موجود نہ ہوتے تو عبداللہ دوسروں سے آپ کے اقوال وافعال کے بارے میں دریافت کرتے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ابن عمرؓ کے نظریات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساٹھ سال تک زندہ رہے۔ اس لیے ان سے رسول کریمؐ اور صحابہ کی کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ (بیہقی فی المدخل)

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ابن عمرؓ رسول کریمؐ کی وفات کے بعد ساٹھ سال تک بقیدِ حیات رہے۔ لوگوں کے وفد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دینی مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر بن الخطاب نے عبداللہ کو خلافت سے دور رکھا تھا اور ان کی حیثیت

اصحابِ شوریٰ میں صرف ایک مُشیر کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابن عمر امورِ سلطنت سے الگ تھلگ رہے اور صحابہ کے مابین وقوع پذیر ہونے والے فتنوں سے جدا رہ کر علم و عبادت کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان کا شمار کثیر الروایۃ صحابہ میں ہوتا ہے۔ اس کے وجوہ و اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ یہ بہت پہلے اسلام لائے اور طویل عمر پائی۔ حضورؐ کی علمی مجالس میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کرتے۔ حد درجہ کے متبع سُنت تھے۔ حضورؐ کی عدم موجودگی میں دوسروں سے آپ کے افعال و اقوال کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے۔ یہ جملہ اُمور اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہ علم اور خصوصاً حدیث نبوی کے ساتھ حد درجہ کا شغف رکھتے تھے۔

۲۔ حضرت ابن عمرؓ رسول کریمؐ کے قرابت دار تھے۔ ان کی ہمشیرہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضورؐ کی زوجۂ مطہرہ تھیں۔ اس لیے ان کو حضورؐ کے ساتھ ملنے جلنے کے بکثرت مواقع ملتے تھے۔

۳۔ یہ دنیوی اُمور اور دولت و ثروت کے حریص نہ تھے۔ صحابہ کے مابین جو لڑائیاں ہوئیں آپ ان میں غیر جانبدار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو حدیثیں سیکھنے اور ان کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے بڑا وقت ملا۔

متذکرہ صدر وجوہ و اسباب کے پیش نظر آپ کثیر الروایۃ صحابہ میں شمار ہوتے ہیں آپ سے ایک ہزار چھ سو تیس احادیث منقول ہیں۔ بخاری و مسلم ان میں سے ایک سو ستر احادیث روایت کرنے پر متفق ہیں۔ بخاری اکاسی احادیث روایت کرنے میں منفرد ہیں اور مسلم اکتیس روایات۔ باقی احادیث دیگر محدثین نے روایت کی ہیں۔

آپ نے ۷۳ھ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے تین ماہ بعد بعمر ستاسی سال وفات پائی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص: نام و نسب عبداللہ بن عمرو بن العاص کنیت ابو محمد اور نسبت قرشی سہمی ہے۔ اپنے والد سے پہلے مشرف باسلام ہوئے۔ بڑے عابد زاہد اور کثرت سے تلاوتِ قرآن کرنے والے تھے۔ حدیث نبوی کے ساتھ والہانہ لگاؤ تھا۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ میں عبداللہ بن عمرو بن العاص کے سوا کے سوا اور کوئی شخص مجھ سے بڑھ کر حدیثیں نہیں جانتا اس کی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ لکھ لیا کرتے تھے۔ اور میں لکھتا نہ تھا۔ (صحیح بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے عروہ بن زبیرؓ سے کہا، مجھے پتہ چلا ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص یہاں سے گزر کر حج کو جانے والے ہیں۔ ان سے مل کر دینی مسائل دریافت کیجیے۔ اس لیے کہ ان کے پاس رسول کریمؐ کی بکثرت احادیث محفوظ ہیں۔ ابن سعد مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو کے پاس ایک صحیفہ دیکھا جب اس کے بارے میں ان سے دریافت کیا تو کہا یہ "صادقہ" ہے۔ اس میں وہ احادیث محفوظ ہیں جو میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست بلاواسطہ سنی تھیں۔ (طبقات ابن سعد)

ابن سعد حضرت عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آیا میں وہ احادیث لکھ لیا کروں جو آپ سے سنتا ہوں؟ جب آپ نے اجازت مرحمت فرما دی تو میں نے لکھنے کا آغاز کر دیا۔ حضرت عبداللہ اپنے اس تحریر کردہ رسالہ کو "صادقہ" کہا کرتے تھے۔ (طبقات)

مندرجہ صدر امور سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضرت عبداللہ کے یہاں حدیث نبوی کے اخذ و تحمل کے متعدد اسباب جمع ہو گئے تھے جو دوسروں کو میسر نہ آئے تھے مثلاً یہ کہ آپ قدیم الاسلام تھے۔ احادیث نبویہ کو حفظ بھی کرتے تھے اور اپنے قلم کے

ساتھ تحریر بھی کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ سے منقول ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ایک ہزار حدیثیں روایت کیں۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ حضرت عبداللہؓ کی طرح حدیثیں لکھا نہیں کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات حضرت عبداللہؓ سے منقول احادیث کی نسبت کئی گنا ہیں۔ صحیح بخاری کی جو روایات ابوہریرہؓ سے منقول ہے۔ اس سے بھی مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کو زیادہ حدیثیں یاد تھیں۔ پھر ابوہریرہؓ کی مرویات حضرت عبداللہؓ کے مقابلہ میں کیوں کر زیادہ ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کی کثرت اور حضرت عبداللہؓ سے منقول احادیث کی قلت کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت عبداللہؓ تعلیم و تدریس کی نسبت زیادہ تر عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے۔ بخلاف ازیں حضرت ابوہریرہؓ نے اپنی زندگی اشاعتِ حدیث کے لیے وقف کر رکھی تھی۔

۲۔ اسلامی فتوحات کے بعد حضرت عبداللہؓ زیادہ تر مصر اور طائف میں قیام پذیر رہے ظاہر ہے کہ حدیث نبوی کے طلبہ کی اکثریت عازمِ مدینہ ہوا کرتی تھی۔ مصر میں طلبہ کی اتنی کثرت نہ تھی۔ بخلاف ازیں حضرت ابوہریرہ مدینہ میں سکونت گزیں رہ کر اشاعتِ حدیث اور فتویٰ کا مرکز بنے رہے۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے آٹھ سو تابعین نے حدیثیں روایت کیں۔ جب کہ دیگر صحابہ کو یہ سعادت حاصل نہ ہوئی

۳۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کے حق میں دعا فرمائی تھی کہ جو بات سنیں، انہیں یاد رہے اور بھولنے نہ پائیں۔

۴۔ حضرت عبداللہ کو ملک شام میں اہل کتاب کی چند کتابیں دستیاب ہوئی تھیں۔ وہ ان کو پڑھتے اور ان کے بعض جملوں کو خود یاد رکھتے اور دوسروں کو سناتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ائمہ تابعین آپ سے روایت کرنے سے احتراز کرتے تھے۔

ان اسباب کے پیش نظر جو احادیث آپ سے مروی ہیں وہ آپ کے علم کی وسعت وکثرت کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ چنانچہ آپ سے صرف سات سو احادیث منقول ہیں۔ بخاری ومسلم نے ان میں سے بالاتفاق سترہ احادیث روایت کی ہیں۔ ان میں سے بخاری میں آٹھ احادیث ہیں اور مسلم میں بیس روایات۔

حضرت عبداللہؓ سے بکثرت تابعین نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ مثلاً سعید بن المسیب وعروہ۔ عبدالرحمٰن کے دونوں بیٹوں ابوسلمہ اور حمید نیز مسروق وغیرہم۔ آپ نے ۶۳ھ میں مصر میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر بہتر سال تھی۔ یہ آنحضورؐ کی وفات کے بعد ترپن سال زندہ رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی کنیت ابو عبدالرحمٰن ہے ان کا نسب ہُذیل بن مدرکہ بن الیاس کے ساتھ مل جاتا ہے۔ ان کی والدہ کا نام اُمّ عبد بنت عبد وُدّ بن سواء ہُذیل ہے۔ یہ مشرف باسلام ہوئیں اور ہجرت کی سعادت حاصل کی۔ حضرت عبداللہ قدیم الاسلام تھے۔ یہ اس وقت اسلام لائے جب سعید بن زید مشرف باسلام ہوئے تھے۔ حضرت عمر بن الخطاب تاہنوز اسلام نہیں لائے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ خود فرمایا کرتے تھے۔

"میں چھٹا مسلمان تھا، ہمارے سوا روئے زمین پر اور کوئی مسلم نہ تھا۔"

آپ نے پہلے حبشہ اور پھر مدینہ ہجرت فرمائی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں غزواتِ بدر واُحد، خندق، بیعت الرضوان اور دیگر لڑائیوں میں شرکت کی۔ وہ عبداللہ ہی تھے جس نے غزوہ بدر میں ابوجہل پر حملہ کرکے اس کا سر کاٹ لیا تھا۔ آپ نے غزوۂ یرموک میں بھی شرکت کی سعادت حاصل کی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوتوں کی حفاظت کا شرف ان کے حصہ میں آیا تھا۔ جب حضورؐ اُٹھتے تو یہ آپ کو جوتے پہناتے۔ جب بیٹھ جاتے تو حضرت عبداللہ آپ کے جوتوں کو بغل میں دبا لیتے

رکھتے۔ یہ حضور کے یہاں بڑی کثرت سے آیا جایا کرتے اور آپ کی خدمت کیا کرتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی یمن سے آئے اور کچھ عرصہ قیام کیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی والدہ اس کثرت سے حضورؐ کے یہاں جایا کرتے تھے کہ ہم ان کو آپ کے اہل بیت میں شمار کرنے لگے۔ (بخاری و مسلم)

اسلام میں سبقت کرنے اور حضورؐ کے ساتھ ان کو جو دل بستگی تھی۔ اس کی بنا پر ان کا شمار کبار اور فضلا و فقہاء صحابہ میں ہوتا تھا۔ قرآن کریم اور حدیث و فتویٰ میں یہ دوسرے صحابہ پر فائق تھے۔ حتیٰ کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ماہرِ علوم قرآنیہ ہونے کی شہادت دی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا قرآن کریم چار صحابہ سے سیکھو۔ یعنی عبداللہ بن مسعودؓ سے سالم مولیٰ ابی حُذَیفہؓ اور معاذ بن جبلؓ اور اُبیّ بن کعبؓ رضی اللہ عنہم سے۔ (بخاری و مسلم)

نعمتِ خداوندی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کتاب اللہ کی کوئی سورت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں اُتری اور کس ضمن میں اُتری۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھ سے بڑھ کر قرآن کا کوئی عالم موجود ہے اور اُونٹ وہاں تک پہنچا سکتے ہیں تو میں سوار ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔" (صحیح مسلم)

کبار صحابہ حضرات عبداللہ کے علم و فضل کا اعتراف کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کے نام ایک خط میں لکھا۔

"میں نے عمارؓ کو تمہارا امیر اور عبداللہ بن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے۔ یہ دونوں رسول کریمؐ کے چیدہ اصحاب اور اہل بدر میں سے ہیں۔ ان کی پیروی کیجیے۔ عبداللہؓ کو تمہاری طرف بھیج کر میں نے تمہیں اپنی ذات پر ترجیح دی ہے۔"

حضرت عبداللہ کی عظمت و فضیلت کے اثبات میں حضرت عمرؓ سے بڑھ کر اور کس کی شہادت ہو سکتی ہے۔ خصوصاً آپ کا یہ قول کہ "تم کو اپنی ذات پر ترجیح دی ہے"، قابل غور ہے۔ حضرت عمرؓ وہ شخص ہیں جن کے قلب و زبان پر خدا نے حق کو جاری کر دیا تھا۔ وہ جب کسی رائے کا اظہار کرتے تو اس کی تائید میں قرآنی آیت نازل ہو جاتی۔ صاحب فضیلت کا قدر شناس وہی ہو سکتا ہے۔ جو خود بھی فضیلت کا حامل ہو۔ جب ابن مسعود نے وفات پائی تو حضرت ابوالدرداءؓ نے کہا۔

"ابن مسعودؓ نے اپنے بعد کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جو ان جیسا ہو"۔

ابن مسعودؓ سے بے شمار لوگوں نے حدیثیں روایت کیں۔ صحابہ میں سے مندرجہ ذیل کے اسما قابل ذکر ہیں۔ ابوموسیٰ اشعریؓ، عمران بن حصینؓ۔ ابن عباسؓ۔ ابن عمرؓ۔ جابرؓ۔ انسؓ۔ ابن زبیرؓ۔ ابوسعید خدری۔ ابوہریرہؓ۔ ابورافعؓ۔ تابعین میں سے علقمہ۔ ابووائل۔ اسود۔ مسروق۔ عبیدہ۔ قیس بن ابی حازم اور دیگر اکابر نے استفادہ کیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آٹھ سو اڑتالیس احادیث منقول ہیں۔ بخاری و مسلم نے چونسٹھ احادیث بالاتفاق روایت کی ہیں۔ بخاری اکیس احادیث کے روایت کرنے میں منفرد ہیں اور مسلم نے پینتیس احادیث روایت کی ہیں۔

حضرت عبداللہ جن صفات سے متصف تھے مثلاً قدامتِ اسلام اور طویل صحبت نبوی ان کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مذکورہ صدر احادیث سے زیادہ حدیثیں روایت کرتے۔ انہوں نے تمام عصر نبوت کو بچشم خود دیکھا اور آنحضور کی صحبت سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔ وہ حدیثیں یاد کرنے کے حریص بھی تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا حافظہ بھی بڑا قوی تھا۔ دنیوی ساز و سامان سے انہیں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ مگر رسول کریمؐ کے بعد وہ بہت کم عرصہ تک زندہ رہے اور جس طرح حضرت ابوہریرہؓ کو حدیثوں کی اشاعت کے لیے طویل مدت ملی تھی ان کو نہ مل سکی۔

حضرت ابن مسعودؓ نے ۳۲ھ میں ایک قول کے مطابق کوفہ اور دوسرے قول کے مطابق مدینہ میں بعمر ساٹھ سال سے کچھ زائد وفات پائی۔

روایت حدیث کے سلسلہ میں صحابہ میں فرق مراتب: صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حفظِ حدیث کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ مگر قلت وکثرت کے اعتبار سے سب صحابہ یکساں نہ تھے۔ اس کے کچھ تو خاص اسباب ہیں جو جداگانہ طور پر ہر صحابی کے تعارف کے سلسلہ میں معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ بخلاف ازیں کچھ اسباب عام ہیں جو ہم مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ خلافت سے متعلق امور اور غزوات میں مصروف رہنے کی وجہ سے بکثرت صحابہ نہ زیادہ حدیثیں اخذ کر سکے اور نہ ان کی اشاعت میں کما حقہٗ حصہ لے سکے۔ مثلاً خلفائے اربعہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم۔ جو لوگ ان مشاغل سے آزاد تھے۔ وہ حدیثوں کے اخذ وتحمل اور ان کی نشر واشاعت میں لگے رہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہؓ۔ عائشہؓ صدیقہؓ۔ ابن عمرؓ وغیرہم رضی اللہ عنہم۔

۲۔ جو صحابہ عرصہ دراز تک صحبتِ نبوی سے مستفید ہوتے رہے یا سفر وحضر میں ان کو حضورؐ کی رفاقت میسر آئی یا حضورؐ کی وفات کے بعد طویل مدت تک بقید حیات رہے ان کو حدیثیں یاد کرنے اور ان کو لوگوں میں پھیلانے کا مقابلتہً زیادہ موقع ملا۔ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ۔ ابوہریرہؓ۔ جابر بن عبداللہ۔ انس۔ ابن عمرؓ اور دیگر صحابہؓ۔ یہی وجہ ہے کہ جو صحابہ عہد رسالت ہی میں یا آپ کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد فوت ہوگئے تھے اور اس طرح ان کو حضورؐ کی رفاقت میں زیادہ عرصہ رہنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی۔ ان کی روایات یا قلیل ہیں اور یا نہ ہونے کے برابر ہیں۔

۳۔ کثرتِ روایت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب جدید مسائل وحوادث رونما ہوں اور ان کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر معلوم کرنے کی ضرورت درپیش ہو تو خود بخود

لوگ ایسے مسائل کا حل دریافت کرتے ہیں۔ ایسے اوقات میں صحابہ فی الفور احادیث نبویہ بیان کرتے اور لوگ بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ان کو قبول کرتے تھے۔

۴۔ جب اسلام میں فتنہ بازی کا ظہور ہوا اور بعض فرقے مثلاً شیعہ وخوارج حدیثیں وضع کرنے لگے تو لوگ حدیثیں روایت کرنے سے احتراز کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ راویانِ حدیث کے بارے میں تشدد برتا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کی مرویات بہت کم ہیں۔ محدثین حضرت علی کی مرویات صرف ابن مسعودؓ۔ عبیدہ سلمانی۔ قاضی شریح۔ ابووائل اور حضرت علیؓ کے اہل بیت ہی سے قبول کرتے ہیں۔ دوسرے راویوں کی روایات حضرت علی سے قبول نہیں کرتے۔

۵۔ پیروی کرنے والوں کی قلت وکثرت اور ان کی شہرت وگمنامی بھی روایت کی قلت وکثرت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی اکثر مرویات ہم تک نہیں پہنچیں۔ اس لیے کہ آپ کے اتباع وتلامذہ کم تھے۔ آپ کا زیادہ وقت امورِ خلافت کی انجام دہی غزوات اور قرآنِ عزیز کی جمع وتدوین میں گزرا۔

۶۔ کثرتِ روایت کی ایک وجہ قوتِ حافظہ اور احادیث کو تحریر میں لانا بھی ہے چنانچہ ابوہریرہؓ اس لیے کثیر الروایۃ تھے کہ آپ کا حافظہ قوی تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے کثیر الروایۃ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔

۷۔ بعض صحابہؓ اس لیے قلیل الروایۃ تھے کہ وہ زیادہ تر عبادت میں منہمک رہا کرتے تھے۔ بعض صحابہ کے قلیل الروایت ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی الفاظ میں روایت حدیث کو جائز تصور کرتے تھے۔ روایت بالمعنیٰ ان کے نزدیک ممنوع تھی۔

۸۔ قلتِ روایت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صحابی تک جو سند پہنچتی ہے وہ ضعیف ہو۔ اندریں صورت صحت کا التزام رکھنے والے محدثین اس صحابی کی حدیث روایت

نہیں کرتے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جن کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُمّت کا امین قرار دیا تھا، بخاری و مسلم میں ان کی روایت کردہ کوئی حدیث موجود نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو سند ان تک پہنچتی ہے۔ وہ صحیح نہیں۔

(معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۳۰)

کثیر الروایۃ صحابہ: یہ ہے خلاصہ اُن عوامل و محرکات کا، جو حضرات صحابہؓ کے سلسلہ میں قلت و کثرت روایت کے موجب بنے۔ اس لیے ان میں کثیر الروایۃ بھی تھے اور قلیل الروایت بھی۔ چنانچہ سب سے زیادہ حدیثیں حضرت ابوہریرہ نے روایت کیں۔ ان کے بعد عبداللہ بن عمر کا درجہ ہے۔ پھر انس بن مالک۔ پھر ابن عباس۔ پھر جابر بن عبداللہ۔ پھر ابوسعید خدری۔ پھر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم۔ ان کے علاوہ کسی اور صحابی نے ہزار سے زیادہ حدیثیں روایت نہیں کیں۔

امام محمد بن سعد طبقات میں رقمطراز ہیں:-

"محمد بن عمر اسلمی کا قول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر صحابہؓ سے کم احادیث منقول ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ابھی لوگوں کو ان سے دینی مسائل دریافت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ وہ عازمِ فردوس ہو گئے۔ حضرت عمرؓ و علیؓ سے زیادہ احادیث مروی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے تھے اور لوگ ان سے مسائل دریافت کرتے اور وہ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ یوں حضورؐ کے تمام صحابہ پیشوا تھے جن کی پیروی کی جاتی تھی۔ صحابہ جو کچھ کرتے تھے لوگ اس کو یاد رکھتے تھے۔ جب ان سے مسائلِ دینی دریافت کیے جاتے تو وہ ان کا جواب دیتے۔ صحابہ نے جو حدیثیں حضور سے سنیں، ان کو لوگوں تک پہنچایا۔

یہ درست ہے کہ اکابر صحابہ کی مرویات کی تعداد کم ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اکابر صحابہ:-

حضرت ابوبکر۔ عثمان۔ طلحہ۔ زبیر۔ سعد بن ابی وقاص۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ ابو عبیدہ

بن الجراح وسعید بن زید۔ اُبیؓ بن کعب۔ سعد بن ابی عبادہ۔ عُبادہ بن صامت۔ اُسید بن حُضیر۔ معاذ بن جبل وغیرہم رضی اللہ عنہم۔

عندرجہ صدر سے درج ذیل صحابہ کی نسبت بہت کم روایات منقول ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل نوجوان کثیر الروایت صحابہ:۔

حضرت جابر بن عبداللہ و ابوسعید خدری و ابوہریرہ و عبداللہ بن عمر بن الخطاب وعبداللہ بن عمرو بن العاص و ابن عباس و رافع بن خدیج و انس و براء بن عاذب اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اس لیے کہ عہد رسالت میں یہ نوجوان تھے اور حضورؐ کی وفات کے بعد عرصہ دراز تک زندہ رہے۔ اور لوگ ان سے دینی مسائل دریافت کرتے رہے۔ بعض صحابہ اپنا علم قبر میں اپنے ساتھ لے گئے اور کوئی چیز ان سے منقول ہو کر لوگوں تک نہ پہنچ سکی۔ ان سے مسائل دریافت کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی۔ کیونکہ دیگر بے شمار صحابہ موجود تھے۔ بعض صحابہ ایسے بھی تھے جن سے ایک حدیث بھی مروی نہیں۔ حالانکہ وہ بعض ان صحابہ کی نسبت جو کثیر الروایۃ ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت سے زیادہ مستفید ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ روایت حدیث سے بنا بر احتیاط احتراز کرتے تھے۔ یا اس لیے کہ دیگر صحابہ کی موجودگی میں ان سے فتویٰ لینے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ عبادت و جہاد میں حد سے زیادہ مشغول رہنے کی وجہ سے حدیثیں روایت نہ کر سکے ہوں۔

عدالتِ صحابہ پر وارد شدہ اعتراضات اور ان کا جواب

۱۔ سوال:۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ حضرات صحابہؓ کو جرح و تعدیل کے ترازو میں جانچے پرکھے بغیر ان کی روایت کردہ احادیث پر اعتماد کیوں کر کیا جاسکتا ہے؟ مزید برآں حضرت ابوبکر و عمر و علی رضی اللہ عنہم کا یہ طرزِ عمل کہ وہ کسی صحابی کی روایت کو اس صورت میں تسلیم کرتے تھے کہ جب وہ کسی صحابی کو گواہ کے طور پر پیش کرتا۔ یا اس روایت کی صداقت کا حلف اٹھا کر یقین دلاتا، اس امر کو واضح کرتا ہے کہ وہ دیگر راویانِ حدیث کی طرح صحابہ کی بھی جانچ پڑتال کرتے تھے۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم صحابہ رضوان اللہ علیہم کو رسالت و نبوت کے درجہ پر فائز نہیں کرتے کہ ان سے غلطی کا صدور ممکن ہی نہیں۔ بخلاف ازیں ان کے بارے میں ہمارا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ وہ اقامت فی الدین کے اس مرتبہ پر فائز تھے کہ ان کے بارے میں رسول کریمؐ پر افترا پردازی کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ وہ بات ہے جو قرآنِ عزیز، سنت صحیحہ اور قابل اعتماد مسلمانوں کے اجماع کی روشنی میں ثابت ہے۔ قرآن حکیم میں فرمایا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ	اور مہاجرین و انصار میں سے سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے نیکی کے کام میں ان کی پیروی کی، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

یہ آیت کریمہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اصحابِ رسول سے راضی ہے خواہ وہ سابقین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹے شخص سے راضی نہیں ہو سکتا۔ ہم قبل ازیں احادیث صحیحہ سے صحابہ کرام کے محامد و مناقب پر روشنی ڈال چکے ہیں۔

جہاں تک ان صحابہ کا تعلق ہے جو فتنوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ مثلاً طلحہ و زبیر و معاویہ و علی رضی اللہ عنہم ان لوگوں نے اجتہاد سے کام لیا تھا اور ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو حق پر خیال کرتا تھا۔ اور حق کے دفاع و حمایت کا فریضہ ادا کرتا تھا شریعت میں یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ مجتہد کو ہر حال میں اجر ملتا ہے۔ اس کا اجتہاد غلط ہو یا صحیح۔ البتہ اجتہاد درست ہونے کی صورت میں دو اجر ملتے ہیں اور غلط ہونے کی صورت میں ایک اجر۔ جن صحابہ نے بیعت الرضوان میں شرکت کی تھی۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ — اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت
اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ — کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے۔

جن صحابہ نے درخت کے نیچے حضورؐ کی بیعت کی تھی، ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو فتنوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مثلاً حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب صحابہ عدول ہیں اور ان میں فتنوں میں مبتلا ہونے والے صحابہ بھی شامل ہیں۔

جہاں تک خلفائے ثلاثہ یعنی حضرات ابوبکر و عمر و علی رضی اللہ عنہم کے طرز عمل کا تعلق ہے وہ بنا بر حزم و احتیاط تھا۔ اور اس وقت اختیار کیا جاتا تھا جب کہ راوی کے حفظ و ضبط میں شبہ ہو۔ اس کی صداقت و عدالت میں نہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ "میں آپ پر جھوٹ کی تہمت نہیں لگاتا۔ صرف تحقیق کرنے کا متمنی ہوں"۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی۔ کہ لوگ روایات کے قبول کرنے میں سہل انگاری سے کام نہ لینے لگیں۔

عصرِ حاضر میں کچھ قلمکار صحابہ کو بُرا بھلا کہنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔ مثلاً وہ حضرت معاویہ، عمرو بن العاص اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کو نشانۂ نقد و جرح بناتے ہیں۔ علمائے اسلام کی نگاہ میں یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"جو شخص اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی پر لعنت بھیجتا ہے مثلاً حضرت معاویہ، عمرو بن العاص یا ان سے افضل صحابہ مثلاً" ابوموسیٰ اشعری و ابوہریرہ یا ان سے بھی افضل صحابہ جیسے طلحہ و زبیر و عثمان و علی و ابوبکر و عمر و عائشہ رضی اللہ عنہم، وہ باتفاقِ اہلِ اسلام سزا کا مستوجب ہے۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ اسے قتل کی سزا دی جائے یا اس سے کم؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" میرے صحابہ کو گالی نہ دو، مجھے اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا"۔ اور لعنت تو گالی سے بھی قبیح تر ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "مومن پر لعنت کرنا اس کے قتل کے برابر ہے"۔ حضورؐ کے صحابہ سب سے بہتر مومن تھے۔ آپ نے خود فرمایا کہ "سب سے بہتر میرا زمانہ ہے۔ پھر اُن لوگوں کا جو ان کے قریب ہیں۔ پھر ان کا جو ان کے قریب ہیں"۔ جس شخص نے بھی حضورؐ کو دیکھا اور آپ پر ایمان لایا وہ صحابہؓ میں شامل ہے"۔

(مختصر الفتاویٰ ص ۴۷۸)

۲۔ سوال:۔ جب صحابہؓ بھی دیگر راویانِ حدیث کی طرح انسان ہیں اور ان سے سہو و نسیان کا صدور ممکن ہے تو ان کی روایتِ حدیث پر اعتماد کیوں کر کیا جا سکتا ہے؟

جواب:۔ یہ بات وہ شخص کہہ سکتا ہے جو اس امر سے ناآشنا ہو کہ صحابہ کی قوتِ حافظہ کس قدر مضبوط تھی اور حفاظتِ حدیث کے سلسلہ میں وہ دینی غیرت و حمیت کے جذبہ سے کس حد تک سرشار تھے۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرات

صحابہ نہایت قوی الحافظہ اور ذہین وفطین تھے اور ان کی ذہانت حدیث کے حفظ و ضبط میں ان کی مددگار ثابت ہُوا کرتی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ حدیث نبوی اصولِ دین میں سے ایک عظیم اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے وہ علمی مذاکرہ کی صورت میں اس کو ضبط کرتے اور درس وتدریس کے ذریعہ اس کو ذہن نشین کیا کرتے تھے۔

مزید برآں خلفائے راشدین نے روایتِ حدیث کے سلسلہ میں بڑا حکیمانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اس ضمن میں حزم واحتیاط کی ایک نئی روش ایجاد کی تھی۔ چنانچہ جب انہیں روایت حدیث کے سلسلہ میں شک رُونما ہوتا تو راوی سے گواہی طلب کرتے یہ جملہ عوامل ومحرکات حمایتِ حدیث کے موجب ہوئے اور صحابہ کثرتِ احادیث سے احتراز کرنے لگے۔ اس لیے کہ کثرت میں لغزش کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ صحابہ کے یہاں قلتِ سہو ونسیان کی وجہ یہی ہے اور خطا کا وجود تو ان کے یہاں معدوم ہے یا نادر۔ صحابہ کی یہ عادت تھی کہ جب بھول جاتے یا روایتِ حدیث میں غلطی کا امکان ہوتا تو دوسرے صحابی سے دریافت کرتے۔ جسے وہ حدیث بہت اچھی طرح یاد ہوتی۔

چنانچہ بعض احادیث میں جو اختلاف منقول ہے وہ روایت بالمعنیٰ کے قبیل سے ہے اور علمائے اسلام، صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین مثلاً امام ابوحنیفہ، شافعی اور حسن بصری نے اس کی اجازت دی ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو طبرانی نے اپنی معجم کبیر میں اور حافظ ابن مندہ نے "معرفۃ الصحابہ" میں بروایت سلیمان بن اکیمہ لیثی نقل کیا ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میں آپ سے حدیثیں سنتا ہوں۔ مگر انہیں اچھی طرح بیان نہیں کرسکتا بلکہ اس میں ایک آدھ حرف کی بیشی ہو جاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "جب تمہارے بیان سے کوئی حلال چیز حرام نہ ہوتی ہو۔ اور حرام چیز کی حلت لازم نہ آتی ہو اور تم میرا مفہوم ادا کرسکو تو کچھ حرج نہیں"۔ (طبرانی فی المعجم الکبیر)

۲۔سوال :۔سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث صحیح میں فرمایا" روز قیامت کچھ لوگ میرے حوض پر آئیں گے، پھر میرے اور ان کے درمیان حجاب حائل ہو جائیگا میں کہوں گا اے رب! یہ میرے صحابہ ہیں۔ مجھے کہا جائے گا، آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کچھ کیا؟ جب آپ ان سے الگ ہو گئے تو یہ دین اسلام سے برگشتہ ہو گئے" اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ بعض صحابہ حضورؐ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔لہذا صحابہ کو علی الاطلاق عدول قرار دینا درست نہیں۔

جواب :۔اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ صدر حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص صحابہ کا ذکر نہیں کیا گیا بخلاف ازیں اس حدیث میں چند منافقین کے خبث باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے جیسا کہ مذکورہ ذیل آیت ہیں۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنَافِقُوْنَ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ۔	اور آپ کے اردگرد جو دیہاتی ہیں۔ان میں منافق بھی ہیں اور اہل مدینہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔آپ ان کو نہیں جانتے ہم انہیں جانتے ہیں۔ہم انہیں دگنا عذاب دیں گے اور پھر انہیں ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔

منافقین جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے لڑائیوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے، مگر اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے نہیں بلکہ دیگر غایات و مقاصد کے پیش نظر۔مثلاً مال غنیمت حاصل کرنے یا مسلمانوں میں بزدلی پھیلانے کے لیے بظاہر ان لوگوں کو صحابہ میں شمار کیا جاتا تھا مگر دراصل یہ لوگ کافر تھے۔چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان لوگوں نے پوشیدہ کفر اور عداوت اہل اسلام کا اظہار ارتداد کی صورت میں کر ہی دیا تھا۔جہاں تک مخلص صحابہ کا تعلق ہے۔

ان میں سے ایک بھی مرتد نہیں ہوا اور سب کے سب مومن ہونے کی حالت میں فوت ہوئے۔

۴۔ حضرت ابوہریرہؓ: ارباب بدعت بہر دو صنف (قدیم وجدید) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ہدف تنقید بناتے رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ دراصل حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث سے گلو خلاصی کرانا ہے جو ان کی من مانی خواہشات میں حائل ہیں۔ اور ان کے مکر وفریب کا پردہ چاک کرتی ہیں۔ ان کی نقد وجرح یا تو روایات ضعیفہ پر مبنی ہے اور یا ان احادیث صحیحہ پر جن کو وہ صحیح طور سے سمجھ نہ سکے اور ان کی ایسی باطل تاویلات کیں جو ان کے نظریاتِ فاسدہ کے ساتھ ہم آہنگ تھیں ہم ان اعتراضات کا ذکر کر کے ان کا مختصر جواب دیں گے۔ تاکہ اس جلیل القدر صحابی کی حمایت ودفاع کا فریضہ ادا کیا جاسکے۔ وباللہ التوفیق۔

سوال:۔ ارباب بدعت کے حضرت ابوہریرہ کو ہدف تنقید بنانے کی ایک وجہ ان کی روایت کردہ وہ حدیث ہے جس کو بخاری نے باب حفظ العلم میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر دو باتیں یاد رکھی تھیں۔ ایک بات تو بیان کر دی اور اگر دوسری بیان کروں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے۔

منکرین حدیث کہتے ہیں اس حدیث سے یہ لازم آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بات جو وحی پر مبنی تھی تمام صحابہ سے پوشیدہ رکھی اور صرف ابوہریرہؓ کو بتائی۔ حالانکہ باتفاقِ اہل اسلام حضورؐ ایسا نہیں کرسکتے تھے۔

جواب:۔ حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہ راز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ابوہریرہؓ کو بتایا تھا اور کسی کو نہیں اور اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے۔

کہ حضورؐ نے خصوصی طور پر اس امر کا اظہار صرف ابوہریرہؓ پر کیا تھا تو اس سے اس وحی کا چھپانا لازم نہیں آتا جس کو لوگوں تک پہنچانے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:۔

”جس راز کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اس سے مراد وہ فتنے اور لڑائیاں ہیں جو لوگوں میں ہوئیں یا آگے چل کر ہوں گی۔“

ظاہر ہے کہ ہونے والی لڑائیوں اور فتنوں سے آگاہ کرنا کوئی ایسی بات نہیں، جس پر دین کے اصول و فروع موقوف ہوں۔ اس لیے حضورؐ اس قسم کی وحی کسی ایک شخص یا ایک فریق کو خصوصی طور پر بتلا سکتے ہیں۔

سوال:۔ حضرت ابوہریرہؓ کی صداقت بیانی پر شک وشبہ کا اظہار اس بنا پر بھی کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ حدیث رسول کریمؐ سے روایت کی کہ جو شخص حالت جنابت میں صبح کرے وہ روزہ نہ رکھے۔ حضرت ابوہریرہ اس حدیث کے مطابق فتویٰ بھی دیا کرتے تھے۔ جب حضرت عائشہؓ و امّ سلمہؓ کو یہ اطلاع پہنچی تو انہوں نے اسے بُرا مانا اور ذکر کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حالت جنابت میں صبح کرتے اور پھر غسل بھی کر لیا کرتے تھے اور آپ روزہ سے ہوتے تھے۔ یہ حدیث سُن کر حضرت ابوہریرہؓ نے اپنے نظریہ سے رجوع کر لیا۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ فضل بن عباس اور اسامہ بن زید نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر مجھے یہ حدیث بتائی تھی۔ مگر امہات المؤمنین ایسی باتوں کو مردوں سے بہتر جانتی ہیں۔

جواب:۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابوہریرہؓ نے یہ حدیث براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی تھی۔ بخلاف ازیں انہوں نے یہ حدیث فضل بن عباسؓ اور اسامہؓ سے اور انہوں نے نبی اکرمؐ سے سُنی۔ ظاہر ہے کہ حضرت فضل بن عباس اور اسامہ دونوں اہل صدق و امانت میں سے ہیں۔ مگر ابوہریرہؓ نے حضرت عائشہؓ و امّ سلمہؓ کی روایت کردہ

حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے اس کی طرف رجوع کیا اور حضرت فضل و اسامہ کی روایت کے مطابق فتویٰ دینا ترک کر دیا۔

جہاں تک حضرت فضل و اُسامہؓ کی روایت کردہ حدیث کا تعلق ہے، علماء نے اس کے کئی جواب دیے ہیں مثلاً

۱۔ یہ حدیث اپنے سے قوی تر حدیث کی معارض ہے۔ لہٰذا اس کو ترک کر کے حضرت عائشہؓ و اُمّ سلمہؓ کی روایت کردہ حدیث پر عمل کیا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ ارجح ہے

۲۔ حضرت فضلؓ و اسامہؓ سے مروی حدیث کا تعلق آغازِ اسلام سے ہے۔ جب کہ سو جانے کے بعد کھانے پینے اور مجامعت کی ممانعت تھی۔ بعدازاں طلوعِ فجر تک ان باتوں کی اجازت مل گئی۔ بنا بریں طلوعِ فجر تک مجامعت کی اجازت مل گئی۔ ظاہر ہے کہ جب طلوعِ فجر سے قبل جماع کیا جائے گا۔ تو غسل جنابت لازماً بعد از طلوعِ فجر ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ و اُمّ سلمہ کی روایت کردہ حدیث حضرت فضل و اُسامہ سے منقول حدیث کی ناسخ ہے۔ جب تک ابوہریرہؓ کو ناسخ کا علم نہ تھا وہ اپنی روایت کردہ حدیث کے مطابق فتویٰ دیتے رہے۔ جب ناسخ کا پتہ چل گیا تو اپنے فتوی سے رجوع کر لیا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس روایت سے حضرت ابوہریرہ کی مدح و منقبت کا پہلو نکلتا ہے کہ انھوں نے حق کا اعتراف کر کے اس کی طرف رجوع کر لیا۔

(فتح الباری ج ۴ ص ۱۲۸)

سوال: منکرین حدیث کہتے ہیں ابوہریرہؓ نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ "بیماری متعدی نہیں ہوتی"۔ ایک اعرابی نے کہا یا رسول اللہ! ایک اونٹ ریت میں ہرنی کی طرح (تندرست و توانا) ہوتا ہے۔ پھر ایک خارشی اونٹ اسے ملتا ہے اور اسے بھی خارش کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سُن کر فرمایا "پھر پہلے اونٹ کو خارش کی بیماری کہاں سے لگی؟"

دوسری جانب یہ حدیث بھی ابو ہریرہ ہی سے مروی ہے کہ بیمار مویشیوں کو تندرست چوپایوں کے پاس نہ لایا جائے اس لیے کہ بیماری کے متعدی ہونے کا خطرہ دامنگیر ہے۔

منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ مذکورہ صدر دونوں حدیثوں میں تناقض پایا جاتا ہے اس لیے کہ پہلی حدیث بیماری کے متعدی ہونے کی نفی کرتی ہے جب کہ دوسری حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں تناقض نہیں ہو سکتا۔ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ابو ہریرہؓ نے جھوٹ بولا (معاذ اللہ) دوسری یہ کہ وہ بھول گئے۔ اگر ان کو جھوٹا قرار دیا جائے تو ان کی مرویات پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا۔ اور اگر یہ کہیں کہ وہ بھول گئے تو یہ ان کی اس روایت کے خلاف ہے جس میں مذکور ہے کہ حضورؐ نے مجھے چادر پھیلانے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے اس میں کچھ پڑھا اور میں نے چادر سمیٹ لی۔ اس کے بعد مجھے کوئی چیز کبھی نہ بھولی۔"

جواب۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں حدیثوں میں سرے سے کوئی تعارض موجود ہی نہیں۔ جس حدیث میں مذکور ہے کہ "بیماری متعدی نہیں ہوتی" اس کا مطلب یہ ہے کہ بیماری بذاتِ خود اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر متعدی نہیں ہوسکتی۔ اور جس حدیث میں بیمار جانوروں کو تندرست مویشیوں کے پاس لانے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ وہ مویشی بیمار پڑ گئے تو ان کا مالک اس وہم میں مبتلا ہو جائے گا کہ اس کی وجہ ان بیمار مویشیوں کا اُن کے پاس لانا ہے۔ اس کا سدِ باب کرنے کے لیے بیمار مویشیوں کے پاس تندرست چوپایوں کو لایا ہی نہ جائے، تاکہ اس وہم کے پیدا ہونے کی گنجائش ہی نہ ہو۔ جب دونوں حدیثوں میں تناقض ہی موجود نہیں تو کذب اور نسیان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

البتہ یہ درست ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ بعض مجالس میں مذکورہ صدر دونوں حدیثیں بیان کر دیتے اور بعض مواقع پر صرف ایک حدیث ذکر کرتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے صرف

دوسری حدیث ذکر کی تو ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے حدیث "لاعدویٰ" (بیماری متعدی نہیں ہوتی) بھی روایت کی ہے۔ ابوہریرہؓ نے اسے بُرا مانا اور حبشی زبان میں اعتراض کنندہ پر لے دے کی۔ اس سے ابوسلمہ کو جس نے ابوہریرہ سے مذکورہ دونوں حدیثیں روایت کی تھیں، شک گزرا کہ ابوہریرہؓ نے اس مجلس میں حدیث "لاعدویٰ" اس لیے ذکر نہیں کی کہ آپ اسے بھول گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مجلس میں حضرت ابوہریرہؓ کے یہ حدیث ذکر نہ کرنے سے اس کا بھول جانا لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ ابوسلمہ نے سمجھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابوہریرہؓ حدیث بیان کرتے وقت سامعین کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے تھے۔ اور ان کے پیش نظر ان کو احادیث نبویہ سناتے تھے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں۔

"ممکن ہے کہ ابوہریرہؓ کا خیال یہ ہو کہ اس مجلس میں کوئی جاہل دونوں حدیثوں کو باہم متعارض خیال کرتا ہے۔ اس لیے آپ نے ایک حدیث ذکر نہ کی۔ جب اس بات کا خدشہ نہ ہوتا اس وقت آپ دونوں حدیثیں بیان کر دیتے۔" تفصیل کے لیے دیکھیے (فتح الباری کتاب الطب)۔

سوال:۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ابوہریرہ میں تدلیس کا عیب بھی تھا۔ چنانچہ ابوہریرہؓ رسول کریمؐ سے وہ احادیث بھی روایت کرتے تھے جو بذات خود انہوں نے آنحضورؐ سے نہیں سُنی تھیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ "جو شخص حالتِ جنابت میں صبح کرے اس کا روزہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ تدلیس بھی ایک قسم کا کذب ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ چونکہ بتاخیر ۷ھ میں مشرف باسلام ہوئے تھے۔ اس لیے بکثرت احادیث نبویہ حضورؐ سے براہ راست نہ سن سکے۔ اس لیے علم حدیث کی تکمیل کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان صحابہ سے وہ حدیثیں اخذ کرتے جو انہوں نے بلاواسطہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی تھیں۔ جس طرح دیگر صحابہ جو آنحضورؐ کی

مجالس میں شرکت نہ کر سکے تھے۔ انہوں نے بھی اکابر صحابہ ہی سے احادیث نبویہ کا درس لیا تھا۔ مجالسِ نبویہ سے غیر حاضر رہنے کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ دنیوی امور میں مشغول رہے یا اس لیے کہ وہ حد درجہ صغیر السن تھے یا اس لیے کہ وہ دیر سے مشرف باسلام ہوئے یا دیگر وجوہ و اسباب کے پیش نظر۔

اس کی دلیل جناب حُمید کی یہ روایت ہے کہ ہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا جو حدیثیں ہم تمہیں سنایا کرتے ہیں، وہ سب ہم نے رسول کریم سے نہیں سُنیں۔ مگر معاملہ یہ ہے کہ صحابہ ایک دوسرے کو جھوٹا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ (طبرانی فی الکبیر)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ تمام حدیثیں ہم نے نبی کریم سے نہیں سُنیں بلکہ حضورؐ کے صحابہ آپ سے حدیثیں سن کر ہمیں بتایا کرتے تھے۔ ہم تو اونٹ چرانے میں مشغول رہتے تھے۔ (مسند احمد و مستدرک حاکم)

امام حاکم نے ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث روایت کی ہے۔

"ہم سب صحابہ رسول کریم ہی سے حدیثیں نہیں سنا کرتے تھے ہماری زمینیں تھیں اور ہم کام کاج کیا کرتے تھے۔ مگر بات یہ تھی کہ ان دنوں لوگ جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ جو لوگ رسول کریم کی مجلس میں شریک ہوتے وہ غیر حاضر رہنے والوں کو آنحضورؐ کے اقوال سے آگاہ کر دیا کرتے تھے۔ امام حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کے شرائط کے مطابق صحیح ہے مگر دونوں نے اس حدیث کو روایت نہیں کیا۔ امام ذہبی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ نبی کریم سے براہ راست حدیث سننے والے صحابی کے نام کو حذف کر دینا تدلیس نہیں کہلاتا۔ اس لیے کہ سب صحابہ باجماع اہل حق عدول ہیں۔ حدیث مرسل سے احتجاج کرنے کے سلسلہ میں علما کا اختلاف اس لئے ہے کہ محذوف کا پتہ نہیں ہوتا

کہ وہ کون ہے (آیا صحابی ہے یا تابعی یا اور ؟) مگر یہاں معاملہ اس سے مختلف ہے۔

امام ابن الصلاح مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"صحابی کی مُرسل روایت حدیث موصول کے حکم میں ہے۔ اس لیے کہ حضرات صحابہؓ دوسرے صحابہ ہی سے روایت کرتے ہیں اور صحابیؓ کے نام کا معلوم نہ ہونا حدیث میں موجب قدح نہیں۔ اس لیے کہ سب صحابہ عدول ہیں۔ مثلاً حضرت ابن عباسؓ اور دیگر کم سن صحابہ نے جو احادیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ حالانکہ انہوں نے بذاتِ خود وہ احادیث آنحضورؐ سے نہیں سُنیں۔ یہ سب احادیث موصولہ کے حکم میں ہیں"۔ (مقدمہ ابن الصلاح)۔

امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں۔

"جہاں تک صحابہ کی مُرسل روایات کا تعلق ہے مثلاً صحابی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل پر روشنی ڈالے یا اس قسم کی کوئی روایت جس سے پتہ چلے کہ روایت کرنے والا صحابی صغیر السّن یا متاخّر الاسلام ہونے کی وجہ سے اس واقعہ کے وقت موجود نہ تھا۔ ایسی سب روایات مذہب صحیح کے مطابق درست اور قابل اعتماد ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے جمہور اصحاب کا فیصلہ یہی ہے۔ حتیٰ کہ مراسیل کو ضعیف قرار دینے والے محدثین بھی اس کے قائل ہیں۔ اور بخاری و مسلم میں اس قسم کی بکثرت احادیث موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک صحابی عموماً دوسرے صحابی ہی سے روایت کرتا ہے اور اگر کبھی روایت کرتا ہے تو اس کا اظہار کر دیتا ہے۔ صحابہ تابعین سے جو روایات کرتے ہیں۔ وہ احادیث مرفوعہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ یا تو اسرائیلیات کے قبیل سے ہوتی ہیں اور یا حکایات و اقوالِ تابعین"۔ (تدریب الراوی)

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے کذب کے صدور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ ایسی احادیث بیان

کرتے وقت یہ نہیں کہتے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے سُنا یا فلاں کام کرتے ہوئے دیکھا۔ بخلاف ازیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے یوں فرمایا یا یوں کیا۔ اس کو تدلیس نہیں کہتے۔ اس لیے کہ ابو ہریرہؓ جس راوی کو حذف کر دیتے ہیں وہ صحابہ میں سے ہوتا ہے اور صحابہ کی عدالت پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

سوال: منکرین حدیث نے یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابو ہریرہؓ کو روایتِ حدیث سے باز رکھتے ہوئے فرمایا "روایت حدیث سے باز رہو۔ ورنہ میں تمہیں تمہارے قبیلہ دَوس میں پہنچا کر چھوڑوں گا۔" حضرت عمرؓ کے اس رویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو ہریرہ جھوٹے تھے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

جواب ابو ہریرہؓ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ جو حدیث انہیں یاد ہو وہ دوسروں تک پہنچا دی جائے تاکہ وہ علم کے چھپانے کے مرتکب ثابت نہ ہوں۔ اس لیے وہ حدیثیں کثرت سے روایت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک ہی مجلس میں متعدد احادیث بیان کر دیا کرتے تھے۔ بخلاف ازیں حضرت عمر کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ لوگوں کو قرآن کریم میں مشغول رکھا جائے اور امکانی حد تک حدیثیں کم روایت کی جائیں اور اگر روایت کی بھی جائیں تو صرف وہ احادیث جن کا تعلق عملی زندگی کے ساتھ ہے۔ جن احادیث میں رخصتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیان نہ کی جائیں۔ مبادا لوگ ان پر بھروسہ کریں۔ اسی طرح ان احادیث کے ذکر و بیان سے احتراز کیا جائے جو عوام الناس کے لیے بالائے فہم و ادراک ہیں۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ کثرتِ روایت سے غلطی سرزد ہونے کا امکان ہے۔

چنانچہ انہی وجوہ و اسباب کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو کثرتِ روایت سے منع کیا۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہ صحابہ بھر میں کثیر الروایت تھے اس لیے ان کو سخت سست کہا۔ اور جلاوطن کرنے کی دھمکی بھی دی۔

حافظ ابن کثیر اسی پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ابو ہریرہؓ کو حدیثیں روایت کرنے کی اجازت دے دی تھی
حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو میرے حدیثیں روایت کرنے کی خبر پہنچی تو مجھے بلا بھیجا اور فرمایا جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں فلاں شخص کے گھر میں گئے تھے تو کیا آپ بھی اس موقع پر موجود تھے؟ میں نے عرض کی "جی ہاں! مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ مجھ سے یہ بات کیوں دریافت کر رہے ہیں۔" حضرت عمرؓ نے کہا، "بھلا بتائیے میں نے آپ سے یہ بات کیوں پوچھی ہے"؟ ابو ہریرہؓ نے کہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس روز فرمایا تھا "جو شخص مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھے وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے۔" حضرت عمرؓ فرمانے لگے "اچھا اب جائیے اور حدیثیں روایت کیجیے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۰۶) ۔

سوال :۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ابوہریرہ کو دیگر صحابہ کے مقابلہ میں زیادہ حدیثیں یاد نہ تھیں۔ کثرتِ روایت میں دیگر صحابہ پر فوقیت لے جانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابوہریرہ ہر اچھی بات کو رسول کریمؐ کی جانب منسوب کرنے کو جائز سمجھتے تھے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ بات حضورؐ نے فرمائی ہو یا نہ فرمائی ہو۔ بشرطیکہ وہ حلال وحرام امور سے تعلق نہ رکھتی ہو۔ مثلاً اخلاقِ حسنہ کی تلقین وترغیب اور جنت و دوزخ کے حالات وغیرہ۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ ابوہریرہ اس ضمن میں چند احادیث سے احتجاج کرتے ہیں جو انہی کی روایت کردہ ہیں۔ مثلاً رسول کریم نے فرمایا۔

۱۔ جب تم میری گفتگو کا مفہوم بیان کردو تو اصلی الفاظ تک محدود رہنے کی ضرورت نہیں۔ بشرطیکہ تم کسی حرام چیز کو حلال قرار نہ دو اور حلال کو حرام نہ ٹھہراؤ۔

۲۔ جب تمہیں میری کوئی حدیث سنائی جائے اور وہ حق کے موافق بھی ہو تو اسے لے لو خواہ میں نے اسے بیان کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

۳۔ میری جانب سے جو اچھی بات تم تک پہنچے اور میں نے وہ بات کہی نہ ہو تو یوں

سمجھو کہ وہ میری ہی بیان کردہ ہے۔

جواب :۔ متاخرالاسلام ہونے کے باوصف حضرت ابوہریرہ کی کثرتِ مرویات کی وہ وجہ نہیں جو منکرین حدیث نے بیان کی ہے۔ بخلاف ازیں اس کی وجہ یہ تھی کہ ابوہریرہؓ دنیوی مشاغل سے کٹ کر صرف نبی کریم کے دامن سے وابستہ ہو گئے تھے اور سفر و حضر میں آپ کے ساتھ شریک رہا کرتے تھے۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دعا فرمائی تھی کہ کوئی چیز انہیں بھولے نہیں۔ مزید برآں ابوہریرہؓ آنحضورؐ کی وفات کے پچاس برس بعد تک بقید حیات رہے اور اکابر صحابہ سے وہ حدیثیں اخذ کرتے رہے جو براہ راست آنحضور سے نہیں سنی تھیں۔

منکرین حدیث کا یہ کہنا کہ ابوہریرہ ہر اچھی بات کو آنحضورؐ کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ بشرطیکہ اس کا تعلق حلال و حرام اُمور کے ساتھ نہ ہو تو یہ کئی وجوہ کی بنا پر باطل ہے۔

۱۔ ابوہریرہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث خود روایت کی ہے کہ "جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے"۔ روایات سے ثابت ہے کہ ابوہریرہؓ جب کسی مجلس میں حدیث بیان کرنے لگتے تو پہلے یہ حدیث بیان کیا کرتے تھے۔

۲۔ صحابہ کرام حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات پر اعتماد کرتے تھے اور ان سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ ان میں مندرجہ ذیل صحابہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرات عمر و عثمان و علی و طلحہ و زُبیر و زید بن ثابت و ابو ایوب انصاری و ابن عباس و عائشہ و جابر و عبداللہ بن عمر و اُبیؓ بن کعب و ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۳ و تاریخ ابن کثیر ج ۸ ص ۱۰۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی صداقت و امانت پر صحابہ کا اجماع

منعقد ہو چکا ہے۔

۳۔حضرت ابوہریرہؓ سے جو احادیث مروی ومنقول ہیں وہ دیگر صحابہ نے بھی روایت کی ہیں۔

جن احادیث کو منکرین حدیث نے حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔پہلی حدیث کا تعلق روایت بالمعنیٰ کے ساتھ ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا جائز ہے۔ اس کو حضرت ابوہریرہؓ نے روایت نہیں کیا بلکہ یہ دیگر راویانِ حدیث کی روایت کردہ ہے۔

چنانچہ یعقوب بن عبداللہ بن سلیمان بن اُکیمہ لیثیؒ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں۔ کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا "یا رسول اللہ ہم آپ سے بہت سی باتیں سنتے ہیں۔ مگر جس طرح سنا ہوتا ہے۔ اس طرح بیان نہیں کر سکتے۔ اس بارے میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا جب اس سے کسی حرام چیز کی حلت اور حلال چیز کی حرمت لازم نہ آتی ہو اور تم میرا مفہوم اپنے الفاظ میں ادا کر سکو تو کچھ مضائقہ نہیں" (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۵۴ نیز طبرانی فی الکبیر وتدریب الراوی ص ۱۶۱)

۲-۳۔ دوسری اور تیسری حدیث گھڑ کر حضرت ابوہریرہؓ کی جانب منسوب کر دی گئی ہے پہلی حدیث کی سند میں اشعث بن براز راوی ہے جو کذّاب ہے۔ جس کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ دوسری حدیث کی سند میں عبداللہ بن سعید راوی مشہور کذّاب ہے۔

مشہور محدث امام ابن حزم فرماتے ہیں۔

"بعض لوگوں نے جو خدا سے نہیں ڈرتے، ایسی ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن سے اسلامی شریعت کا بطلان لازم آتا ہے اور بعض احادیث میں رسول کریم کی جانب

جھوٹ کی نسبت کی گئی ہے اور آپ پر جھوٹ باندھنا مباح قرار دیا گیا ہے۔ اس موقع پر ابن حزم نے مذکورہ صدر دونوں حدیثیں ذکر کر کے ان کا باطل ہونا واضح کیا ہے پھر ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے لیے یہی بات کافی ہے کہ یہ لوگ اپنے کاذب ہونے کا خود اعتراف کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث صحیح ہے کہ جس شخص نے میری طرف سے کوئی حدیث بیان کی جب کہ وہ جانتا بھی ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹوں میں سے ایک ہے۔" (الاحکام ج ۲ ص ۷۶)

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور حضرت ابوہریرہ: علامہ شیخ محمد عرفہ ممبر جمعیتہ کبار العلماء نے ازہر یونیورسٹی کے مجلہ "نور الاسلام" کی جلد پنجم میں ۶۳۹ صفحہ پر حضرت ابوہریرہ سے متعلق ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس میں اس جلیل القدر راوی کا دفاع کیا اور ان اتہامات کا جواب دیا ہے جو انگریزی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگاروں نے حضرت ابوہریرہ پر باندھے ہیں۔ ہم ذیل میں اس قیمتی مقالہ کا خلاصہ پیش کرتے ہیں

مستشرق گولڈ زیہر: مشہور مستشرق گولڈ زیہر نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد اول عدد ہفتم میں حضرت ابوہریرہ پر چند اتہامات باندھے ہیں جو کسی علمی و تاریخی دلیل پر مبنی نہیں ہیں۔ ان اتہامات کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوہریرہؓ حدیثیں روایت کرنے کے سلسلہ میں امانت و دیانت کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ گولڈ زیہر کا کہنا ہے کہ ابوہریرہؓ زہد و تقویٰ کے بل بوتے پر حدیثیں گھڑ لیا کرتے تھے۔ اور جو لوگ براہ راست اُن سے حدیثیں روایت کرتے تھے وہ بھی ان کی مرویات پر شک و شبہ کا اظہار کرتے تھے۔ بلکہ بالفاظ صحیح تر وہ ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔ ابوہریرہؓ کی یہ عادت تھی کہ معمولی باتوں کو بھی بڑے دلکش انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع شخص تھے۔ یہ

ابو ہریرہؓ کی خوش مذاقی ہی تھی، جو بہت سی دلچسپ کہانیوں کی موجب بنی۔ لطف یہ ہے کہ گولڈزیہر اپنی اسلام دشمنی پر پردہ ڈالنے کے لیے ان اتہامات کو اسلامی کتب کی جانب منسوب کرتا ہے۔ اس سے دراصل وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ یہ واقعات بجائے خود درست ہیں۔ ورنہ مسلم مصنّفین ان کو بیان نہ کرتے۔ اس کا یہ انداز بڑی گہری اور پُرفریب چال پر مبنی ہے۔ ہم انشاء اللہ العزیز اس کی بہت اچھی طرح پردہ دری کریں گے۔

اتہامات کی حقیقت: اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ، جن کی ذاتِ گرامی پر یہ کیچڑ اچھالا جاتا ہے نہایت جلیل القدر صحابی اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کو چھوڑ کر سب صحابہ میں کثیر الروایۃ مشہور تھے۔ ظاہر ہے کہ احادیث نبویہ کے بحرِ بیکراں حضرت ابو ہریرہؓ پر جرح و نقد کے یہ معنی ہیں کہ حدیث کے پورے ذخیرہ اور ابو ہریرہؓ کی تمام مرویات کو مشکوک ٹھہرایا جائے تاکہ اس سے لوگوں کا اعتماد اُٹھ جائے۔ اور یہ کوئی معمولی درجے کا فساد نہیں۔ اور اگر اس جرح و طعن میں صداقت کا کچھ بھی عنصر شامل ہوتا تو اس کو تسلیم کر لیا جاتا۔ مگر یہ طعن باطل ہے اور حق سے یکسر عاری۔

بقول امام بخاری حضرت ابو ہریرہؓ سے آٹھ سو اہل علم نے حدیثیں روایت کی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ ورنہ ان سے حدیثیں روایت نہ کرتے۔ سب صحابہ اور محدثین ابو ہریرہؓ کو ثقہ تسلیم کرتے رہے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں۔

"ابو ہریرہ مجھ سے بہتر ہیں اور جو حدیثیں وہ بیان کرتے ہیں انہیں خوب جانتے ہیں۔"

حضرت طلحہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، فرماتے ہیں۔

"اس میں شبہ نہیں کہ ابوہریرہ نے حضورؐ سے وہ حدیثیں سنیں جو ہم نہ سن سکے"۔

امام نسائی ذکر کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت زید بن ثابتؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر کوئی مسئلہ پوچھا۔ حضرت زیدؓ کہنے لگے کہ ابوہریرہؓ کے پاس جاؤ اور ان سے دریافت کرو" امام نسائی نے پورا واقعہ ذکر کیا ہے۔

بقول اہل علم و ثقات محدثین ابوہریرہؓ حد درجہ حافظ و ضابط تھے۔ امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ ابوہریرہ تمام راویانِ حدیث سے بڑھ کر حافظ ہیں۔ اعمش ابو صالح سے ذکر کرتے ہیں کہ ابوہریرہ تمام اصحابِ محمدؐ سے بڑھ کر حافظ حدیث تھے۔ مروان کا کاتب ابوزعیزعہ ذکر کرتا ہے کہ مروان نے ابوہریرہ کو بلایا اور وہ حدیثیں بیان کرنے لگے، میں ایک چارپائی کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا اور لکھتا جا رہا تھا۔ جب ایک سال گزرا تو مروان نے ابوہریرہ کو بلا کر ان احادیث کے بارے میں پوچھا اور مجھے تحریر کردہ احادیث کو دیکھتے رہنے کا حکم دیا۔ ابوہریرہ نے من و عن وہ حدیثیں سنا دیں اور ایک حرف کو بھی تبدیل نہ کیا۔

یہ ہیں ابوہریرہ کے بارے میں جلیل القدر محدثین کے نظریات۔ ان کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ جس کو یہ ثقہ قرار دے دیں اس کو کوئی مجروح نہیں ٹھہرا سکتا۔ اور جس کو نقد و جرح کے تیروں سے گھائل کر دیں کھوٹے سکے کی طرح کوئی اس کی توثیق نہیں کر سکتا۔ بھلا جو شخص (ابوہریرہؓ) ان اکابر کی مدح و توصیف سے بہرہ ور ہو چکا ہو، اس کو کسی مذمت کی کیا پروا۔ کیا خوب کہا کسی شاعر نے ؎

اِذَا رَضِيَتْ عَنِّيْ كِرَامُ عَشِيْرَتِيْ　　فَلَا زَالَ غَضْبَانًا عَلَيَّ لِئَامُهَا

(جب میرے قبیلہ کے بزرگ مجھ سے راضی ہو جائیں تو اس کے کمینوں کی ناراضگی کی مجھے کیا پروا)۔

ان مختصر تمہیدی سطور کے بعد اب ہم ان اعتراضات کی اصل حقیقت بے نقاب

کرتے ہیں۔

ا۔مستشرق مذکور کا یہ قول کہ کثرتِ روایت کی بنا پر ابوہریرہ سے روایت کرنے والے شکوک وشبہات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو بخاری کتاب فضائل الاصحاب حدیث نمبر ۱۱ میں مذکور ہے۔ اس میں مندرج ہے کہ "لوگ کہتے ہیں ابوہریرہ زیادہ حدیثیں بیان کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اپنا پیٹ بھر کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ رہا کرتا تھا۔ نہ لذیذ کھانے مجھے نصیب تھے نہ عمدہ کپڑا۔ نہ میرا کوئی خادم اور نوکر تھا۔ جب بھوک ستاتی تو میں پیٹ کے بل کنکریوں پر لیٹ جایا کرتا تھا۔"

ایک باانصاف آدمی مذکورہ صدر روایت سے سمجھ سکتا ہے کہ بعض لوگوں نے ابوہریرہؓ کے کثرتِ حفظ وروایت پر اظہارِ تعجّب کیا تھا۔ ابوہریرہؓ نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے وابستۂ دامن رہا کرتے تھے۔ انہیں مال ومتاع کی بجائے صرف حدیثیں جمع کرنے کا شوق دامنگیر تھا۔ جب بھوک ستاتی تو وہ کنکریوں پر لیٹ جاتے۔ تجارت ہو یا زراعت، انہیں رسول کریمؐ سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے دوسروں سے زیادہ حدیثیں یاد کریں اور حضورؐ سے وہ استفادہ کیا جس سے دیگر صحابہ قاصر رہے۔ جب ابوہریرہؓ نے یہ وجہ بیان کر دی تو اعتراض کرنے والے خاموش ہو گئے۔

اگر ہم مستشرق مذکور کی یہ بات تسلیم بھی کر لیں کہ وہ لوگ ابوہریرہؓ پر تعجب نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول کریمؐ کی وفات کے بعد ابوہریرہؓ سے حدیثیں اخذ کرنا کیوں نہ ترک کیا؟ حالانکہ ابوہریرہ اس کے بعد پچاس سال بقید حیات رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہؓ کی بیان کردہ وجہ سے وہ مطمئن ہو گئے تھے۔ اور ان کے شکوک وشبہات

زائل ہو گئے تھے۔ اگر ان کی مرویات میں انہیں کچھ شبہ ہوتا تو وہ ان کے اخذ کرنے سے باز رہتے۔ حالانکہ وہ رسول کریمؐ کی احادیث کے محافظ اور ان میں تدلیس و کذب کی آمیزش کو روکنے والے تھے۔

۲۔ جہاں تک گولڈ زیہر کے اس زعم باطل کا تعلق ہے کہ ابوہریرہؓ ایک ظریف الطبع آدمی تھے اور وہ معمولی معمولی باتوں کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرنے کے عادی تھے یہی وجہ ہے کہ بہت سی کہانیاں ان کے بارے میں مشہور ہو گئیں۔ ابن قُتَیبہ نے یہ دلچسپ واقعات بیان کیے ہیں۔" یہ بیان حد درجہ مبہم و مجمل اور گمراہ کن ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کہانیاں کیا ہیں؟ مستشرق مذکور کو چاہیے تھا کہ وہ کہانیاں بیان کرتا، تاکہ ہم ان پر غور و فکر کر سکتے۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ ابن قُتَیبہ نے یہ واقعات اپنی کس کتاب میں ذکر کیے ہیں۔ ابن قُتَیبہ ایک کثیر التصانیف عالم ہیں اور ان کی متعدد تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ اگر مستشرق مذکور امانت و دیانت سے کام لے کر ابن قتیبہ کی کتاب کا نام ذکر کر دیتا تو ہم اسے بتاتے کہ وہ ابن قُتَیبہ کی بات سمجھنے سے قاصر رہا۔ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ ابن قُتَیبہ اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" کے صفحہ ۴۸ پر پہلے تو جی بھر کر ابوہریرہ کی تعریف کرتا اور پھر بزعم گولڈ زیہر اس کی مذمت کرنے لگتا۔

۳۔ منکرین حدیث نے حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں ڈاکٹر اسپرنگر کا جو قول نقل کیا ہے کہ ابوہریرہؓ ورع و تقویٰ کے پیش نظر احادیث وضع کیا کرتے تھے۔ ہم اسپرنگر وغیرہ کے مزعومات باطلہ کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ تو خود صحابہ پر بہتان طرازی میں حد سے بڑھے ہوئے۔ ان کا مقصد وحید مسلمانوں کو گمراہ کرنا، دین میں انتشار پیدا کرنا، حقیقت کو مسخ کرنا اور اصلیت پر پردہ ڈالنا ہے۔ اسپرنگر کے اس طعن کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں اور یہ بلا دلیل و برہان ہے۔

اسپرنگر کا یہ کہنا کہ "ابو ہریرہ زہد و تقویٰ کی بنا پر حدیثیں وضع کیا کرتے تھے" ایک لایعنی گفتگو ہے۔ جس کا کوئی مطلب ومفہوم نہیں۔ اس لیے کہ زہد و تقویٰ تو لوگوں پر جھوٹ باندھنے سے بھی روکتا ہے۔ چہ جائیکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پردازی کی جائے۔ ابو ہریرہؓ رسول کریمؐ پر جھوٹ کیسے باندھ سکتے تھے، جب کہ وہ خود رسول کریمؐ کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ "جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے"۔

حضرت ابو ہریرہؓ جب حدیث روایت کرنے لگتے تو اس حدیث سے آغاز کرتے ظاہر ہے کہ جس شخص نے یہ حدیث نبی کریمؐ سے سُنی، اسے اچھی طرح یاد رکھا اور دوسروں تک پہنچایا بلکہ دوسروں کو یاد دلایا اور ہر مرتبہ روایتِ حدیث سے قبل وہ حدیث دوسروں کو سنائی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مومن بھی ہو اور زہد و تقویٰ سے بھی متصف ہو۔ عادۃً محال ہے کہ ایسا شخص رسول کریمؐ پر جھوٹ باندھے۔ دروغ گوئی میں مبالغہ آمیزی اور اس کو ایک دینی کام خیال کرنا تو بڑی بات ہے۔

ہم مستشرقین کا یہ قول کہ "اکثر احادیث جو ابو ہریرہؓ کی جانب منسوب ہیں، پچھلے تاریخی ادوار میں گھڑ کر ان کی جانب منسوب کی گئی ہیں"۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سی حدیثیں وضع کر کے حضرت ابو ہریرہؓ جیسے عظیم ترین محدثین کی جانب منسوب کر دی گئی تھیں۔ مگر نقاد حدیث نے ان میں سے ایک ایک موضوع حدیث کو چھانٹا اور کھوٹی کھری احادیث کو ممیّز و ممتاز کر دیا۔ اور اس طرح انہوں نے واضعین کے سب راستے مسدود کر دیئے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کے مصنّفین نے یہ کارنامہ کس لیے انجام دیا تھا؟ اگر ان کا مقصد یہ تھا کہ علوم اسلامیہ کو ان کی اصلی شکل وصورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو افسوس ہے کہ یہ مقصد بالکل پورا نہیں ہوا۔ اور اگر اس محنت و

کاوش کی غرض و غایت یہ تھی کہ اہل مغرب کے سامنے مسلمانوں کی تصویر قابل مذمت حالت میں کھینچی جائے۔ مسلمانوں کے عقائد میں انتشار و خلفشار پیدا کیا جائے۔ مسلم نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کیا جائے تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ مجموعہ بڑی حد تک اس غرض کو پورا کرتا ہے۔ (شیخ محمد عرفہ کا بیان ختم ہوا)

کلمتہ الختام: سابقہ بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ ارباب بدعت مستشرقین اعدائے دین اور ان کے زلہ ربا قدیم و جدید جاہل تلامذہ اصحاب رسولؐ کی تحقیر کر کے اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ احادیث نبویہ کے عظیم راوی حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ تو انہیں خاص عداوت ہے۔

عصر حاضر میں نام نہاد اہل علم اور بد اخلاق لوگوں کی ایک جماعت اٹھی ہے جنہوں نے سابقہ ادوار کے تمام عیوب و مطاعن کا کوڑا کرکٹ حضرات صحابہ پر بالعموم اور حضرت ابو ہریرہؓ پر ڈالنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ دین اسلام کے اس بلند پایہ ستون کو مسمار کر دیا جائے۔ وہ عظیم ستون رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت ہے۔ چنانچہ انہوں نے سابق الذکر اتہامات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس پر جھوٹ کا طومار باندھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ہم ان اعتراضات کا ذکر کر کے ان کا مختصر جواب پیش کرتے ہیں۔

۱۔ مستشرقین اور ان کے جاہل تلامذہ کا دعویٰ ہے کہ ابو ہریرہؓ کو دین سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف دنیا کی خاطر مشرف باسلام ہوئے تھے۔ حالانکہ ابو ہریرہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتے تھے اور سب کاموں کو چھوڑ کر انہوں نے اپنی زندگی علم و عبادت جہاد فی سبیل اللہ اور دین کی تبلیغ و دعوت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس سے ان کے دعویٰ کی تکذیب ہوتی ہے۔

۲۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ابو ہریرہؓ کو علم فقہ میں چنداں مہارت حاصل نہ تھی۔ یہ

تاریخ اسلام پر ایک عظیم دھبہ ہے۔ اس لیے کہ واقعہ اس کے خلاف تھا۔ ابن سعد طبقات میں لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ مثلاً ابن عباس، ابن عمرؓ، ابوسعید خدری، ابوہریرہ عبداللہ بن عمرو بن العاص، جابر رافع بن خدیج، سلمہ بن اکوع، ابو واقد لیثی اور عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہم حضرت عثمان کی شہادت سے لے کر اپنی وفات تک مدینہ منورہ میں حدیثیں روایت کرتے اور فتویٰ دیتے رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اکابر صحابہ و تابعین کی موجودگی میں تیئس سال تک مدینہ میں فتویٰ دیتے رہے۔ (طبقات ابن سعد)

امام ابن قیمؒ نے مفتی صحابہ کا ذکر کیا اور بتایا ہے کہ ان میں زیادہ فتویٰ دینے والے بھی تھے اور کم فتویٰ دینے والے بھی۔ بعض صحابہ فتویٰ دینے میں متوسط درجہ کے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کو انہوں نے متوسط فتویٰ دینے والوں اور حضرت ابوبکر و عثمان و ابوسعید خدری و اُمّ سلمہ و ابوموسیٰ اشعری و معاذ بن جبل و سعد بن ابی وقاص و جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کے زُمرہ میں شامل کیا ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ ابوہریرہؓ فقیہہ نہ تھے وہ خود فقہ سے عاری ہے۔ (اعلام الموقعین ج ا ص ۹)

۳۔ مستشرقین کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو بحرین کا عامل مقرر کیا۔ پھر آپ کو پتہ چلا کہ ابوہریرہ نے خیانت کی ہے۔ چنانچہ آپ نے ان کو معزول کر دیا۔ ان کے پاس جو مال تھا، وہ لے لیا اور ران کو اس قدر پیٹا کہ خون بہنے لگا۔

یہ اس شخص کا قول ہے جو مؤرخین کے تیئے جھوٹے اقوال جمع کرنے کا عادی ہو۔ اور حق و باطل میں تمیز کرنے سے اسے کوئی سروکار نہ ہو۔ اصل واقعہ صرف اتنا تھا کہ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو بحرین سے طلب کر کے پوچھا کہ یہ مال آپ نے کہاں سے حاصل کیا؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا میرے پاس کچھ گھوڑیاں تھیں ان کی نسل میں افزائش ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ تنخواہیں جمع ہو گئیں۔ باقی ماندہ مال میرے

غلام کی کمائی کا ہے تحقیق کرنے پر حضرت عمرؓ نے اسے درست پایا۔ پھر آپ نے دوبارہ ابوہریرہؓ کو بحال کرنا چاہا مگر وہ نہ مانے۔ حضرت عمر نے فرمایا "ملازمت تو آپ سے بہتر شخص (حضرت یوسفؑ) نے بھی طلب کی تھی"۔ ابوہریرہؓ کہنے لگے "وہ تو حضرت یوسف علیہ السلام تھے جو خود نبی بھی تھے اور نبی زادہ بھی تھے۔ اور میں اُمیمہ کا بیٹا ابوہریرہ ہوں"۔

اس واقعہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دیگر عُمال کی طرح حضرت عمرؓ نے ابوہریرہ کا محاسبہ کیا تھا اور تحقیق کرنے پر ابوہریرہؓ پہ جو الزام تھا، وہ غلط ثابت ہوا۔ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو جو دوبارہ بحال کرنا چاہا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی سیرت بے داغ تھی حضرت عمر آپ پر اعتماد کرتے تھے۔ اور آپ کو امین خیال کرتے تھے۔

۴۔ مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ جب حضرت علیؓ و معاویہؓ کے مابین فتنہ بپا ہوا۔ ان دنوں ابوہریرہؓ نماز حضرت علیؓ کے ساتھ پڑھتے تھے اور کھانا حضرت معاویہؓ کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔ جب میدانِ کارزار گرم ہو جاتا تو پہاڑ میں چھپ کر پناہ لیتے جب ابوہریرہؓ سے اس کی وجہ پوچھی جاتی تو کہتے علیؓ بہتر عالم ہیں اور معاویہؓ کے یہاں کھانا لذیذ ملتا ہے۔ اور امن و سلامتی پہاڑ کے دامن ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ واقعہ سراسر بہتان ہے اور جھوٹ ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت ابوہریرہ فتنہ کے زمانہ میں الگ تھلگ رہے اور مدینہ منورہ سے باہر نہ گئے۔

۵۔ منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ ابوہریرہؓ بنو اُمیہ کے حامی تھے اور حضرت علیؓ کی مذمت میں حدیثیں وضع کر کے منعنِ وضع لیا کرتے تھے۔ بخلاف ازیں صحیح تاریخ سے اس امر کا اثبات ہوتا ہے کہ ابوہریرہؓ نے حضرت علیؓ اور اہل بیت کی مدح و توصیف میں حدیثیں روایت کی ہیں۔ چنانچہ مسند احمد اور مجمع الزوائد میں یہ احادیث مذکور ہیں۔ حضرت حسنؓ کو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ میں دفن کرنے کا سوال اُٹھا

تو اس وقت مروان کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کو جو واقعہ پیش آیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کے ساتھ ان کو کس قدر والہانہ محبت تھی۔ مورخ ابن کثیر نے یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ (البدایہ ج ۸ ص ۱۰۸)

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابوہریرہؓ نے حضرت علی کی مذمت میں جو حدیثیں وضع کی تھیں وہ کہاں گئیں اور کن ثقہ راویوں نے ان کو نقل و روایت کیا؟ اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان احادیث کا وجود ان لوگوں کے دماغ کے سوا اور کہیں نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے جو احادیث صحیح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں، ان میں حضرت علیؓ کی مذمت نہیں پائی جاتی۔ بخلاف ازیں ان میں بعض اموی حکام کے مظالم کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

مثلاً یہ حدیث کہ "میری اُمت کی تباہی چند قریشی لڑکوں کے ہاتھوں انجام پذیر ہوگی۔" مروان نے یہ حدیث سن کر کہا غِلْمَۃٍ (لڑکوں کے ہاتھوں) ابوہریرہؓ نے کہا "اگر آپ چاہیں تو میں ان کے نام تک بتا دوں"۔ دوسری حدیث میں ہے، کہ قریش کا یہ گروہ لوگوں کی تباہی کا موجب ہوگا۔ لوگوں نے عرض کی پھر آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا کہ کاش آپ ان سے الگ تھلگ رہیں"۔

اس حدیث میں اُمرائے بنو اُمیہ کی جانب اشارہ کر کے ان سے الگ رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ ابوہریرہؓ یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ تعالیٰ میں ۶۰ھ اور بچوں کی امارت و خلافت سے تیری پناہ چاہتا ہوں چنانچہ ان کی یہ دعا بارگاہِ ربانی میں مقبول ہوئی اور آپ ساٹھ ہجری سے پہلے ۵۹ھ میں عازمِ فردوس ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یزید ۶۰ھ میں والی بنا تھا اور اس کے دور میں نہایت بدترین واقعات ظہور پذیر ہوئے۔

محدث حاکم و ابوہریرہؓ: مشہور محدث امام حاکم نے اپنی کتاب "المستدرک"

میں حضرت ابو ہریرہؓ کی مدح و توصیف میں ایک نہایت قیمتی فصل منعقد کر کے بکثرت احادیث نقل کی ہیں۔ جن سے ان کی عظمت و فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ امام حاکم نے اس فصل کو اپنے استاد محترم ابو بکر کے مندرجہ ذیل نظریات پر ختم کیا ہے۔ چنانچہ جناب ابو بکر فرماتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی احادیث کو رد کرنے کے لیے وہ شخص گفتگو کرتا ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے اندھا کر دیا ہو اور وہ احادیث کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہو۔ یا تو وہ شخص فرقہ جہمیہ معطلہ میں سے ہوگا جو اپنے نظریہ کے خلاف ابو ہریرہؓ کی مرویات سُن کر ان کو گالیاں دے گا اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرے گا کہ یہ احادیث قابل احتجاج نہیں ہیں۔

یا وہ شخص خارجی ہوگا جس کے نزدیک ساری اُمّت محمدی واجب القتل ہے اور کسی خلیفہ و امام کی اطاعت ضروری نہیں۔ ایسا شخص جب اپنے گمراہانہ عقائد کے خلاف حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث کو دیکھے گا اور کسی دلیل و برہان سے ان کا جواب نہ دے سکے گا۔ تو فی الفور ابو ہریرہؓ کو بُرا بھلا کہنے لگے گا۔

یا وہ شخص قدریہ (منکرین تقدیر) میں سے ہوگا۔ جن کا اسلام اور اہل اسلام سے کچھ تعلق نہیں اور جو تقدیر کا عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں۔ ایسا شخص جب اثباتِ تقدیر کے مسئلہ سے متعلق ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث دیکھے گا تو اپنے مبنی بر کفر عقیدہ کی تائید و حمایت میں اسے کوئی دلیل نہ ملے گی تو وہ کہے گا کہ ابو ہریرہؓ کی مرویات استناد و احتجاج کے قابل نہیں۔

یا وہ شخص جاہل ہوگا جو جہالت کے باوجود فقہ دانی کا مدعی ہے۔ اس شخص نے جس امام کی تقلید کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا ہوا ہے جب اس کے خلاف ابو ہریرہؓ کی

مرویات دیکھے گا تو ان کی تردید کرنے لگے گا۔ اور ابوہریرہ کو مطعون ٹھہرائے گا۔ لیکن جب ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث اس کے امام کے مسلک سے ہم آہنگ ہوں گی تو اس وقت وہ ان کو اپنے مخالفین کی تردید میں استعمال کرے گا۔ (المستدرک ج ۳ ص ۵۰۶)

اکابر صحابہ جنھوں نے ابوہریرہ سے روایت کی:

امام حاکم فرماتے ہیں کہ مندرجہ ذیل اکابر صحابہ نے حضرت ابوہریرہ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ زید بن ثابت۔ ابوایوب انصاری ابن عباس۔ ابن عمر۔ عبداللہ بن زبیر۔ اُبی بن کعب۔ جابر۔ عائشہ۔ مسور بن مخرمہ۔ عقبہ بن حارث۔ ابوموسیٰ اشعری۔ انس بن مالک۔ سائب ابن یزید۔ ابورافع مولیٰ رسول اللہ ابوامامہ بن سہل۔ ابوالطفیل۔ ابونضرہ غفاری۔ ابورہم غفاری۔ شداد بن الہاد۔ ابوحدرد۔ عبداللہ بن حدرد اسلمی۔ ابورزین عُقیلی۔ واثلہ بن اسقع۔ قبیصہ بن ذویب۔ عمرو بن الحمق۔ حجاج اسلمی۔ عبداللہ بن عکیم۔ الاغر الجہنی۔ شرید بن سوید رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد اٹھائیس تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں تک تابعین کا تعلق ہے۔ ان میں کوئی بھی ابوہریرہؓ کے اصحاب و تلامذہ سے بڑھ کر عالم اور مشہور تر نہ تھا۔ ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان سب کا ذکر طوالت کا موجب ہے۔ خداوند کریم ہمیں رسول کریمؐ، ان کے صحابہ، تابعین اور سب ائمۂ دین کی مخالفت سے محفوظ رکھے۔" (امام حاکم کا کلام ختم ہوا)

اس پر جس قدر تاسف کا اظہار کیا جائے کم ہے کہ کچھ نوخیز مدعیانِ اسلام جو علم کے ذوق سے آشنا ہیں اور نہ اسلام کے قدرشناس، رسول کریم کے اصحاب کی مذمت کر کے بزعم خویش اسلام کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ ان کا کام

صرف دولت جمع کرنا ہے اور بس۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ حضرت ابوہریرہؓ پر یہ بہتان طرازی کرتے ہیں کہ وہ حضرت معاویہؓ سے معاوضہ لے کے حضرت علیؓ کی مذمت میں حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔

دوسری جانب ان کا اپنا یہ حال ہے کہ عیسائی مشنریوں سے بھاری تنخواہیں وصول کر کے ان کے کاموں میں تعاون کر رہے ہیں۔ اور یہ صرف اس بات کا صلہ ہے کہ دین اسلام کو ہدفِ تنقید بنایا جائے اور علمائے اسلام کی تحقیر و تذلیل کی جائے۔

قرآن عزیز میں فرمایا۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا۔	اور جو شخص غلطی یا گناہ کا مرتکب ہو۔ پھر کسی بے گناہ کو اس سے متہم کر دے تو اس نے بہتان تراشا اور بڑا بھاری گناہ اٹھایا۔

اکابر تابعین کا تعارف

خطیب بغدادی لکھتے ہیں۔

تابعی کی تعریف: "تابعی اس شخص کو کہتے ہیں جو صحابی کی صحبت میں رہا ہو۔ صرف صحابی کی ملاقات کافی نہیں ہے۔ البتہ صحابی ہونے کے لیے آنحضور کی صرف ملاقات ہی کافی ہے۔ اس لیے کہ حضور اکرم کی عظمت وفضیلت کی بنا پر آپ کی ایک ہی ملاقات سے وہ قلبی نور حاصل ہو سکتا ہے جو صحابی اور دیگر صالحین کی طویل صحبت سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔"

اکثر محدثین کے نزدیک تابعی وہ ہے جو صحابی سے ملا ہو۔ اگرچہ اسے ان کی صحبت میں رہنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔ اسی لیے امام مسلم اور ابن حبان نے "اعمش" کو طبقہ "تابعین میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ وہ صحابہ سے مل کر ان سے استفادہ کر چکے تھے اعمش نے حضرت انس بن مالک رض کو دیکھا تھا۔ اگرچہ ان سے کوئی حدیث نہیں سُنی تھی اسی طرح حافظ عبدالغنی نے یحییٰ بن ابی کثیر کو تابعین میں شمار کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ حضرت انس رض سے مل چکے تھے۔ موسیٰ بن ابی عائشہ کو بھی تابعی شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ حضرت عمرو بن حُریث رض سے مل چکے تھے۔

محدث ابن حبان نے ملاقات کے ساتھ ساتھ تمیز کی عُمر کو پہنچنے کی شرط بھی عائد کی ہے۔ لہٰذا اگر چھوٹی عمر کا ہو اور کسی بات کو یاد نہ رکھ سکتا ہو تو اس کے صحابی کو دیکھنے کا کچھ اعتبار نہیں۔ مثلاً خلف بن خلیفہ کو اتباع تابعین میں شمار کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس نے عمرو بن حُریث صحابی کو دیکھا تھا۔ اس لیے کہ ان کی عمر اس وقت چھوٹی تھی۔ اور کسی کو جان پہچان نہ سکتے تھے۔ امام عراقی کہتے ہیں کہ محدث ابن حبان کی بات

معقول ہے۔ اسی طرح ابن حبان نے صحابی کے لیے بھی یہ شرط لگائی ہے کہ اس نے سِنِ تمیز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔ عراقی کہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے صحابہ و تابعین کی جانب یہ کہہ کر اشارہ فرمایا کہ "اس شخص کے لیے بشارت ہے جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا۔ اور اس شخص کے لیے بھی بشارت ہے جس نے مجھے دیکھنے والے کو دیکھا۔" اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔

(تدریب الراوی ص ۲۱۲)

تابعین کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ اس لیے کہ وہ بہت زیادہ تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مختلف بلاد و دیار میں پھیل گئے تھے اور جو شخص بھی ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ملا وہ تابعی ہے۔ اس لیے تابعین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مشہور تابعین حسب ذیل ہیں:۔

تابعین مدینہ

تابعین مدینہ میں سے مشہور ترین راوی حسب ذیل ہیں۔

اسماء تابعین	سال وفات
سعید بن المسیّب	۹۳ ہجری
عُروہ بن زُبیر	۹۴ "
ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام	۹۴ "
عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ	۹۹ "
سالم بن عبداللہ بن عمر	۱۰۶ "
سلیمان بن یسار	۹۳ "
قاسم بن محمد بن ابی بکر	۱۱۲ "
نافع مولیٰ ابن عمر	۱۱۷ ہجری
ابن شہاب زہری	۱۲۴ "
ابوالزناد	۱۳۰ "

تابعین مکہ

مکہ کے مشہور تابعین راوی حسب ذیل تھے

اسمائے تابعین	سال وفات
عکرمہ مولیٰ ابن عباس	۱۰۵ ہجری
عطا بن ابی رباح	۱۱۵ "
ابوالزبیر محمد بن مسلم	۱۲۸ "

تابعین کوفہ

اسمائے تابعین	سال وفات
شعبی عامر بن شراحیل	۱۰۴ "

اسمائے تابعین	سال وفات	اسمائے تابعین	سال وفات
ابراہیم نخعی	۹۶ ہجری	قبیصہ بن ذُویب	۸۶ ہجری
علقمہ بن قیس بن عبداللہ نخعی	۶۲ "	کعب الاحبار	۳۲ "
تابعین بصرہ		**تابعین مصر**	
حسن بن ابوالحسن بصری	۱۱۰ "	ابوالخیر مرثد بن عبداللہ الیزنی	۹۰ "
محمد بن سیرین	۱۱۰ "	یزید بن ابی حبیب	۱۲۸ "
قتادہ بن دعامہ دوسی	۱۱۷ "	**تابعین یمن**	
تابعین شام		طاؤس بن کیسان یمانی	۱۰۶ "
عمر بن عبدالعزیز	۱۰۱ "	وہب بن مُنَبِّہ	۱۱۰ "
مکحُول	۱۱۸ "		

کتب رجال میں تابعین اور ان کے شیوخ و تلامذہ کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ ہم چند ایک تابعین کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

ابن شہاب زہری: نام و نسب محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب بن عبداللہ بن حارث بن زُہرہ القرشی الزہری المدنی۔ آپ دیارِ شام میں بود و باش رکھتے تھے۔ آپ زُہری کے نام سے مشہور تھے۔ پردادا کی جانب نسبت کر کے ان کو ابن شہاب بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کو صغار تابعین کے طبقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

ابن شہاب زہری نے حضرت انس بن مالک و سہل بن سعد و سائب بن یزید و شنیب ابوجمیلہ و عبدالرحمٰن بن ازہر و ربیعہ بن عباد و محمود بن ربیع و ابوالطفیل و دیگر صحابہ سے حدیث نبوی کا درس لیا۔ آپ نے کبار تابعین سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ تابعین کبار و صغار اور اتباع تابعین اور ان کے شیوخ نے بھی آپ کے

خرمنِ علم کی خوشہ چینی کی۔ تمام علماء ان کی امامت فی الحدیث کثرتِ حفظ وضبط اور ان کی ثقاہت و امانت پر متفق اللسان ہیں۔ محدثین سے ان کی مدح و توصیف میں اس قدر اقوال منقول ہیں کہ ان کو آسانی کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

عمرو بن دینار فرماتے ہیں۔

"میں نے زہری سے بہتر حدیث روایت کرنے والا نہیں دیکھا۔"

ابراہیم بن سعد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں۔

"میں نے اپنے والد سے دریافت کیا۔ زہری کس لیے تم پر فوقیت لے گئے؟ فرمانے لگے وہ مجالس میں پیچھے سے چھپ کر داخل نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ سامنے سے آتے تھے۔ مجلس میں کوئی نوجوان یا ادھیڑ عمر کا یا بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورت نہیں ہوا کرتی تھی۔ جس سے وہ دینی مسائل دریافت نہ کرتے ہوں۔ حتیٰ کہ جو عورتیں پس پردہ ہوتی تھیں۔ ان سے بھی پوچھتے ہوئے نہ جھجکتے۔"

لیث بن سعد فرماتے ہیں۔

"میں نے ابن شہاب زہری سے بڑھ کر جامع اور کثیر العلم شخص کبھی نہیں دیکھا۔"

امام بخاری اپنے استاد امام علی بن المدینی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "زہری کو دو ہزار احادیث یاد ہیں۔"

احمد بن فرات کا قول ہے۔

"امام زہری کی سند سب سے بڑھ کر ہے۔"

زہری بڑے ذہین و فطین تھے اور آپ کا حافظہ بلا کا تیز تھا۔ امام بخاری اپنی تاریخ میں روایت کرتے ہیں کہ زہری نے اسّی راتوں میں قرآن کریم حفظ کیا تھا۔ زہری خود کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنے حافظہ میں کوئی چیز نہیں رکھی جس میں اس

نے خیانت کی ہو (جو مجھے بھول گئی ہو)۔ سعد بن ابراہیم کہا کرتے تھے کہ "رسول کریم ؐ کے بعد کسی شخص نے زہری جیسا ذخیرۂ علم جمع نہیں کیا۔"

امام زہری نے حفظ حدیث کے ساتھ ساتھ حدیث نبوی کی جمع و تدوین میں بھی حصہ لیا تھا۔ اس سلسلہ میں آپ اپنے جملہ معاصرین سے سبقت لے گئے۔

صالح بن کیسان فرماتے ہیں۔

"میں اور زہری دونوں طالب علم تھے زہری کہنے لگے آؤ احادیث نبویہ تحریر کریں چنانچہ ہم نے حدیثیں لکھیں۔ پھر کہنے لگے، آیئے اقوال صحابہ بھی لکھ لیں۔ پھر زہری نے اقوال صحابہ تحریر کر لیے۔ مگر ہم نے نہ کیے۔ اس لیے وہ تو کامیاب ہوئے اور ہم ناکام رہے۔"

ابن شہاب اولین شخص تھے جس نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں ان کے حکم سے حدیثیں جمع کیں۔ خلاصہ یہ کہ امام زہری کثرت علم و فضل اور حفظ و ضبط کے اعتبار سے تنہا ایک جماعت کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ عظیم محدث اور ثقہ راوی تھے۔ ایک دن خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے ان سے درخواست کی کہ میرے بچے کو احادیث نبویہ لکھوا دیں۔ آپ نے چار صد احادیث املا کرا دیں۔ پھر ہشام ان سے ایک ماہ کے بعد ملا اور کہنے لگا کہ وہ کتاب جس میں حدیثیں لکھی تھیں، کہیں ضائع ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس نے کاتب کو بلایا اور امام زہری نے دوبارہ وہ احادیث لکھوا دیں۔ ہشام نے جب پہلی تحریر کے ساتھ ملایا تو ایک حرف کا بھی فرق نہ پایا۔

امام زہری نے ۱۲۴ھ میں وفات پائی اور ملک شام کے گاؤں شغبدا نامی میں مدفون ہوئے۔ (تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۹۰۔ نیز تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۵)۔

عکرمہ مولیٰ ابن عباس:

ابو عبداللہ عکرمہ مولی ابن عباس جلیل القدر تابعی و حافظ حدیث تھے۔ یہ نسلاً بربری اور مغربی الاصل

تھے۔ جن دنوں حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بصرہ کے عامل تھے۔ عکرمہ ان کی ملکیت میں آئے۔ ابن عباسؓ نے ان کی تعلیم و تربیت میں حد درجہ دلچسپی لی۔ اور ان کو کتاب و سنت کا درس دیا۔ عکرمہ کا اپنا بیان ہے کہ ابن عباسؓ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو قرآن و سنت کی تعلیم دیتے تھے۔ اسی طرح عکرمہ حضرت ابن عباسؓ کے چشمۂ فیض سے اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ فتویٰ دینے کے لائق ہو گئے اور حضرت ابن عباس نے ان کو فتویٰ دینے کی اجازت دے دی۔

اب لوگ ہر طرف سے آکر روایت و فتویٰ حاصل کرنے کے لیے ان کے بابِ عالی پر دستک دینے لگے۔ حدیث و فقہ کے ساتھ ساتھ عکرمہ شہرۂ آفاق قاری اور مفسر بھی تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کی وفات تک عکرمہ بدستور غلام رہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے علی نے ان کو خالد بن یزید بن معاویہ کے ہاتھ چار ہزار دینار کے عوض فروخت کر دیا۔ چنانچہ عکرمہ علی کے پاس آئے اور کہا "یہ اچھی بات نہیں، آپ نے اپنے باپ کے علم (عکرمہ) کو چار ہزار دینار کے عوض فروخت کر دیا" چنانچہ علی نے یہ بیع فسخ کر کے عکرمہ کو آزاد کر دیا۔ عکرمہ نے ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر اسّی سال سے کچھ زیادہ تھی۔

شیوخ و تلامذہ: عکرمہ کے اساتذہ میں مندرجہ ذیل صحابہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حسن بن علیؓ۔ ابو قتادہ۔ ابن عمر۔ ابو ہریرہ۔ ابو سعید معاویہ۔ ابن عمرو بن العاص۔

جناب عکرمہ سے مندرجہ ذیل اکابر تابعین نے استفادہ کیا۔

ابو الشعثاء۔ شعبی۔ نخعی۔ ابو اسحاق سبیعی۔ ابن سیرین۔ عمرو بن دینار وغیرہم۔

حدیث نبوی کے ائمہ محققین عکرمہ کو ثقہ قرار دیتے ہیں اور ان کی مرویات سے

احتجاج کرتے ہیں۔ امام بخاری اور اصحاب سنن اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ مگر امام مسلم نے عکرمہ کی روایت سے صرف ایک حدیث باب الحج میں بسلسلہ سعید بن جُبیر روایت کی ہے۔ امام مسلم نے عکرمہ کو اس لیے ترک کیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت ان کو کذّاب قرار دیتی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ عکرمہ خوارج کے نظریات سے متاثر تھے۔ اور اُمرا کے تحائف بھی قبول کر لیا کرتے تھے۔

بکثرت ائمہ حدیث نے عکرمہ کی تعدیل و توثیق سے متعلق کتب تصنیف کی ہیں مثلاً ابو جعفر بن جریر طبری و محمد بن نصر مروزی و ابو عبداللہ بن مندہ و ابو حاتم ابن حبّان و ابو عمر بن عبدالبرّ و دیگر ائمہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب الکمال کے اختصار اور مقدمہ فتح الباری میں عکرمہ کا دفاع کیا ہے۔ یہ سب ائمہ اس امر پر متفق ہیں کہ عکرمہ کی جانب دروغ گوئی کی نسبت درست نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک قول منقول ہے کہ آپ نے نافع سے کہا تھا "مجھ پر جھوٹ نہ باندھیے۔ جیسے عکرمہ نے ابن عباسؓ پر جھوٹ باندھا تھا"۔ مگر یہ قول ثابت نہیں۔ اس لیے کہ یہ قول بروایت ابو خلف جزّار از یحییٰ البکّاء از ابن عمرؓ منقول ہے۔ اور یحییٰ البکّاء متروک الحدیث ہے۔ پھر ایک ضعیف راوی کے قول کی اساس پر عکرمہ جیسے ثقہ راوی کی تضعیف کیونکر ممکن ہے؟

عکرمہ کا خارجی ہونا بھی ثابت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعض نظریات خوارج سے ہم آہنگ تھے۔ مگر وہ دلیل و برہان کی بنا پر ان کے قائل تھے خوارج سے یگانگت و موافقت کی بنا پر نہیں۔ جھوٹ موٹ لوگوں نے ان کو خارجی کہنا شروع کر دیا۔ اور اگر کسی گمراہ فرقے کی جانب نسبت کا دعویٰ کرنے ہی سے کسی راوی کا مجروح ہونا لازم آجاتا تو اکثر محدثین ساقط العدالت قرار پاتے۔ اس لیے کہ کوئی محدث ایسا نہیں جس کی نسبت لوگوں نے ایسے فرقوں کی جانب نہ کی ہو۔ جیسے وہ

ناپسند کرتے تھے۔

باقی رہا اُمرا کے تحائف قبول کرنے کا مسئلہ تو جمہور محدثین اور ائمۂ و نقّادِ حدیث اس بات کو قبول روایت میں مخل قرار نہیں دیتے۔ ابن شہاب زُہری ہی کو دیکھیے یہ اس معاملہ میں عکرمہ سے بھی زیادہ مشہور تھے۔ مگر ائمۂ حدیث میں سے کسی نے بھی اس بنا پر ان سے اخذ روایت کو ترک نہیں کیا۔

عکرمہ کی مدح و ستائش: امام بخاری فرماتے ہیں۔
"ہمارے اصحاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، جو عکرمہ کی مرویات سے احتجاج نہ کرتا ہو"

محدث ابن معین فرماتے ہیں۔
"جب کسی شخص کو عکرمہ کی عیب چینی کرتا دیکھو تو سمجھ لو کہ اس کے اسلام میں شبہ ہے"

امام ابو عبداللہ محمد بن نصر مروزی کا قول ہے۔
"اکثر اہل علم عکرمہ کی مرویات سے احتجاج کرنے پر متفق ہیں۔ ہمارے معاصرین میں سے سرکردہ علما یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ مثلاً امام احمد بن حنبل و اسحاق بن راہویہ و ابو ثور و یحییٰ بن معین جب میں نے اسحاق بن راہویہ سے اس ضمن میں سوال کیا، تو کہنے لگے عکرمہ ہمارے نزدیک اہل دُنیا کے امام ہے۔ وُہ میرا سوال سُن کر حیرت زدہ ہو گئے۔"

محدث ابن مندہ فرماتے ہیں۔
"ستر سے زائد اکابر تابعین نے عکرمہ کی تعدیل کی ہے۔ یہ ایسا امتیاز ہے جو کبار تابعین میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے عکرمہ کی تضعیف کی ہے وہ بھی ان سے حدیثیں روایت کرنے سے بے نیاز نہ ہو سکے

مؤلفین کتب حدیث کے زمانہ تک عکرمہ کی مرویات ہر دور میں مقبول رہیں۔ امام مسلم اگرچہ عکرمہ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ تاہم دیگر راویوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے عکرمہ سے بھی روایت کی ہے۔"

امام ابوعمر ابن عبدالبرؒ رقمطراز ہیں۔

"عکرمہ عظیم عالم تھے۔ ان کے بارے میں جرح کرنے والوں کی بات قابل تسلیم نہیں۔ اس لیے کہ وہ بلا دلیل و برہان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام مالک نے موطا میں عکرمہ سے روایت نہیں کی۔ حالانکہ باب الحج میں انہوں نے عکرمہ کا نام لے کر ان سے روایت کی اور عکرمہ کی ابن عباسؓ سے روایت کا ذکر صراحۃً کیا ہے۔ امام مالک نے حج کے مسئلہ میں عطاء کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ عطاء تابعین میں مناسک حج کے سب سے بڑے عالم تھے۔"

مندرجہ صدر بیانات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جب ثقہ راوی عکرمہ سے کوئی حدیث روایت کریں تو اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

(تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۴۰ و مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۱۴۸)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ:

نام و نسب ابو حفص عمر بن عبدالعزیز بن حکم بن ابی العاص ابن امیہ القرشی الاموی ہے۔ یہ بڑے جلیل القدر تابعی خلیفہ راشد امام عادل اور عالم کامل تھے۔ آپ مصر کے شہر حلوان میں ۶۱ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اس وقت وہاں کے امیر تھے۔ بچپن ہی میں قرآن یاد کر لیا۔ آپ کے والد نے احادیث کا علم حاصل کرنے کے لیے آپ کو مدینہ بھیجا۔ چنانچہ آپ بدستور عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کی خدمت میں حاضر ہو کسب فیض کرتے رہے۔ جب ان کے والد نے وفات پائی تو خلیفہ عبدالملک بن مروان نے ان کو دمشق بلوا کر اپنی بیٹی فاطمہ ان کے نکاح میں دے دی۔ ولید کی عہدِ خلافت

میں آپ مدینہ کے والی رہ چکے تھے۔ پھر آپ ۹۳ھ میں ملک شام آئے اور ۹۹ھ میں مسند خلافت پر فائز ہوئے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز نے مندرجہ ذیل صحابہ سے حدیث نبوی کا درس لیا۔ انس بن مالک۔ سائب بن یزید۔ یوسف بن عبد اللہ بن سلام۔ خولہ بنت حکیم وغیرہم تابعین میں سے آپ نے ابن المسیب و عروہ و ابوبکر بن عبد الرحمٰن و ربیع بن سبرہ سے استفادہ کیا۔

آپ کے تلامذہ میں سے حسب ذیل تابعین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن۔ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم۔ زہری۔ یحییٰ انصاری۔ محمد بن منکدر۔ حمید الطویل وغیرہم۔

عمر بن عبد العزیز کے کثرت علم و فضل زہد و تقویٰ اور اتباع سنتِ نبوی و خلفائے راشدین پر سب علما متفق اللسان ہیں۔ آپ حدیث نبوی کی جمع و تالیف کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ جب سریر آرائے خلافت ہوئے تو مختلف بلاد و امصار کے علماء کو حدیثیں جمع کرنے اور درس و تدریس کے ذریعے احادیث نبویہ کی نشر و اشاعت کا حکم دیا۔ تاکہ کبار تابعین کی وفات کی وجہ سے حدیثیں ضائع نہ ہو جائیں آپ اولین خلیفہ تھے۔ جس نے حفاظتِ حدیث کا بیڑا اُٹھایا۔

عمر بن عبد العزیز تھے نہایت ثقہ اور عظیم حافظ حدیث تھے۔ سب علماء اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔ علم حدیث میں آپ کا پایہ زہری کے ہم پلہ سمجھا جاتا تھا مجاہد کا قول ہے۔

"ہم انہیں تعلیم دینے آئے تھے مگر شاگرد بن کر کسب فیض کرنے لگے"۔

آپ اشاعتِ حدیث میں مشغول رہے حتیٰ کہ ۱۰۱ھ میں وفات پائی۔

(تاریخ الخلفاء ص ۱۵۳ و تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۰ و تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۴۷۵)

کعب الاحبار: نام ونسب کعب بن ماتع حمیری ہے۔ یہ علمائے یہود میں سے تھے۔ اور ان کی کتبِ مقدسہ کے بڑے عالم تھے۔ ان کو کعب الحبر اور کعب الاحبار کہا جاتا ہے۔ انہوں نے جاہلیت اور اسلام کے دونوں زمانے پائے۔ یمن میں پیدا ہوئے اور وہیں سکونت پذیر رہے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں اسلام لائے اور مدینہ منتقل ہوکر صحابہ سے کتاب وسنت کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ غزوۂ روم میں شرکت کی اور خلافت عثمانی میں عازمِ شام ہوکر حمص کے شہر میں سکونت پذیر ہوئے۔ حمص ہی میں ۳۲ھ یا ۳۴ھ میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ایک سو چار برس تھی۔

ابن سعد نے بطریق حماد بن سلمہ از علی بن زید بن جدعان از ابن المسیب ذکر کیا ہے کہ حضرت عباسؓ نے کعب سے پوچھا۔ آپ عہد رسالت اور خلافتِ صدیقی میں کیوں نہ اسلام لائے؟ کہنے لگے میرے والد نے تورات میں سے کچھ نقل کیا اور مجھے کہا تھا کہ اس پر عمل کیجیے۔ پھر اس تحریر کو سربمہر کر دیا اور مجھ سے اس حق کی بنا پر عہد لیا جو ایک والد کو اپنے بیٹے پر حاصل ہوتا ہے کہ میں اس مُہر کو نہ توڑوں۔ جب میں نے اسلام کے غلبہ کو دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ میرے والد نے مجھ سے علمِ الٰہی کو کہیں چھپایا نہ ہو۔ چنانچہ جب میں نے وہ مُہر توڑی تو اس میں حضرت محمدؐ اور ان کی امت کی تعریف مکتوب تھی۔ پھر میں اسلام لایا۔

اس روایت کی سند میں حمّاد بن سلمہ راوی ہے جس کا دماغ درست نہ تھا۔ امام بخاری ومسلم نے اس کی روایت قبول نہیں کی۔ یہ روایت دوسری سند سے بھی منقول ہے۔ اس میں علی بن زید بن جدعان ہے جس کو متعدد محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

کعب نے رسول کریمؐ سے مرسلاً روایت کی ہے۔ اسی طرح اس نے حضرت عمرؓ

وصُہیب و عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں مندرجہ ذیل صحابہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت معاویہ۔ ابو ہریرہ۔ ابن عباس۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ عبداللہ بن عمر۔ ابن زبیر۔ انس رضی اللہ عنہم۔ اسی طرح عطاء بن ابی رباح اور دیگر تابعین نے بھی آپ سے روایت کی ہے۔ مشہور محدثین مثلاً امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی و نسائی نے ان کی مرویات کو اپنی کتب میں جگہ دی ہے۔

مدح و توصیف: ابن سعد نے کعب الاحبار کو تابعین اہل شام کے طبقہ اُولیٰ میں ذکر کیا ہے۔ جُملہ نقّادِ حدیث آپ کی توثیق و تعدیل پر متفق ہیں یہی وجہ ہے کہ ضعیف اور متروک راویوں پر مشتمل کسی کتاب میں کعب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ امام نوَوِی نے اپنی کتاب تہذیب میں ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

کعب الاحبار کی کثرتِ علم اور توثیق پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ حضرت ابوالدرداؓ صحابی نے کعب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہایت کثیر العلم ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ "کعب الاحبار ایک بڑے عالم بلکہ علم کے سمندر ہیں"۔ عبداللہ بن سلامؓ کعب الاحبار کو حضرت عمرؓ کی موجودگی میں ملے اور ان سے پوچھا کہ علماء کون ہوتے ہیں؟ فرمایا "جو اپنے علم پر عمل کرتے ہوں"۔ پھر دریافت کیا کون سی چیز علما کے دلوں سے علم کو لے جاتی ہے؟ فرمایا "لالچ و حرص اور لوگوں سے ضروریات کا طلب کرنا"۔ عبداللہ بن سلام کہنے لگے "آپ نے سچ فرمایا"۔ تہذیب للنووی)۔

کعب پر جرح اور اس کا اِبطال: اس کے باوجود کہ علما و نقّادِ حدیث کعب کی تعدیل کرتے ہیں اور بخاری و مسلم اور اصحاب سُنن نے ان کی مرویات کو اپنی کتب میں جگہ دی۔ عصر حاضر کے بعض

بر خود غلط علم کے دعویدار کعب الاحبار کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ حدیثیں روایت کرتے وقت جھوٹ بولا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل میں کعب کا ہاتھ تھا۔

روایتِ حدیث میں دروغ گوئی کی دلیل ان کے نزدیک صحیح بخاری کتاب الاعتصام کی وہ روایت ہے جو حُمید بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کو سُنا کہ وہ مدینہ کے ایک گروہ کو جو قریش پر مشتمل تھا، حدیثیں سنا رہے تھے۔ اسی ضمن میں حضرت معاویہؓ نے کعب الاحبار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان لوگوں میں سب سے سچے تھے۔ جو ہمیں اہل کتاب کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ تاہم ہم نے ان پر جھوٹ کی آزمائش کی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس قول سے کعب کی توثیق ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل کتاب سے روایت کرنے والوں میں صادق ترین شخص تھے۔ اگرچہ جو باتیں کعب پوری امانت و دیانت کے ساتھ اہل کتاب سے نقل کرتے تھے۔ ان میں سے بعض واقعہ کے مطابق نہیں ہُوا کرتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جھوٹ ان کتابوں میں ہُوا کرتا تھا جہاں سے کعب الاحبار نقل کیا کرتے تھے البتہ ان کی نقل و روایت دروغ گوئی کے شائبہ سے پاک ہُوا کرتی تھی۔ حضرت معاویہؓ نے کعب الاحبار کے بارے میں جو بات کہی ہے اس سے ملتا جلتا ابن عباس کا قول بھی ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق کہ کعب الاحبار حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں شریک تھے اس کی دلیل ان کے نزدیک ابن جریر کی یہ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت سے تین روز پہلے کعب الاحبار ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ تین دن کے اندر اندر آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا "آپ کو کیسے پتہ چلا؟" کعب کہنے لگے "تورات میں لکھا ہے"، حضرت عمرؓ نے پوچھا "کیا تورات میں میرا نام لکھا ہے"؟ کعب نے کہا "نہیں مگر آپ کی صفات اور حلیہ مذکور ہے۔ نیز یہ کہ آپ

کی طبعی عمر ختم ہو چکی ہے"۔

بقول ان کے اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کعب نہ صرف یہ کہ حضرت عمر کے قتل کی سازش سے باخبر تھے بلکہ اس میں شریک بھی تھے۔ اپنے آپ سے تہمت کو دُور کرنے کے لیے انہوں نے تورات کا حوالہ دے دیا۔ اور اس لیے بھی، تاکہ جو باتیں یہ تورات وغیرہ سے معلوم کر کے بتاتے ہیں مسلمان اُن پر اعتماد کرنے لگیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابن جریر اور دیگر مؤرخین نے اپنی کتب تاریخ میں صحت کا التزام نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتب تاریخ ضعیف و موضوع روایات کا پلندہ بن گئی ہیں۔ ایک منصف مزاج محقق جب ان کتابوں سے کوئی واقعہ نقل کرے تو اسے چاہیے کہ اس کی سند و متن کی اچھی طرح چھان پھٹک کر دیکھے اور اسے مسلّم واقعہ قرار نہ دے۔ جب ہم اس واقعہ پر ایک تحقیقی نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ واقعہ ہمیں جھوٹا اور بناوٹی ہونے کا اعلان کرتے دکھائی دیتا ہے۔ اس کے وجوہ و اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱- اگر یہ واقعہ تورات ہی میں مرقوم ہوتا تو صرف کعب ہی کو اس کا علم نہ ہوتا بلکہ دوسرے اہل علم جو تورات کا علم رکھتے تھے، اس واقعہ کو جانتے ہوتے۔

۲- اگر یہ بات درست ہوتی تو حضرت عمرؓ صرف کعب ہی کے قول پر اعتماد نہ کرتے بلکہ ان تمام لوگوں کو جمع کر کے اس واقعہ کے بارے میں دریافت کرتے جو اہل کتاب میں سے مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ اور اگر حضرت عمرؓ ایسا کرتے تو کعب رسوا ہو جاتے اور ان کا جھوٹ کھل کر سامنے آ جاتا۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ کعب اس سازش میں شریک ہے جو ان کے قتل کے سلسلہ میں تیار کی گئی ہے یا کم از کم اس کو اس کا علم ضرور ہے۔ اس طرح آپ اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے متعدد ذرائع استعمال کر سکتے اور اس سازش میں شرکت

کرنے والوں کو بشمول کعب سزا دے سکتے تھے۔ اس امر کی توقع تو ہر حاکم سے کی جاتی ہے۔ اور حضرت عمرؓ تو حد درجہ ذہین و فطین اور اخبار و واقعات کی تہہ تک پہنچنے والے تھے مگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جھوٹا واقعہ ہے۔

۳۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ کعب اس سازش میں شریک بھی تھے اور بذات خود اس کا انکشاف بھی کر رہے تھے۔ یہ بات خلافِ قیاس ہے۔ اس لیے کہ جو شخص کسی سازش میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے کامیاب ہونے کے بعد وہ حد درجہ اس کو چھپاتا ہے تاکہ وہ اس کی سزا سے بچ سکے۔ سازش کی تکمیل سے قبل بھی وہ اس کو پوشیدہ رکھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے انکشاف کی صورت میں اس کی کامیابی ممکن نہیں ہوتی۔ کسی سازش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے قبل اس کا کشف و اظہار وہی شخص کرتا ہے جو حد درجہ کم عقل اور احمق ہو۔ اور کعب ایسے نہ تھے۔ بلکہ وہ بہت ذکی اور ذہین شخص تھے۔

۴۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ تورات کو لوگوں کی عمر کی تعیین اور ان کی تاریخ وفات سے کیا سروکار؟ خداوند کریم نے تورات کو نور و ہدایت بنا کر بھیجا تھا۔ نہ کہ ایسے واقعات کے کشف و اظہار کے لیے جن کا تعلق خاص لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

مندرجہ صدر اُمور اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ یہ واقعہ بلاشک وشبہ من گھڑت ہے۔ حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں شریک ہونا اور تورات سے نقل کرنے میں دروغ گوئی کا ارتکاب محض اتہام ہے۔ جو کسی دلیل و برہان پر مبنی نہیں ہے۔ ان لوگوں کا عجیب حال ہے کہ مورخین کا بیان جب ان کے حسب منشا ہو تو اس کو واجب الاتباع حجت کا درجہ دیتے ہیں۔ بخلاف ازیں جب بخاری و مسلم کی روایات ان کے موافق نہ ہوں تو ان میں کیڑے نکالنے لگتے ہیں۔

وہب بن منبہؒ: نام و نسب وہب بن منبہؒ کنیت ابو عبداللہ اور نسبت یمانی

وصنعانی ہے۔ یہ بڑے عابد و زاہد اور ثقہ تابعی تھے۔ یہ اہل یمن میں بڑے عالم و حافظ حدیث شمار ہوتے تھے۔ اور صنعاء شہر کے قاضی تھے۔ ان کے والد منبہ علاقہ خراسان میں ہرات کے رہنے والے تھے۔ یہ اس فوج میں شامل تھے جس کو کسریٰ ایران نے یمن کو فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ منبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مشرف باسلام ہوئے۔ وہب ۳۴ھ میں پیدا ہوئے جب ان کے والد یمن میں سکونت گزیں تھے کتاب وسنت کے ساتھ ساتھ وہب اہل کتاب کی کتب مقدسہ اور تاریخ وشعر سے بخوبی آگاہ تھے۔ آپ اہل کتاب میں سے مشرف باسلام ہونے والے دو علماء یعنی عبداللہ بن سلام وکعب الاحبار کے علم کے جامع تھے۔ وہب بن منبہ سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے۔

"لوگ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار اپنے اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ بتائیے جو شخص دونوں کے علوم کا جامع ہو (یعنی خود وہب بن منبہ) وہ کتنا بڑا عالم ہوگا۔"

وہب نے مندرجہ ذیل اکابر صحابہ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر۔ حضرت ابوہریرہ۔ عبداللہ بن عباس۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ ابوسعید خدری۔ جابر و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم۔

آپ کے تلامذہ میں مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

ان کے بیٹے عبداللہ بن وہب وعبدالرحمٰن بن وہب۔ ان کے بھتیجے عبدالصمد۔ علاوہ ازیں عمرو بن دینار۔ سماک بن فضل۔ عوف الاعرابی وغیرہم۔ امام بخاری و مسلم وابوداؤد ونسائی وترمذی نے ان کی مرویات کو اپنی کتب میں جگہ دی ہے۔

ایک قول کے مطابق آپ نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔

توثیق و تعدیل: محدث عقیلی فرماتے ہیں۔ "وہب ثقہ تابعی تھے۔"

امام ذہبی کا قول ہے

"وہب ثقہ اور صادق تھے مگر کتب اسرائیلیات سے زیادہ نقل کیا کرتے تھے۔"

امام نسائی بھی وہب کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں" یہ انکارِ حدیث کی جانب مائل تھے۔ پھر اس عقیدہ سے رجوع کر لیا۔" حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کے نزدیک وہب ثقہ ہیں"۔ البتہ فلّاس وہب کو اس لیے ضعیف راوی قرار دیتے ہیں کہ یہ انکارِ تقدیر کے عقیدہ سے متّہم ہیں۔

مثنیٰ بن صباح فرماتے ہیں۔

"وہب نے بیس برس تک عشا کے وضو کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی وہب کی مدح و ستائش میں رطب اللسان تھے وہب نے ان کو تحریر کیا کہ یمن کے بیت المال سے جو میری نگرانی میں تھا، چند دینار کھو گئے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے لکھا " مجھے آپ کی امانت و دیانت پر اعتماد ہے۔ مگر آپ نے سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ میں تو صرف مسلمانوں کے اموال کا امین ہوں۔ آپ کو حلف اٹھا کر مسلمانوں کو مطمئن کرنا ہوگا"۔

سابق الذکر بیانات سے واضح ہوا کہ کعب و وہب اکابر تابعین میں سے تھے۔ اب ہم مختصراً " اسرائیلیات" پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان لوگوں کے جھوٹ کھل کر سامنے آسکیں۔ جو کعب و وہب اور ان کے اصحاب و تلامذہ کو ہدفِ نقد و جرح بناتے ہیں۔

اسرائیلیات

۱- صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کعب الاحبار، وہب بن منبہؒ اور اس نوع کے دیگر حضرات سے جو روایات نقل کی ہیں- وہ حدیث نبوی نہیں بلکہ اسرائیلی واقعات واخبار ہیں جو ان لوگوں نے اہل کتاب کی کتابوں سے نقل کی ہیں۔

۲- اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں اہل کتاب کے بارے میں فرمایا ہے کہ انہوں نے اپنی کتب مقدسہ میں تحریف وتبدیلی سے کام لیا تھا- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق و باطل اور صدق و کذب باہم مخلوط ہو گئے- اس لیے صحابہ کرام نے اسرائیلیات کے بارے میں حسب ذیل مؤقف اختیار کیا۔

ا- جو بات کتاب و سنت سے ہم آہنگ ہو، اس کو تسلیم کر لیا جائے- اس لیے کہ مطابقت و مماثلت اس امر کی دلیل ہے کہ اس میں تحریف سے کام نہیں لیا گیا۔

ب جو بات قرآن و حدیث کے خلاف اس کو رد کر دیا- اس لیے کہ قرآن و حدیث کی مخالفت اس کے محرّف ہونے کی دلیل ہے۔

ج- جو بات ایسی ہو کہ شرع اسلامی نہ اس کی تصدیق کرتی ہو اور نہ تکذیب- اور اس کے درست و غلط ہونے کا احتمال ہو تو اس کے بارے میں صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے یہ حدیث منقول ہے کہ اہل کتاب عبرانی میں تورات پڑھ کر مسلمانوں کے لیے اس کی تفسیر عربی میں بیان کیا کرتے تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اہل کتاب کی نہ تصدیق کیجیے اور نہ تردید- اور یوں کہیے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہماری اور تمہاری (اہل کتاب) طرف اتاری گئی"۔

امام ابن عبد البرؒ عطاء بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ یہودی رسول کریمؐ

کے صحابہ کو باتیں سناتے اور صحابہ اس پر اظہار حیرت و استعجاب کیا کرتے تھے۔
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ اس کی تصدیق کیجیے اور نہ تکذیب۔ اور یوں کہیے کہ ہم اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری اور تمہاری طرف اتاری گئی۔ ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اس کے اطاعت شعار ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اہل کتاب کی تصدیق و تکذیب سے منع فرمایا ہے اس کی حکمت و مصلحت پر اس حدیث میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو ابن عبد البر نے ابو نملہ انصاری سے روایت کی ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔

ابو نملہ انصاری کا بیان ہے کہ ایک روز وہ آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر تھے۔ کہ ایک یہودی آ کر کہنے لگا۔ اے محمدؐ! کیا یہ جنازہ بولتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا واللہ اعلم۔ یہودی نے کہا کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ بولتا ہے"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اہل کتاب جو بات تمہیں بتائیں۔ اس کی تصدیق کیجیے نہ تکذیب۔ اور یوں کہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائے۔ اگر ان کی بات سچی ہو گی تو اس طرح تم اس کو جھٹلانے کے مرتکب نہیں ہو گے۔ اور اگر جھوٹ ہو گی تو تم اس کی تصدیق کے گنہ گار نہ ہو گے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"حضورؐ کا یہ ارشاد گرامی کہ "اہل کتاب کی تصدیق و تکذیب نہ کیجیے"، یہ اس وقت ہے جب اہل کتاب کی بات میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہو۔ اس لیے کہ اگر اُن کی بات سچی ہوئی اور تم نے اس کی تکذیب کر دی یا جھوٹی ہوئی اور تم نے اس کی تصدیق کر دی تو ان دونوں صورتوں میں گنہ گار ہو گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر ان کی بات اسلامی شریعت کے خلاف بھی ہو تو بھی اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ یا ان کی بات دین اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ بھی ہو تو اس کی تصدیق نہ کی جائے۔ امام شافعی نے صراحۃً اس

پر روشنی ڈالی ہے۔" فتح الباری ج ۸ ص ۱۲۹)

۳- یہ بات کسی طرح بھی قرین عقل وقیاس نہیں کہ اسرائیلیات کی نقل و روایت کو اصحابِ رسولؐ کے لیے نقد و جرح کا ذریعہ ٹھہرایا جائے۔ اس لیے کہ وہ اسرائیلیات کو شرعی اسلامی ترازو میں رکھ کر جانچتے پرکھتے تھے۔ شریعت کے اصول و قواعد اس وقت مقرر ہو چکے تھے۔ مزید برآں اسرائیلی روایات کا تعلق صرف اخبار و واقعات کے ساتھ تھا، عقائد و احکام کے ساتھ نہیں۔ اسرائیلی روایات کسی حیثیت سے بھی صحابہ کے افکار و عقائد پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لیے کہ علم اور دین میں صحابہ کا ایک خاص مقام تھا۔ اسی طرح یہ بھی موزوں نہیں کہ اسرائیلیات کی نقل و روایت کو ان کے ناقلین مثلاً کعب و وہب کے لیے جرح وطعن کا ذریعہ بنایا جائے۔ حالانکہ حضرات صحابہ اور علمائے جرح و تعدیل ان پر مدح و ستائش کے پھول نچھاور کر چکے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ روایات اہل کتاب کی کتب سے صرف نقل کی ہیں۔ ان کی تصدیق نہیں کی۔ اسرائیلیات کے بارے میں ان کا زاویۂ نگاہ وہی تھا، جو دیگر صحابہ کا تھا۔ اور وہ یہ کہ جو بات ہماری شریعت سے ہم آہنگ ہو، اس کی تصدیق کیجیے۔ اور جو اس سے متصادم ہو، اس کو ٹھکرا دیجیے اور جو مخالف ہو نہ موافق اس کا علم اللہ تعالیٰ کو سونپ دیجیے۔ وہ جو روایات بھی نقل کرتے ہیں، اس کی مثال ایک امین شخص کی ہے جو کسی ایسی کتاب کے مطالب سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہو جو کسی دوسری زبان میں لکھی گئی ہو اور آپ اسے جانتے نہ ہوں۔ وہ شخص صرف یہ کام کرتا ہے کہ آپ کی زبان میں اس کا ترجمہ کر دیتا ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ اس کے صدق و کذب کو جانچیں پرکھیں۔ مگر وہ صدق و کذب اس کتاب کی جانب منسوب ہو گا نہ کہ مترجم و ناقل کی طرف۔ ظاہر ہے کہ حضرات ابن مسعود و ابن عباس و ابوہریرہ و ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ کھوٹے کھرے میں تمیز کرنے سے قاصر نہ تھے۔ تاکہ یہ کہا جا سکے کہ اسرائیلی روایات

کی نقل و روایات سے ان کے افکار و عقائد متاثر ہوئے ہوں گے۔

۴۔ اگر اسرائیلیات کو شرعی طریقہ سے اخذ نہ کیا جائے۔ مثلاً سب روایات کی تصدیق یا تکذیب کی جائے یا ان کا راوی شریعت کے اصول و قواعد سے بے گانہ اور نابلد ہو۔ یا قوت فکر و نظر اور اس ذہانت و فطانت سے بے بہرہ ہو جو حق و باطل میں فرق و امتیاز کے لئے ناگزیر ہے۔ یا اسرائیلیات کو ماخذ و مصدر قرار دے کر ان سے احکام و عقائد اخذ کرنے لگے۔ ان تمام حالات میں یہ روایات اِفسادِ عقائد و تشویشِ افکار کی موجب ہوں گی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس طرح اخذ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تم اہل کتاب سے دینی مسائل کیوں کر دریافت کرتے ہو۔ حالانکہ جو کتاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہے (قرآن کریم)، وہ اہل کتاب کی کتب کے بعد نازل ہوئی ہے۔ تم اسے پڑھتے ہو وہ ہر لحاظ سے خالص ہے۔ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی۔ اس کتاب نے تمہیں بتایا کہ اہل کتاب نے خدا کی کتاب کو بدل ڈالا۔ وہ اپنے ہاتھ سے ایک بات لکھتے اور کہہ دیتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ صرف اس لیے کہ اس طرح کچھ دنیوی فائدہ حاصل کر سکیں۔ جو علم تمہارے پاس موجود ہے۔ کیا وہ اہل کتاب سے مسائل دریافت کرنے سے باز نہیں رکھتا؟ بخدا ہم نے اہل کتاب کے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو تم سے تمہاری کتاب کے بارے میں دریافت کرتا ہو۔" (صحیح بخاری)

عبدالرزاق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اہل کتاب سے کچھ نہ پوچھو۔ وہ تمہاری رہنمائی نہیں کر سکتے۔ وہ تو خود گمراہ ہو چکے ہیں۔ اس طرح تم حق کو جھٹلانے اور باطل کی تصدیق کرنے لگ جاؤ گے۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ اگر تم بالضرور پوچھنا ہی چاہتے ہو تو جس بات کو کتاب خداوندی کے موافق پاؤ اسے لے لو اور جسے مخالف پاؤ اسے چھوڑ دو۔

امام ابن عبدالبر یحییٰ بن جعدہ سے روایت کرتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک کتاب لائی گئی۔ حضورؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا کسی قوم کی حماقت وضلالت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے رسول کی تعلیمات کو چھوڑ کر کسی اور نبی کی تعلیمات یا اپنی کتاب کے سوا کسی اور کتاب کی جانب راغب ہو۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ — کیا یہ بات ان کے لیے کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری ہے جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔

امام ابن عبدالبر نے ایک روایت نقل کی ہے جس کی سند میں "مجالد" نامی راوی ہے۔ کہ حضرت عمرؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک کتاب لائے جو ان کو کسی اہلِ کتاب سے ملی تھی حضورؐ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا اے ابن الخطاب! تم اس کتاب میں مشغول ہو رہے ہو۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ میں تمہارے پاس ایک صاف ستھرا اور پاکیزہ دین لایا ہوں۔ اہل کتاب سے کچھ نہ پوچھا کرو۔ اس لیے کہ اگر انہوں نے سچی بات بتائی تو تم اس کی تکذیب کرو گے اور اگر جھوٹی بات کہی تو تم اس کی تصدیق کرو گے۔ (اور دونوں باتیں گناہ ہیں) مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں میری پیروی کے سوا چارہ نہ ہوتا۔

اور دیگر احادیث وآثار۔ اگرچہ ان میں سے بعض احادیث پر جرح کی گئی ہے۔ مگر تعددِ طرق کی وجہ سے ان کو اتنی تقویت حاصل ہو جاتی ہے کہ ان کے ساتھ احتجاج درست ہے۔

۵۔ ہمارے بعض معاصرین جو کتب سے ہر قسم کا رطب ویابس مواد اخذ کرنے کے خوگر ہیں، دونوں قسم کی احادیث میں جمع وتطبیق نہ دے سکے۔ ایک قسم کی احادیث وہ ہیں جن میں اہل کتاب سے سوال کرنے کی ممانعت مذکور ہے۔ دوسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن میں اہل کتاب سے روایت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت جس کو بخاری نے نقل کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھ سے ایک آیت بھی

سنو تو اسے آگے پہنچادو- اور بنی اسرائیل سے سن کر روایت کیجیے اس میں کچھ حرج نہیں اور جس نے دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے۔" (صحیح بخاری)

ایسے لوگ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔ حالانکہ حدیث کی صحت کسی شک وشبہ سے بالا ہے۔ اس کے صحیح ہونے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ صحیح بخاری نے اس کو ایک مسند و موصول حدیث کی حیثیت سے نقل کیا ہے۔ کسی ناقد نے اس حدیث کی تضعیف کے سلسلہ میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی مذکورہ صدر روایت اور جو احادیث و آثار ہم نے نقل کیے ہیں۔ ان میں کوئی تعارض سرے سے موجود ہی نہیں حضرت عبداللہ کی روایت کردہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کی جس بات کو تم درست خیال کرتے ہو، اس کی نقل وروایت میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اور درست بات وہی ہو سکتی ہے جو قرآن اور سنت صحیحہ سے ہم آہنگ ہو۔ اہل کتاب سے سن کر روایت کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ ان کی باتوں میں عبرت موعظت کا سامان پنہاں ہے۔

حضرت عبداللہ کی روایت کردہ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اہل کتاب سے جو بات بھی سنو وہ سچی ہو یا جھوٹی، اس کو ضرور روایت کرو۔ اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹی بات کے روایت کرنے کی اجازت مرحمت نہیں فرماسکتے۔ اس روایت میں جو "لاحرج" کے الفاظ ہیں، ان کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب سے سن کر روایت کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یہ اس لیے فرمایا گیا کہ قبل ازیں حضورؐ نے اہل کتاب سے استفادہ کرنے اور ان کی کتب کے مطالعہ سے منع کیا تھا۔ بعدازاں اس کی اجازت عنایت فرمادی۔ مگر ہر کس وناکس کو نہیں۔ بلکہ صرف اس شخص کو جو علوم شرعیہ میں مہارت تامہ رکھتا ہو اور اس کے اصول و قواعد کا ذوق آشنا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسی خداداد بصیرت و فراست سے بہرہ ور ہو۔ جس کی بنا پر حق و باطل اور صواب و خطاء میں امتیاز کرسکتا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ یرموک میں مجھے اہل کتاب کی

دوبارِ شتر کتابیں ملی تھیں اور میں حضور کی اجازت کے پیش نظر ان کتابوں میں سے روایت کیا کرتا تھا۔ مگر ان کی ہر بات روایت نہیں کرتا تھا۔ جیسا کہ کم سواد اور کوتاہ بینوں کا خیال ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جید علمائے کرام قدیم ہوں یا جدید، اہل کتاب کی کتب مقدسہ کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ تاکہ ان سے بطریق احسن مذہبی مباحثہ افکار کر سکیں۔ اور ان کی کتب ہی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت کر کے ان پر حجت تمام کریں۔ قرآن عزیز میں فرمایا

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ ۔

جو چیز ہم نے آپ پر اتاری ہے اگر اس کے بارے میں آپ کو کوئی شبہ ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لیں جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔

نیز فرمایا

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا قُلْ كَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ۔

اور کافر کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں، فرما دیں کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ اور اس شخص کی شہادت کافی ہے۔ جسے کتاب الٰہی کا علم ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۔

کہہ دیجئے کہ تورات کو لا کر پڑھو اگر تم سچے ہو۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

”اہل کتاب سے سوال کی ممانعت اس وقت کی گئی تھی۔ جب اسلامی احکام اور دینی عقائد کی بنا نہیں پڑی تھی۔ اس لیے کہ اس وقت فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا ڈر تھا۔ جب یہ خطرہ ٹل گیا تو آپ نے اہل کتاب سے سوال کرنے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ اہل کتاب کے واقعات کا سننا پند و موعظت کا موجب ہے۔“ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۱)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اہل کتاب سے سوال کی اجازت صرف ان لوگوں کو دی گئی ہو جو شرعی علوم میں پختہ کار ہو اور اس کے اصول وضوابط سے بخوبی آگاہ ہو۔ ورنہ عقائد میں آمیزش واختلاط کا خدشہ ہے" (فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۳۸)۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

"اس مسئلہ میں اصل بات یہ ہے کہ عالم وغیر عالم میں فرق کرنا چاہیے۔ چنانچہ جو شخص راسخ فی العلم نہ ہو اس کو اہل کتاب کی کتب سے استفادہ کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ جید عالم ایسا کرسکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ مخالف کی تردید پیش نظر ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ علمائے قدیم وجدید تورات کے حوالے سے یہود پر حجت قائم کرتے رہے ہیں کہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی گئی ہے۔ اور اگر تورات کا مطالعہ جائز نہ ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے اور نہ ہی یہود پر اتمام حجت کرپاتے"۔ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۳۸)

مندرجہ صدر بیان کے مطابق تمام احادیث وآثار باہم موافق ومطابق ہوجاتے ہیں اور ان میں کوئی تناقض واختلاف باقی نہیں رہتا۔ بعض علماء کے نزدیک حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے منقول حدیث کا تعلق مواعظ وقصص کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے سن کر وہ واقعات واخبار روایت کیجیے۔ جن کا جھوٹا ہونا تم پر واضح نہیں۔ بقول ان کے اس حدیث کو عقائد واحکام کے ساتھ کچھ سروکار نہیں۔ مگر ہمارے نزدیک حدیث کا یہ مفہوم مراد لینا درست نہیں۔ اس لیے کہ جس بات کا جھوٹ ہونا ثابت نہ ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ چیز جس کا سچا ہونا ثابت ہو۔ ظاہر ہے کہ اس چیز کی نقل وروایت علی الاطلاق درست ہے۔ اور مواعظ وقصص کے ساتھ اس کی تخصیص بے معنی ہے۔

۲۔ جس چیز کا نہ صدق ثابت ہو نہ کذب۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی چیزوں کا مسلمانوں کو بتانا بے کار ہے۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں خصوصاً جب کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "اہل کتاب کی نہ تصدیق کیجیے نہ تکذیب"۔ دین اسلام بحمداللہ کافی ہے۔ اور ایسی چیزوں سے بے نیاز ہے۔ اس میں عقائد و احکام بھی ہیں، اخلاق و آداب بھی اور مواعظ و امثال بھی جو شخص اخلاص قلب کی نعمت سے بہرہ ور ہے۔ اور بات توجہ سے سننے کا عادی ہو۔ اس کے لیے اسلام کافی ہے۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ حضرت ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ ایک طرف تو اہل کتاب سے سوال کرنے سے روکتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کی کتب کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ مزید برآں کعب الاحبار اور ان اہل کتاب سے جو مشرف باسلام ہو گئے تھے، اخذ و روایت بھی کرتے تھے۔ یہ راز بھی سمجھ میں آیا کہ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کعب الاحبار کو اسرائیلیات کی روایت سے منع فرماتے اور کہا کرتے تھے کہ "اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ وہی تورات ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر نازل فرمائی تھی تو شب و روز اس کو پڑھتے رہیے۔" حضرت عمرؓ اس بات سے ڈرتے تھے کہ لوگ چونکہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کے عقائد خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے"۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن و سنت کا مطالعہ اسرائیلیات سے بہتر ہے۔ دوسری جانب کعب الاحبار کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تورات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق بشارتیں ہیں جو کتاب و سنت میں بھی مذکور ہیں۔ ان کے مطالعہ سے مومنین کے ایمان میں اضافہ ہوگا۔ ع

نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

یہ ہے حضرت عمر فاروقؓ اور کعب الاحبار کے نقطۂ نظر کا فرق و امتیاز اور اس کے وجوہ و اسباب۔ اس کی وجہ وہ نہیں جو مستشرقین اور ان کے منکرین حدیث تلامذہ بیان کرتے ہیں کہ کعب تورات سے نقل و روایت کرنے میں جھوٹے تھے۔ نیز یہ کہ وہ دراصل یہودی تھے اور مسلمانوں کے عقائد خراب کرنے کے لیے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا

حضرت عمرؓ نے اسی لیے ان کو اسرائیلیات کی روایت کرنے سے منع کیا تھا۔ (نعوذ باللہ من اکاذیبهم)۔

۶۔ اکابر مفسرین کی تفاسیر میں بکثرت اسرائیلیات کعب و وہب وغیرہما سے منقول ہیں مثلاً تفسیر ابن جریر وغیرہ۔ اسرائیلیات کو ذکر کرنے کی بنا پر ان مفسرین کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ انہوں نے ان روایات کو اس حیثیت سے ذکر کیا ہے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں اور ان کو شرع اسلامی کے ترازو میں رکھ کر جانچ پرکھ لینا چاہیے۔ مزید برآں انہوں نے اسرائیلیات کی سندیں بھی ذکر کر دی ہیں۔ اور صحیح و سقیم کی چھان پھٹک کا معاملہ پیچھے آنے والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ جس طرح محدثین نے احادیث کی تدوین کے وقت کیا تھا۔ اسناد کا ذکر کر کے وہ اس کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو گئے۔ اس لیے کہ ان کے معاصرین فن اسماء الرجال سے آگاہ تھے۔ مگر اس کا چرچا باقی نہیں رہا۔

جو باتیں کعب و وہب کی جانب منسوب ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ صحت کے معیار پر پوری اتریں۔ اس لیے کہ وضاعین نے بہت سی باتیں گھڑ کر ان کی جانب منسوب کر دی تھیں۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ غلط سلط باتوں کو ان کی جانب منسوب کر کے مقبول عام بنایا جائے۔ پھر افسانہ گو مؤرخین، کوتاہ نظر مفسرین اور ادبا نے ان جھوٹے واقعات کو نقل و روایت کر کے لوگوں تک پہنچایا۔ اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ واقعات درست ہیں۔ انہوں نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ جن کی جانب یہ واقعات منسوب ہیں۔ ان کا ان کے ساتھ کچھ سروکار بھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کعب و وہب کا قصور نہیں بلکہ کوتاہ نظری اور سہل انگاری کا جرم ہے۔

۷۔ یہ امر مضحکہ خیز بھی ہے اور اس سے رونا بھی آتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے ایک مدعی علم فرماتے ہیں کہ "میں نے دشمنانِ دین کی بعض کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ دین اسلام کے بارے میں جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر

کعب و وہب سے منقول اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بباطن یہود تھے اور انہوں نے بظاہر مسلمانوں کے عقائد بگاڑنے کے لیے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ مزید صحابہ و تابعین اور ان کے بعد آنے والے علمائے جرح و تعدیل نے کعب و وہب کی مدح و توصیف کی اور ان کو ثقہ راوی قرار دیا۔ مگر کسی کو بھی اس بات کا پتہ نہ چلا۔ جس کا سراغ میں نے لگایا۔"

ظاہر ہے کہ ایسا دعویٰ ایک جاہل اور بزخود غلط شخص ہی کر سکتا ہے۔ یا وہ کم عقل آدمی جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور اگر علم کا وہ مدعی صرف ان اسانید ہی کو دیکھ لیتا، جو کعب و وہب کی جانب منسوب ہیں تو اس پر حقیقتِ حال واضح ہو جاتی۔ پھر اسے یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ کعب و وہب ان واقعات کو کس حیثیت سے نقل کر رہے ہیں کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں۔ اگر وہ شخص اتنی زحمت بھی گوارا کر لیتا تو صحابہ و تابعین اور ان کے بعد آنے والے ماہرین فن کو ہدفِ تنقید نہ بناتا۔

سعید بن المسیّب:

نام و نسب سعید بن المسیّب بن حزن القرشی المخزومی یہ بڑے جلیل القدر تابعی تھے۔ ان کے باپ اور دادا دونوں صحابی تھے۔ یہ دونوں فتح مکہ کے روز حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ یہ خلافت فاروقی کے دوسرے سال پیدا ہوئے۔ حضرت عمرؓ کو دیکھا اور آپ سے حدیث سُنی۔

آپ نے مندرجہ ذیل اکابر صحابہ سے استفادہ کیا۔

حضرات عمر و عثمان و علی و سعد بن ابی وقّاص و ابن عباس و ابن عمر و جُبیر بن مُطعم و عبداللہ بن زید عاصم و حکیم بن حزام و ابو ہریرہؓ و معاویہ و عبداللہ بن عمرو بن العاص و عائشہ و امّ سلمہ وغیرہم رضی اللہ عنہم۔

حضرت سعید سے اکابر تابعین مثلاً عطاء بن ابی رباح و محمد الباقر و عمرو بن دینار و یحییٰ انصاری اور دیگر بے شمار لوگوں نے حدیثیں روایت کیں۔

تمام علماء آپ کی امامت وجلالت اور علمِ حدیث میں فوقیت و برتری پر متفق ہیں۔
آپ مسائل و فتاویٰ میں اہل مدینہ کے سرخیل تھے اور "فقیہ الفقہا" کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

قتادہ فرماتے ہیں۔

"میں نے سعید بن المسیّب سے بڑھ کر حلال وحرام کا جاننے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔"

مکحول کا قول ہے۔

"علم کی تلاش میں میں نے زمین کا چپہ چپہ چھان مارا مگر سعید بن المسیب سے بڑا عالم میں نے نہیں دیکھا"

سعید بن المسیّب فرمایا کرتے تھے۔

"میں صرف ایک حدیث کی تلاش میں کئی دن اور راتیں چلتا رہتا تھا"

جملہ محدثین آپ کی ثقاہت و عدالت حفظ و ضبط اور تحصیل علم کے ذوق و شوق پر متفق ہیں۔ سعید بن المسیّب حکام کے تحائف قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ اور تیل کی تجارت کرکے بسر اوقات کیا کرتے تھے۔ حد درجہ کے متقی تھے۔ ۹۳ھ میں وفات پائی۔

عُروہ بن زبیر:

نام و نسب عُروہ بن زبیر بن عوّام قرشی اسدی مدنی اور کنیت ابو محمد ہے۔ آپ بڑے جلیل القدر تابعی اور حافظِ حدیث تھے۔

آپ نے اپنے والد زبیرؓ اپنے بھائی عبداللہ بن زبیرؓ اور والدہ محترمہ اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ سے حدیثیں سنیں۔

عروہ بن زبیرؓ کے اساتذہ میں مندرجہ ذیل اکابر کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔
اُمّ المومنین عائشہ جو عروہ کی خالہ بھی تھیں۔ سعید بن زید۔ حکیم بن حزام و دیگر صحابہ و تابعین۔

آپ کے تلامذہ میں یہ لوگ قابل ذکر ہیں۔

عطاء۔ ابن ابی ملیکہ۔ ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن۔ زہری۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ۔

آپ کے پانچوں بیٹوں نے بھی آپ سے استفادہ کیا۔ ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

ہشام۔ محمد۔ یحییٰ۔ عبداللہ۔ عثمان۔

چونکہ عُروہ اپنی خالہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ملتے رہتے تھے اور تحصیل علم کے بڑے حریص بھی تھے۔ اس لیے آپ بڑے کثیر الروایۃ تھے، چنانچہ اکابر تابعین نے ان کی علمی جلالت کا اعتراف کیا ہے۔

ابن شہاب زُہری فرماتے ہیں۔

"عُروہ ایک سمندر تھے جو کبھی گدلا نہیں ہوتا۔"

عُروہ کے بیٹے ہشام کہتے ہیں۔

"ہمارے والد عُروہ کی مرویات دو ہزار اجزاء پر مشتمل تھیں۔ ہم اُن اجزاء میں سے ایک جزُ احادیث بھی نہ سیکھ سکے۔"

محدّث ابن عُیَیْنَہ فرماتے ہیں۔

"تین اشخاص حضرت عائشہ کی مرویات کے سب سے بڑے عالم تھے۔ یعنی قاسم، عُروہ و عَمرہ۔"

محمد بن سعد فرماتے ہیں۔

"عُروہ ثقہ کثیر الحدیث فقیہ اور عالم و حافظ تھے۔

ایک قول کے مطابق عروہ نے ۹۴ھ میں وفات پائی۔

نافع مولیٰ ابن عمر: اسم گرامی نافع اور کنیت ابو عبداللہ تھی۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے۔ اسلام نے ان پر یہ احسان کیا کہ دین کے عظیم امام قرار پائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے غلام ہونے کے باوجود یہ تحصیل علم میں

مشغول رہے اور آقا کی خدمت انہیں احادیث کے حفظ وضبط سے باز نہ رکھ سکی۔

نافع نے مندرجہ ذیل صحابہ سے حدیث کا درس لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ ابوہریرہ۔ ابوسعید خدری۔ ابولبابہ۔ رافع بن خدیج۔ عائشہ صدیقہ وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مندرجہ ذیل تابعین بھی آپ کے اساتذہ میں شامل ہیں۔

قاسم۔ سالم۔ یزید بن عبداللہ۔ اسلم مولیٰ عمر۔ عبداللہ بن محمد بن ابی صدیق وغیرہم رحمہم اللہ

آپ کے تلامذہ میں مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

ابواسحٰق سَبیعی۔ حکم بن عُیَینہ۔ یحییٰ انصاری۔ محمد بن عجلان۔ زہری۔ صالح بن کیسان ایوب۔ حُمَید الطویل۔ میمون بن مہران۔ موسیٰ بن عقبہ ابن عون۔ اعمش و دیگر تابعین۔

تابعین کے علاوہ مندرجہ ذیل اکابر نے آپ سے کسبِ فیض کیا۔

ابن جُریج۔ اوزاعی۔ مالک۔ لیث۔ یونس بن عُبَید۔ ابن ابی ذُوَیب۔ ابن ابی لیلیٰ۔ ضحاک بن عثمان اور نافع کے تینوں بیٹے یعنی عبداللہ، عمر و ابوبکر وغیرہم۔

نافع کی توثیق وتعدیل اور روایتِ حدیث میں فضیلت و عظمت پر سب علماء کا اتفاق ہے۔

امام بخاری فرماتے ہیں۔

"اصح الاسانید امام مالک از نافع از ابن عمرؓ ہے۔"

امام مالک کا قول ہے۔

"جب میں کوئی حدیث بروایت نافع از ابن عمرؓ سن لوں، تو مجھے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کسی اور سے بھی سنوں۔"

عبیداللہ بن عمر فرماتے ہیں۔

"نافع کو عطا کر کے اللہ نے ہم پر بڑا کرم فرمایا ہے۔"

ابن عُیَینہ کہتے ہیں۔

"نافع سے بڑھ کر اور کس کی روایت ہو سکتی ہے"۔

حدیث و فقہ میں مہارت و بصیرت کی بنا پر خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے احکام دین اور احادیث نبویہ کی تعلیم دینے کے لیے آپ کو مصر بھیجا۔

محمد بن سعد کہتے ہیں۔

"نافع کثیر الحدیث تھے۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے احادیث کی تعلیم و تدریس کے لیے ان کو مصر بھیجا تھا"

نافع نے مدینہ منورہ میں ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔

عُبَیدُاللہ بن عبداللہ بن عُتبہ :

نام و نسب عُبَیداللہ بن عبداللہ بن مسعود الہُذَلی المدنی ہے۔ بڑے جلیل القدر تابعی اور حافظ تھے۔ آپ کی امامت و جلالت حفظ و ضبط اور ثقاہت پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ حدیث و فقہ میں مہارت کی وجہ سے ابنِ عباس رض انہیں بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

امام زُہری فرماتے ہیں۔

"عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کے سوا میں جس عالم کے پاس بیٹھا، میں نے محسوس کیا کہ جو علم اسے یاد ہے میں اس سے آگاہ ہوں۔ مگر عُبَیداللہ کے یہاں میں جب بھی آیا، تازہ علم پایا"

احادیث نبویہ کے عظیم حافظ ہونے کی بنا پر ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا استاد مقرر کیا گیا تھا۔

ابن سعد فرماتے ہیں۔

"عُبیداللہ بڑے عالم ثقہ اور فقیہ اور کثیر الحدیث تھے"۔

عبیداللہ نے حسب ذیل اکابر صحابہ سے حدیث کا درس لیا۔

ابن عباس - ابن عمر - ابوہریرہ - ابوسعید خدری - ابوواقد لیثی - زید بن خالد - نعمان بن بشیر - عائشہ صدیقہ - فاطمہ بنت قیس و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم -

عبیداللہ نے اکابر تابعین سے بھی استفادہ کیا - آپ سے عراک بن مالک - زہری - ابوالزناد - صالح بن کیسان اور دیگر تلامذہ نے کسب فیض کیا -

عبیداللہ نے ایک قول کے مطابق ۹۹ھ میں وفات پائی -

سالم بن عبداللہ بن عمر: نام ونسب سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب اور کنیت ابو عبداللہ ہے - آپ بڑے جلیل القدر تابعی تھے - سالم نے اپنے والد حضرت ابن عمرؓ ابوایوب انصاریؓ - رافع بن خدیج - ابوہریرہ عائشہ و دیگر صحابہ سے حدیثیں سنیں - بکثرت تابعین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا - تابعین میں سے عمرو بن دینار ونافع وزہری وموسیٰ بن عقبہ وحمید الطویل وصالح بن کیسان و بکثرت اتباع تابعین نے استفادہ کیا -

حدیث وفقہ میں آپ کی جلالت وامامت پر سب علماء کا اتفاق ہے - امام اسحٰق بن راہویہ فرماتے ہیں کہ اصح الاسانید زہری از سالم از ابن عمر ہے -

محمد بن سعد فرماتے ہیں -

"سالم کثیر الاحادیث بڑے عالی مرتبت اور پاکباز شخص تھے"۔

امام بخاری وابونعیم کے نزدیک سالم نے ۱۰۶ھ میں وفات پائی -

شعبی: عامر بن شراحیل علامۃ التابعین کہلاتے تھے - آپ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ۲۰ھ میں پیدا ہوئے - آپ جلیل القدر امام، حافظ اور عظیم فقیہ تھے - آپ نے حضرت علی وابوہریرہ وابن عباس وعائشہ وابن عمر و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے حدیثیں روایت کیں - شعبی امام ابوحنیفہؒ کے استاد گرامی تھے - آپ عرصہ دراز تک کوفہ کے قاضی رہے - عہد صحابہ ہی میں آپ کے فتاویٰ مشہور ہوگئے تھے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عظیم محدّث وفقیہ تھے۔

سب علما آپ کی امامت وثقاہت کے بارے میں متفق اور آپ کے علم وفضل اور انکسار وفروتنی کے ثناخواں ہیں۔ مکحول کا قول ہے کہ "میں نے شعبی سے بڑا عالم نہیں دیکھا" ابوحصین کہتے ہیں" میری نگاہ میں شعبی سے بڑا فقیہ اور کوئی نہیں"۔ ابن سیرین نے ابوبکر ہذلی سے کہا "شعبی کے دامن سے وابستہ ہو جائیے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگ صحابہ کی موجودگی میں ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے"۔

ابن ابی لیلیٰ کا قول ہے۔

"شعبی محدّث تھے اور ابراہیم نخعی قیاس سے کام لیا کرتے تھے"۔

شعبی خود فرمایا کرتے تھے۔

"ہم فقیہ نہیں ہیں، ہم نے تو حدیثیں سنیں اور روایت کیں۔ فقیہ وہ ہے کہ جس بات کا اسے علم ہو اس پر عمل کرے"۔

امام شعبی نے ۱۰۳ھ میں وفات پائی۔

ابراہیم نخعی: کنیت ابوعمران اور نام ابراہیم بن یزید بن قیس نخعی کوفی ہے۔ آپ جلیل القدر تابعی اور اہل کوفہ کے فقیہ تھے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ مگر ان سے حدیث کا سماع ثابت نہیں۔ بخلاف ازیں آپ نے کبار تابعین سے استفادہ کیا۔ ان میں سے علقمہ اور شعبی کے دونوں ماموں اسود و عبدالرحمٰن جو یزید کے بیٹے تھے و مسروق قابل ذکر ہیں۔ تابعین کی ایک جماعت نے آپ سے استفادہ کیا۔ ان میں سے شعبی و حبیب بن ابی ثابت و سماک بن حرب و اعمش اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے استاذ گرامی حماد بن ابی سلیمان بہت مشہور تھے۔

تمام علماء آپ کی ثقاہت اور فقہی مہارت کا لوہا مانتے ہیں۔ ان کی وفات کے وقت شعبی نے کہا تھا۔

"نخعی نے اپنے پیچھے کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جو ان سے بڑھ کر فقیہ ہو۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا حسن بصری اور ابن سیرین بھی ان سے بڑے فقیہ نہیں۔ فرمایا نہیں۔ بلکہ بصرہ کوفہ اور حجاز و شام میں ان سے بڑھ کر فقیہ موجود نہیں۔"

ابراہیم نخعی کے زمانہ میں کئی صحابہ بقید حیات تھے مگر انہوں نے کسی صحابی سے حدیث کی روایت نہیں کی۔ مگر اس کے باوجود حدیث اور روایت حدیث دونوں میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔

اعمش ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"ابراہیم نخعی حدیث نبوی کے صراف تھے۔"

حدیث کی نقد و جرح کے سلسلہ میں "صراف" کا لفظ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک عالم حدیث نبوی کا ناقد اسی صورت میں بن سکتا ہے جب وہ بہت سی احادیث کا حافظ ہو۔ اور ان کے رُواۃ و رجال سے بخوبی آگاہ ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابراہیم نخعی اسی قسم کے شخص تھے۔

محدّث ابوزرعہ فرماتے ہیں۔

"نخعی دین اسلام کے نشانات میں سے ایک عظیم نشان تھے۔"

امام عجلی کا قول ہے۔

"نخعی بڑے محتاط فقیہ تھے۔ تکلف کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔"

آپ نے ۹۶ھ میں وفات پائی۔

علقمہ:

ابوشبل علقمہ بن قیس بن عبداللہ نخعی کوفی بڑے جلیل القدر تابعی و عظیم فقیہ تھے۔ اسود و عبدالرحمٰن جو یزید کے بیٹے اور ابراہیم نخعی کے ماموں تھے۔ علقمہ ان کے چچا تھے۔

آپ نے مندرجہ ذیل صحابہ سے حدیث کا درس لیا۔

عمر بن خطاب و عثمان و علی و ابن مسعود و سلمان فارسی و خبّاب و حُذیفہ و ابو موسیٰ و عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم

علقمہ سے مندرجہ ذیل اکابر نے روایت کی۔

ابو وائل۔ ابراہیم نخعی۔ شعبی۔ ابن سیرین۔ عبدالرحمٰن بن یزید۔ ابو الضحیٰ و دیگر تابعین۔

علقمہ کی عظمت و جلالت کثرتِ علم اور خوش اخلاقی پر سب علما متفق ہیں۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ "علقمہ حضرت ابن مسعودؓ سے ملتے جلتے تھے"۔ شعبی کا قول ہے "علقمہ عالم ربانی ہیں"۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "علقمہ ثقہ اور بڑے نیک آدمی ہیں"۔

ابو سعد سمعانی فرماتے ہیں۔

"علقمہ اصحابِ ابن مسعودؓ میں سب سے بڑے اور صورت و سیرت میں ان سے بہت ملتے جلتے تھے"۔

"علقمہ نے ۶۲ھ میں وفات پائی۔

پہلی صدی ہجری میں کتابتِ حدیث پر اعتراضات اور ان کی تردید

مندرجہ صدر بیانات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ پہلی صدی ہجری میں حفظ وکتابت حدیث نبوی کی حفاظت وصیانت کے سلسلہ میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہوئے۔ حتیٰ کہ حدیث نبوی کی تالیف وتدوین کا دور آگیا۔ مگر کچھ زندیق اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ مختلف تاریخی ادوار میں حدیث نبوی اور اس کے حاملین کو اہلِ ایمان کی نگاہ میں مشکوک بنا کر رکھ دیا جائے۔ یہ جھوٹے اقوال اور باطل براہین ودلائل پیش کرتے ہیں۔ اب ہم بتوفیق ربانی ان کے اعتراضات نقل کر کے ان کا ابطال کرتے ہیں۔

روایت بالمعنیٰ پر اعتراض: الحاد کے داعی کہتے ہیں کہ راویانِ حدیث نے احادیث نبویہ کو اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا ان الفاظ میں نہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے گئے تھے۔ ہر طبقہ کے راوی یونہی کرتے کہ وہ احادیث کو ایک قسم کے الفاظ میں سنتے اور بالفاظِ دیگر روایت کرتے یہاں تک کہ احادیث جب منقول ہو کر ہم تک پہنچیں تو ان کے الفاظ ومعانی مٹ چکے تھے۔ اس طرح روایت بالمعنیٰ دین وادب اور لغت سب کے لیے ضرر رساں ثابت ہوئی یہی وجہ ہے کہ مختلف قسم کے علماء نے احادیث پر اعتماد کرنا ترک کر دیا۔

جو احادیث متکلمین کے وضع کردہ اصول وقواعد سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ وہ انہوں نے نظر انداز کر دیں۔ فقہا نے بعض احادیث کو اخذ کیا اور بعض کو رد کر دیا۔ علمائے عربیت نے جب دیکھا کہ احادیث نبویہ بالمعنیٰ روایت کی گئی ہیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

اصلی الفاظ جو آپ نے ارشاد فرمائے تھے معلوم نہیں تو اثبات لُغت و قواعد نحو کے سلسلہ میں احادیث سے احتجاج کرنا ترک کر دیا۔ حالانکہ وہ عرب کے اَن پڑھ اور ناشائستہ لوگوں کے کلام سے احتجاج کرتے ہیں جو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے۔ ان ملاحدہ کا کہنا یہ ہے کہ احادیث نبویہ کو آنحضورؐ کی زندگی میں بالکل اسی طرح لکھنا چاہیے تھا جیسے قرآنِ کریم لکھا گیا تھا۔ پھر راوی آنے والے تاریخی ادوار میں ان کو اس طرح سے روایت کرتے کہ ان کے الفاظ ضبط کیے جاتے اور ان کی اسانید متواتر ہوتیں۔ تاکہ ان پر اعتماد کیا جا سکتا۔

اس قسم کے شکوک و شبہات کے ازالہ و ابطال کے لیے ہم چند عنوانات پر بحث کر کے ان کی حقیقت واضح کریں گے۔ عنوانات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حدیث نبوی عہد رسالت میں قرآن کی طرح مدوّن کیوں نہ ہوئی؟

۲۔ کتب حدیث کی تدوین کے بعد روایت بالمعنیٰ کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

۳۔ صحابہ کرام اور دیگر رُواۃ و رجال روایت باللفظ کے حریص تھے اور مجبوری کی صورت ہی میں روایت بالمعنیٰ کرتے تھے۔

۴۔ اگر احادیث کے الفاظ مختلف اور ان کا مفہوم مُتّحد ہو تو اس کی وجہ صرف روایت بالمعنیٰ ہی نہیں بلکہ اور وجوہ بھی ہوتے ہیں۔

۵۔ اگر احادیث کو مشکوک قرار دیا جائے تو دیگر علوم بھی ناقابل اعتماد قرار پاتے ہیں۔

۶۔ علمائے بعض احادیث کو قبول اور بعض کو ردّ کیوں کیا؟ اس کے وجوہ و اسباب کیا تھے؟

۷۔ محققین علمائے عربیت لغت و نحو کے مسائل میں احادیث سے استشہاد کرتے ہیں۔

اب ہم یکے بعد دیگرے ان پر مختصر بحث کرتے ہیں۔

جواب: ۱۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن کی طرح حدیث نبوی عہدِ رسالت میں کیوں نہ لکھی گئی؟ اس ضمن میں یہ امر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ قرآن کی کتابت آنحضورؐ کی

موجودگی میں وحی الٰہی کی بنا پر کی گئی تھی۔ اس لیے کہ قرآن کی تلاوت عبادت ہے۔ اور قرآن اپنی نظم و ترتیب اور الفاظ کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں ہے بلکہ من جانب اللہ نازل شدہ الفاظ کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ اگر قرآن کو عربوں کے حافظہ پر چھوڑ دیا جاتا اور اس کی حفاظت کے سلسلہ میں کتابت سے مدد نہ لی جاتی تو اس میں حروف کی کمی بیشی اور تبدیلی کا خطرہ دامنگیر تھا۔ بلکہ اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ ایک جملہ کی بجائے دوسرا جملہ رکھ دیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ قرآن کی نظم و ترتیب میں فرق آجاتا۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ عہد رسالت میں حدیث نبوی کے نہ لکھنے کا انحصار و مدار بھی وحی پر تھا۔ عدم کتابتِ حدیث کی بڑی وجہ یہ تھی کہ احادیث سے معنیٰ مقصود ہے الفاظ نہیں یہی وجہ ہے کہ حدیث کی تلاوت عبادت شمار نہیں ہوتی۔ اور اس کے الفاظ اور نظم و ترتیب کی بنا پر دوسروں کو مقابلہ کی دعوت نہیں دی گئی۔ مزید برآں اس کی روایت بالمعنیٰ جائز ہے۔

پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ الفاظِ قرآنی کی حفاظت خود شریعتِ اسلامیہ کی حفاظت ہے۔ اور حدیث بالمعنیٰ میں اُمت کے لیے یُسر و سہولت پائی جاتی ہے جس سے اس کا دوسروں تک پہنچانا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن کی طرح حدیث کے سلسلہ میں بھی یہ پابندی عائد کر دی جاتی کہ اس کو دوسروں تک انہی الفاظ میں پہنچایا جا سکتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے گئے ہوں۔ تو اس کی روایت کے ضمن میں اُمت طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہو جاتی۔ اور اگر حدیث نبوی کی طرح قرآن کی روایت بالمعنیٰ جائز ہوتی تو نفوسِ انسانی شریعت پر مطمئن نہ ہو سکتے۔ اور زنادقہ و ملاحدہ بڑی آسانی سے یہ بات کہہ سکتے تھے کہ ہم اس کو آسمانی کتاب ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے شریعت کو محفوظ کر لیا اور اُمت کے لیے آسانی بھی پیدا کر دی۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ حدیث کی روایت بالمعنیٰ کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ہیں۔

۱۔ راوی عربی زبان کے اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ ہو۔

۲۔ شریعت کے غایات و مقاصد کو جانتا ہو۔

۳۔ جس حدیث کی روایت بالمعنیٰ کرنا چاہتا ہے وہ جوامع الکلم کے قبیل سے نہ ہو۔

۴۔ وہ حدیث ایسی نہ ہو کہ اس کے الفاظ عبادت شمار ہوتے ہوں۔ مثلاً ادعیہ ماثورہ پر مشتمل احادیث۔

۵۔ راوی جس حدیث کی روایت بالمعنیٰ کا خواہاں ہے۔ اس کے الفاظ اسے یاد نہ ہوں۔

جب راوی ان شرائط کا حامل نہ ہو تو اس کے لیے حدیث کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں۔ اس لیے معلوم ہوا کہ حدیث کی روایت بالمعنیٰ کرنے سے اس کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ اور نہ اس میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

اگر سابقہ بیانات کے بعد بھی کوئی شخص یہ اعتراض پیش کرے کہ عہد رسالت میں حدیث نبوی کو قلم بند نہ کرنے سے وہ قابل اعتماد نہ رہی تو ہم کہیں گے کہ ایسا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بہتان طرازی کر رہا ہے کہ آپ وحی الٰہی کو دوسروں تک پہنچانے میں سہل انگاری سے کام لیتے تھے۔ یا یہ کہ حدیث نبوی دین میں شامل نہیں اور یہ دونوں باتیں کھلی ہوئی ضلالت ہیں۔

۲۔ دوسرے عنوان کا خلاصہ یہ ہے کہ تدوین حدیث کے بعد روایت حدیث کے سلسلہ میں اصل بات یہ ہے کہ جو الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ سے سنے جائیں ان کو دوسروں تک پہنچا دیا جائے۔ جب الفاظ یاد نہ ہوں تو سہولت کے طور پر روایت بالمعنیٰ کی اجازت ہے۔ احادیث نبویہ کے کتابوں میں مدون ہونے کے بعد سہولت کی یہ ضرورت باقی نہ رہی۔ لہذا احادیث کا اخذ و تحمل اور ان کی نقل و روایت انہی الفاظ میں واجب ٹھہری جو آنحضور سے سنے گئے ہوں۔

تدوین حدیث کا آغاز باقاعدہ طور پر پہلی صدی ہجری کے اختتام پر خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے حکم سے ہوا۔ مختلف دیار و امصار کے علماء نے اپنے حافظہ کی مدد سے یا محفوظ صحیفوں سے دیکھ کر حدیثیں جمع کرنا شروع کیں۔ احادیث کی تالیف و تدوین کا کام تاریخ کے مختلف اَدوار میں کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔ حتّٰی کہ تیسری صدی ہجری میں جس کو تدوین حدیث کا زرّیں دَور کہا جاتا ہے، حدیث کی پانچ بڑی کتب یعنی بخاری و مسلم و نسائی و ابوداؤد و ترمذی منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوگئیں۔

احادیث کی جمع و تدوین کرتے وقت علماء جو کچھ لکھتے تھے۔ اصل مسودہ کے ساتھ اس کا تقابل بھی کرتے جاتے تھے۔ مبادا بھول چوک کر اس میں کمی بیشی آگئی ہو۔ جب اپنی تحریر پر انہیں اطمینان ہو جاتا تو ان نوشتوں کو تغیّر و تبدّل سے بچانے کے لیے محفوظ کر لیتے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے اسلاف کی طرح وہ احادیث کو سینوں میں محفوظ بھی رکھتے تھے۔ اور اپنے شیوخ و اساتذہ سے اسانیدِ متصلہ کے ساتھ احادیث کو اخذ بھی کرتے تھے۔ بایں طور حدیث کی سفینوں میں جمع و تدوین اس کو سینوں میں محفوظ رکھنے کے پہلو بہ پہلو اس کی حفاظت و صیانت کے عوامل میں سے ایک جدید عامل تھا۔

ہم نے روایت بالمعنیٰ کے سلسلہ میں جو یہ بات ذکر کی ہے کہ کتبِ حدیث کی تدوین کے بعد اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اکابر محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔ ان میں امام ابو عمرو عثمان بن عبد الرحمٰن المعروف "ابن الصلاح" متوفی ۶۴۲ھ اپنے مقدمہ میں روایت بالمعنیٰ کے بارے میں علماء کا اختلاف ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"یہ اختلاف ان احادیث کے بارے میں باقی نہیں جو کتبِ حدیث میں جمع کر لی گئی ہیں۔ اب کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کتب میں محفوظ احادیث کے الفاظ تبدیل کر کے ان کی جگہ دوسرے ہم معنی الفاظ رکھ دے۔ جن لوگوں نے روایت بالمعنیٰ کی اجازت دی تھی، وہ اس وقت دی تھی جب الفاظ کے ضبط کرنے اور ان پر اصرار

کرنے میں تکلیف کا سامنا تھا۔ اور کتب حدیث میں جو احادیث موجود ہیں۔ ان کے بارے میں یہ دقت نہیں پائی جاتی مزید برآں اگر کسی کو الفاظ تبدیل کرنے کی اجازت بھی ہو تو وہ دوسرے کی تصنیف میں تو ایسا تصرف کرنے کا مجاز نہیں ہے۔" (مقدمہ ابن الصلاح و تدریب الراوی)۔

اس سے ملاحدہ کی یہ بات غلط ثابت ہوئی کہ راویان حدیث تمام عصور و ازمنہ میں احادیث نبویہ کو اپنے الفاظ میں روایت کرتے رہے ہیں۔

۳۔ تیسرا عنوان یہ تھا کہ صحابہ و تابعین اس بات کے حریص تھے کہ حدیث نبوی کو آنحضورؐ کے فرمودہ الفاظ ہی میں ادا کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ روایت بالمعنیٰ کا رواج عصر صحابہ و تابعین یعنی پہلی صدی ہجری میں تدوین حدیث سے پہلے تھا۔ مزید برآں روایت بالمعنیٰ کے سلسلہ میں سب راویان حدیث متفق بھی نہیں تھے۔ چنانچہ بعض راویوں کی یہ حالت تھی کہ جب حدیث کے الفاظ ان کو بھول جاتے تو بنا بر احتیاط روایت حدیث سے ہچکچاتے تھے کہ مبادا وہ حضورؐ کا مفہوم ادا نہ کر سکیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا تھا کہ چونکہ ان سے بڑھ کر حافظ و ضابط راوی موجود ہیں۔ اس لیے حدیث کو بیان نہ کرنے کی وجہ سے وہ کتمان علم کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ اور بعض راویوں کا طرز عمل یہ تھا کہ جب حدیث کے الفاظ یا ان کا کچھ حصہ بھول جاتا تو وہ اس کا معنیٰ و مطلب دوسروں تک پہنچا دیتے تاکہ وہ علم کے چھپانے والے نہ قرار پائیں۔

ایک صحابی نے ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! بسا اوقات میں آپ سے ایک حدیث سنتا ہوں اور اسے پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ ایک آدھ لفظ کی کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا "جب تم کسی حرام چیز کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینے والے نہ بنو تو روایت بالمعنیٰ میں کچھ مضائقہ نہیں۔ روایت بالمعنیٰ کے مجوزین اس حدیث پر عمل کرتے ہیں۔ نیز اس لیے کہ احادیث نبویہ کو

دوسروں تک پہنچانا واجب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ بنا بریں جب حدیث کا کوئی لفظ ذہن سے اُتر جائے اور اس کا معنیٰ و مطلب معلوم ہو تو اس کی ادائیگی بہ معنیٰ لفظ میں واجب ہوگی۔

مکحُول ذکر کرتے ہیں کہ میں اور ابو ازہر واثلہ بن اَسقع کے یہاں گئے اور عرض کی کہ ایسی حدیث بیان کیجیے جو آپ نے بذاتِ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ نہ اس میں وہم ہو نہ اضافہ نہ بھول چوک۔ واثلہؓ فرمانے لگے "کیا تم میں سے کسی نے قرآن کا کچھ حصہ پڑھا ہے؟ ہم نے عرض کی "جی ہاں" ! مگر ہمیں اچھی طرح یاد نہیں بلکہ ہم سے اس میں ایک آدھ لفظ کی کمی بیشی سرزد ہو جاتی ہے۔" فرمایا "قرآن تمہارے سامنے لکھا گیا اور تم اسے یاد بھی کرتے ہو۔ اس کے باوجود تمہارا دعویٰ ہے کہ اس میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ مگر احادیث کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ ممکن ہے ہم نے ایک حدیث صرف ایک ہی دفعہ حضورؐ سے سنی ہو اس لیے اگر ہم حضورؐ کا مفہوم اپنے الفاظ میں بھی ادا کر دیں تو تمہارے لیے یہی کافی ہے۔ (بیہقی)

ابو اُویس مسنداً بیان کرتے ہیں کہ ہم نے زُہری سے حدیث کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر کے بارے میں دریافت کیا تو وہ فرمانے لگے تقدیم و تاخیر تو قرآن کی شرح و تفسیر میں بھی ہو سکتی ہے، احادیث میں کیوں نہیں ہو سکتی؟ جب تم حدیث کا مفہوم بیان کر دو اور کسی حلال چیز کی حُرمت اور حرام چیز کی حلّت کے موجب نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ وکیع فرمایا کرتے تھے کہ "اگر روایت بالمعنیٰ کی اجازت نہ ہو پھر تو لوگ تباہ ہو گئے۔" (بیہقی)

جمہور علمائے سلف کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ جب حدیث کے الفاظ بھول جائیں تو روایت بالمعنیٰ جائز ہے۔ عہدِ سلف میں اسی پر عمل تھا۔ اسی سے علامہ ماوردی نے یہ بات اخذ کی ہے کہ روایت بالمعنیٰ کے جواز کے لیے حدیث کے اصلی الفاظ کا بھول جانا شرط ہے ماوردی فرماتے ہیں۔

"اگر راوی حدیث کے الفاظ بھول گیا ہو تو روایت بالمعنیٰ کر سکتا ہے اس لیے

کہ اس نے نبی کریمؐ سے دو چیزیں اخذ کی تھیں۔ ایک لفظ اور دوسرے معنیٰ۔ جب وہ ایک یعنی الفاظ کی ادائیگی سے قاصر ہے تو دوسرے یعنی معنی کا ادا کرنا اس پر واجب ہے۔ خصوصًا اس لیے کہ بعض اوقات اس کے ادا نہ کرنے سے ایک شرعی حکم کو چھپانا لازم آتا ہے۔ اگر نبی کریمؐ کے الفاظ راوی کو یاد نہ ہوں تو وہ دوسرے الفاظ میں آپ کے مفہوم کو بیان نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں جو وضاحت پائی جاتی ہے وہ دوسرے الفاظ میں نہیں"۔

امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں۔

"روایت بالمعنیٰ کی شرط یہ ہے کہ حضورؐ کے الفاظ از قسمِ عبادت (مثلاً دعا وغیرہ) نہ ہوں۔ نیز ایک شرط یہ بھی ہے کہ حضورؐ کے وہ الفاظ جوامع الکلم (ایسے جامع الفاظ جو قلیل الالفاظ اور کثیر المعانی ہوں) کے قبیل سے نہ ہوں"۔

اصحابِ رسولؐ کو جب روایت بالمعنیٰ کی شدید ضرورت ہوتی یا حضورؐ کے الفاظ میں شک گزرتا، تو حدیث کے خاتمہ پر ایسے الفاظ فرماتے جن سے حزم و احتیاط کا اظہار ہوتا۔ حالانکہ وہ حضورؐ کا معنیٰ و مفہوم سب سے بہتر جانتے تھے۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ روایت بالمعنیٰ خطرہ سے خالی نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک روز یہ الفاظ کہے کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا" یہ کہہ کر آپ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور گردن کی رگیں پھول گئیں۔ پھر کہنے لگے "او مثلہٗ او نحوہٗ او شبیہٌ بہٖ" یعنی آپ نے اسی قسم کے الفاظ اور اس سے ملتے جلتے الفاظ ارشاد فرمائے۔ (ابن ماجہ۔ حاکم)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب حدیث بیان کرتے تو کہتے "آپ نے یوں فرمایا یا آپ کی مانند"۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جب حدیث بیان کر کے فارغ ہوتے تو کہتے "او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" (یا جیسے نبی اکرمؐ نے

فرمایا)۔ (مسند دارمی۔ ابن ماجہ۔ احمد۔ الکفایہ)۔

روایت حدیث کرتے وقت صحابہ و تابعین کا یہ حال تھا کہ وہ روایت بالمعنیٰ کی اجازت اس وقت دیتے تھے جب راوی کو حدیث کے الفاظ بھول گئے ہوں اور وہ حدیث جوامع الکلم اور دعائیہ کلمات پر مشتمل نہ ہو۔ پھر حدیث کے آخر میں ایسے الفاظ کہتے جو حزم و احتیاط کے آئینہ دار ہوتے۔ اور اگر حدیث کے الفاظ میں غلطی ہوئی یا شک گزرا ہو تو اسی وقت بیان کر دیتے۔ اس کی نظیر کوئی قوم کسی زمانہ میں پیش نہیں کر سکتی یقین نہ آئے تو صحیحین اور دیگر کتب حدیث پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو راویانِ حدیث کے حفظ و ضبط، امانت و دیانت اور حقیقتِ حال کا پتہ چل جائے گا۔ ؎

اولئك اباءِ فجئني بمثلهم　　　اذا جمعتنا یا جریر المجامع

(یہ ہیں میرے بزرگ! جب ہم تم کسی محفل میں شریک ہوں تو اے جریر اگر ہمت ہے تو تم بھی میرے جیسے بزرگ لے آؤ۔

صحابہ اکثر و بیشتر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی روایت کرتے تھے جو وہ آپ سے سنتے۔ وہ اس بات کے حد درجہ حریص تھے اس لیے کہ حضورؐ افصح العرب تھے اور آپ کی احادیث دین اسلام کا اہم جزو ہیں۔

قرآن کریم میں فرمایا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى۔ (النجم)　　　اور ہمارا رسول اپنی مرضی سے نہیں بولتا وہ تو وحی ہے جو کی جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل امور اس ضمن میں صحابہ کا ساتھ دیتے تھے۔

۱۔ صحابہ کرام بلا کا حافظہ رکھتے تھے۔ وہ حد درجہ ذہین و فطین تھے۔ قوت حافظہ کے سلسلہ میں عربوں کی عجیب و غریب کہانیاں تاریخ کے اوراق پر ثبت ہیں۔ صرف ایک دو دفعہ سن کر بڑے لمبے لمبے قصیدے اور خطبے انہیں یاد ہو جایا کرتے تھے۔ اور عمر تا زندگی

نہ بھولتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک ناخواندہ قوم کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ ان کے سینے ان کے دفتر اور ان کے حافظے ان کی کتابیں تھیں۔ کثرت مشق سے ان کی قوت حافظہ بہت تیز ہو گئی تھی۔ سخت غلطی ہو گی کہ صحابہ کا موازنہ دیگر اقوام یا عصرِ حاضر کے لوگوں کے ساتھ کیا جائے۔

ب۔ اکثر راویانِ حدیث نے احادیث نبویہ کو لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سہو و خطا یا پیرانہ سالی کی وجہ سے ضائع ہو جائیں۔ تابعین میں صحابہ کی نسبت کتابتِ حدیث کا زیادہ رواج تھا۔ اس طرح سینوں میں محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ کتابتِ حدیث احادیث نبویہ کے عوامل تحفظ میں سے ایک زبردست عامل کی حیثیت رکھتی تھی۔ صحابہ و تابعین میں سے جو حضرات کتابت حدیث کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کتابت پر بھروسہ کر کے حفظ وضبط کو ترک نہ کیا جائے۔ یا اس لیے کہ انہوں نے بھی نبی کریمؐ سے یہ احادیث سن کر زبانی یاد کر رکھی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے تلامذہ بھی اسی طرح اُن احادیث کو یاد کر لیں یا انہیں یہ خدشہ دامنگیر تھا کہ احادیث کی جمع و تالیف سے ان کی قوت حافظہ کمزور نہ پڑ جائے۔

ج۔ جو مجالس احادیث کے اخذ و تحمل اور نقل و روایت کے لیے منعقد کی جاتی تھیں اور مختلف بلاد و امصار کے جو سفر طلب حدیث کے سلسلے میں اختیار کیے جاتے تھے، تحفظ حدیث کے سلسلہ میں بڑے کار آمد ثابت ہوئے۔ ان کی وجہ سے حدیثیں ان کے سینوں میں محفوظ رہیں۔ اور وہ احادیث میں تردد و تذبذب کی بیماری میں مبتلا ہونے سے بچ گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کی دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں جو حکم دیا تھا، صحابہ و تابعین نے بطریق احسن اس کی تعمیل کر دی۔ مختصر یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی کتاب وسنت کے درس و تدریس اور نقل و روایت میں کھپا دی۔

مندرجہ بالا وجوہ و اسباب کی روشنی میں ہم بڑے وثوق و اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ

روایت بالمعنی کی اجازت اسی وقت تھی، جب عربی زبان میں فساد اور بگاڑ پیدا نہیں ہوا تھا۔ لغت و شرع کے ائمہ کبار مجبوری کی صورت میں اس کی اجازت دیا کرتے تھے۔ مزید براں صحابہ کو احادیث کے الفاظ میں نسیان کا جو عارضہ پیش آتا تھا وہ معمولی الفاظ میں ہوا کرتا تھا۔ مثلاً یہ کہ کوئی حرف عطف یا مفرد لفظ بھول جائے یا کوئی جملہ یاد نہ رہے۔

۴۔ ایک عنوان یہ ہے کہ احادیث کے الفاظ میں جو فرق و اختلاف ہوتا ہے اس کی وجہ صرف روایت بالمعنیٰ ہی نہیں بلکہ اس کے اور وجوہ بھی ہوتے ہیں۔ یہ سخت غلطی ہے کہ ایک ہی مفہوم ادا کرنے والی مختلف احادیث کے اختلاف الفاظ کو روایت بالمعنیٰ پر محمول کیا جائے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس زمان و مکان اور احوال و واقعات کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح آپ کے سامعین بھی ایک طرح کے نہیں ہوا کرتے تھے۔ کوئی فتویٰ پوچھنے آتا، کوئی جھگڑا چکانے آتا، کوئی وفد کی صورت میں حاضر خدمت ہوتا۔ ان مجالس میں حضور کے الفاظ گرامی بلحاظ اختصار و طوالت وضوح و خفا و تقدیم و تاخیر و حسب موقع و مقام مختلف ہوا کرتے تھے۔

مثلاً آپ سے افضل الاعمال کے بارے میں دریافت کیا گیا تو حضورؐ نے ہر سائل کو جداگانہ جواب سے نوازا۔ اسی طرح جب آپ سے افضل الجہاد یا افضل الصدقہ یا "البر والاثم" کے معنی و مفہوم سے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے ہر سائل کو جو جواب دیا، دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک جاہل شخص خیال کر سکتا ہے کہ یہ ایک قسم کا تعارض ہے یا یہ کہ راویوں نے حدیث کے الفاظ کو اچھی طرح ضبط نہیں کیا۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم روحانی طبیب تھے۔ وہ ہر شخص کو اس کے حسب حال جواب دیتے تھے۔ یہ جواب یا تو اسی کے لیے مفید ہوتا تھا۔ یا جملہ حالات میں سب لوگوں کے لیے سود مند ہوتا تھا۔ یا صرف اس حالت سے ہم آہنگ ہوتا۔ جس میں وہ سوال دریافت کیا گیا تھا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اذان و اقامت و تشہد نیز نماز اور بعد از نماز پڑھے جانے والے

اذکار و ادعیہ کے الفاظ مختلف ہیں۔ حالانکہ سب احادیث کے راوی عادل و ضابط ہیں فنِ حدیث سے بیگانہ شخص یہ خیال کرے گا کہ ان میں تناقض پایا جاتا ہے۔ یا یہ کہ ان کے راوی حفظ و ضبط سے عاری ہیں یا اس کی وجہ روایت بالمعنیٰ ہے۔ حالانکہ درا صل یہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ ہیں۔ گویا آپ نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہ سب الفاظ جائز اور درست ہیں۔ اور ان کے ذریعے اُمّت کو وسعت و سہولت دینا پیشِ نظر ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ وارد ہونے والے وفود کو جن تعلیمات و ارشادات سے نوازا۔ اسی طرح حضورؐ نے جن صحابہ کو داعی و مبلغ بنا کر اطرافِ مدینہ میں بھیجا اور جو قیمتی مشورے ان کو مرحمت فرمائے۔ مزید برآں مختلف بلاد و امصار کے ملوک و سلاطین کو جو گرامی نامے ارسال کئے اور جو زرّیں نصائح سے معمور و بھرپور تھے۔ ان سب کے الفاظ مختلف ہیں اور ان میں حسبِ موقع و مقام لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق خطاب کیا گیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ، عید، غزوات اور دیگر اہم مواقع پر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان خطبات میں آپ اسلامی احکام پر روشنی ڈالتے۔ دین اسلام کے قواعد و ضوابط جنت و جہنم کے حالات اور علاماتِ قیامت و عذاب قبر کا ذکر فرماتے۔ ان امور کا ذکر و بیان کرتے وقت موقع و محل کی مناسبت سے آپ کے الفاظ کم و بیش اور مختلف ہوا کرتے تھے۔ سفر ہو یا حضر، آپ کی مجالس مبارکہ بکثرت ہوا کرتی تھیں۔ ان میں آپ دین کے احکام بیان فرماتے۔ لوگوں کی غلطیوں کی اصلاح فرماتے اور خدا سے ڈرتے رہنے کی تلقین فرماتے۔ اخلاق جلیلہ کی ترغیب فرماتے اور اخلاق ذمیمہ سے روکتے بسا اوقات ایسا ہوتا کہ عبرت آموزی کے نکتہ خیال سے آپ اُمم سابقہ کے احوال و اخبار پر روشنی ڈالتے۔ ایسا کرتے وقت آپ کا طرز و انداز مختلف ہوتا تھا۔ اور آپ سامعین کے حالات کو پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد کبھی مفصل ہوتا اور گاہے مختصر۔ کبھی

کھل کر بات کرتے اور گاہے مبہم و مجمل طور پر۔

اب سوال یہ ہے کہ مندرجہ صدر بیانات کے پیش نظر حضورؐ کے الفاظ میں جو اختلاف و تنوع پایا جاتا ہے کیا اسے تناقض پر محمول کیا جائے؟ یا یہ کہا جائے کہ راویوں نے جو کچھ آپ سے سنا تھا۔اس کو ضبط نہ کر سکے۔اور روایت بالمعنیٰ کی جس کی وجہ سے یہ اختلاف و تناقض وجود پذیر ہوا۔ دراصل ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی۔ بخلاف ازیں اس کی وجہ تعلیمی حکمتِ عملی و موقع محل کی مناسبت اور وحی الٰہی کی دعوت و تبلیغ میں تدریج و تلطف تھی اور بس۔سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم افراد کو وہی احکام و مسائل اور مواعظ و نصائح سنایا کرتے تھے جو ان کے حسب حال ہوتے تھے۔

دُور جانے کی کیا ضرورت ہے قرآن عزیز ہمارے سامنے ہے۔جس میں باطل کا گذر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔قرآن عزیز میں ایک ہی نبی کا واقعہ مختلف سورتوں میں جداگانہ اور متنوع طریقوں سے مذکور ہے۔بعض جگہ پورا واقعہ مختصراً یا مفصلاً مذکور ہے۔ایسا بھی ہوا ہے کہ اس واقعہ کا ایک حصہ ایک سورت میں مذکور ہے اور دوسرا جزء دوسری سورت میں پھر ایک حصہ مختصراً مذکور ہے اور دوسرا تفصیلاً۔عبارت اور الفاظ میں ہر جگہ تنوّع و اختلاف پایا جاتا ہے۔

مثلاً حضرات آدم و نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے حالات و واقعات کیا ہر واقعہ کے ذکر و بیان میں اختلاف کو تناقض پر محمول کیا جائے گا۔جیساکہ منافقین اور ملاحدہ کا خیال ہے؟ یا یہ کہ اس میں تناقض کی کوئی بات نہیں۔بلکہ یہ مبنی بر حق و صداقت ہے۔واقعہ کا ایک جزو دوسرے کی تصدیق کرتا اور مفصل مجمل کی شرح و توضیح پیش کرتا ہے۔واقعہ کا ایک جزو جو ایک جگہ مذکور ہے، اگر اس کے اطراف کو دوسری جگہ مذکور حصہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو دونوں کے اجزاء مل جل کر پورے واقعہ کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔یہ سب کچھ اختلافِ حال و مقام کی وجہ سے ہوا۔جیساکہ علمائے راسخین پر بخوبی

عیاں ہے۔ ان کے ورد زبان ہمیشہ یہ الفاظ رہتے ہیں کہ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا (یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے)۔

اگر قرآن عزیز حفظاً و کتابۃً بتواتر ثابت نہ ہوتا بلکہ حدیث نبوی کی طرح بطریق احاد منقول ہو کر ہم تک پہنچتا تو اس میں اسی شبہ کا اظہار کیا جا سکتا تھا جو حدیث کے بارے کیا جا رہا ہے۔ مگر خداوند کریم نے نقل متواتر کے ذریعے قرآن کریم کو شکوک و شبہات کی آماجگاہ بننے سے بچا لیا۔ تاکہ حدیث نبوی کی صداقت کے لیے عمدہ نمونہ قرار پائے۔ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ۔

۵۔ پانچواں عنوان یہ ہے کہ احادیث کے مشکوک ٹھہرنے سے باقی علوم بھی مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے علوم میں سے کوئی علم بھی ماسوا علم حدیث کے ایسا نہیں جس میں ثقہ اور ضابطہ شیوخ و اساتذہ تک اسانید پہنچانے کا التزام کیا گیا ہو۔ پھر یہ اسانید بھی متعدد و متنوع ہوں۔ اس کے ساتھ راویان حدیث —— خواہ شیوخ ہوں یا تلامذہ —— کے احوال و اخبار جرح و تعدیل رحلت و اقامت اور ان کی تاریخ ولادت و وفات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہو۔ صرف علم حدیث ہی اس سعادت سے بہرہ مند ہے کہ اس میں رجال و طبقات پر کتب تصنیف کی گئی ہیں۔ جن کا تعلق تمام عصور و ازمنہ کے ساتھ ہے۔ کتب اسماء الرجال کی مدد سے حدیث نبوی کے ہر راوی کے تفصیلی حالات معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ادب و تاریخ یا کسی دوسرے علم کے راویوں کے بارے میں اس قسم کے معلومات حاصل کرنا چاہے تو سعی بسیار کے باوصف اس سے قاصر رہے۔ خواہ وہ کتنا ہی ذہین و فطین ہو اور اس کے پاس مراجع و مصادر کی کتنی ہی فراوانی کیوں نہ ہو۔

خداوند کریم و رحیم نے سنت نبوی کے لیے یہ سعادت مقدر کر رکھی تھی۔ کہ ہر قریہ اور ہر زمانہ میں اکابر ائمہ حدیث اور جلیل القدر علما اس کی خدمت و حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے

ہوں گے۔ اس لیے کہ حدیث نبوی بنصِ قرآنی وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ قرآن عزیز کی شارح اور اس کے مقاصد و غایات کی تفصیل پیش کرتی ہے (النحل) لہٰذا حدیث کی حفاظت گویا قرآن کی حفاظت ہے۔ اور اس میں توجہ و انہماک خواہ درس و تدریس کی شکل میں ہو یا سند و متن کے اعتبار سے قرآن عزیز ہی میں محنت و کاوش کا مترادف ہے۔ جس کی بقا کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود قبول فرمائی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ — ہم نے ہی قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اگر ہم اعداءِ اسلام اور داعیانِ دہریت و الحاد کی باتوں پر کان دھر کر ان کے مزعومہ شکوک و شبہات کو درخورِ اعتنا سمجھ لیں تو تمام علوم سے ہمارا اعتماد اُٹھ جائیگا اس کی وجہ یہ ہے کہ دیگر علوم و فنون کے بانی علماء نے اس محنت و کاوش اور تحقیق و تمحیص کا عشر عشیر بھی صرف نہیں کیا۔ جو محدثین نے حدیث کی حفاظت و صیانت، اس کی چھان پھٹک اور راویوں کے احوال و اخبار کے معلوم کرنے کے سلسلہ میں انجام دی تھیں۔ جب حدیث نبوی کا مستحکم قلعہ جس کے استحکام کی شہادت تاریخ کے اوراق بھی پیش کرتے ہیں، منہدم ہو گیا تو کوئی علم بھی ایسا باقی نہیں رہے گا۔ جس کی جانب ہم رجوع کریں۔ اور اس کو وثوق و اعتماد کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس سے بڑھ کر حماقت و جہالت اور کیا ہو سکتی ہے۔

بے دین منکرین حدیث کے عزائم و مقاصد کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ لوگ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ حاملین سُنت پر بہتان طرازی کر کے اور حسد و عداوت کی بنا پر ان کو ہدفِ طعن و جرح بنا کر لوگوں کو حدیث نبوی کی پیروی سے روکتے ہیں۔ حیرت یہ ہے۔

کہ اس کا نام انہوں نے آزاد تنقید، تحقیقی مطالعہ اور طریقہ علمیہ رکھا ہے۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ جہلا اور زنادقہ نے جو حدیثیں وضع کی تھیں اس کی ذمہ داری وہ سنت نبوی کے حامی علماء پر ڈالتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ کتب ادب و تاریخ اور جاہل شیعہ اور معتزلہ سے ضعیف حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ اور ان کی بنا پر ان احادیث کو رد کر دیتے ہیں۔ جن کی صحت پر اجماع ہو چکا ہے۔ جب ان احادیث ضعیفہ کو نقد و جرح کی ترازو میں رکھ کر جانچا پرکھا جاتا ہے تو ان کی قلعی کھل جاتی ہے۔

زنادقہ نے ایک حدیث وضع کر رکھی ہے جس کو محدثین کی نگاہ میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ

ما اتاکم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ۔ — میری طرف سے جو حدیث تمہارے پاس پہنچے اسے کتاب الٰہی پر پرکھ لیا کرو۔

منکرین حدیث اس موضوع حدیث کی بنا پر بکثرت ایسی احادیث کو ٹھکرا دیتے ہیں جن کو علما ہر جگہ اور ہر موقع پر قبول کرتے چلے آئے ہیں۔ بظاہر وہ قرآن عزیز کی عزت و عظمت کا ڈھنڈورا پیٹتے نظر آتے اور یہ کہتے پھرتے ہیں کہ قرآن کے سوا دوسری کوئی چیز حجت نہیں۔

حدیث نبوی کے سلسلہ میں یہ ایک گروہ کا حال ہے۔ دوسرے فریق نے تاویلات باطلہ کے ذریعے قرآن کریم کو بازیچہ طفلاں بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ لوگ تجدید کے علمبردار اور قدامت کے خلاف ہیں۔ مگر نصب العین دونوں کا ایک ہے اور وہ ہے — اسلام کو ملیامیٹ کرنا اور لوگوں کو اس کی پیروی سے باز رکھنا — مگر خداوند کریم نے اصحاب امانت و دیانت علماء کے ذریعے اپنے دین کو بچا لیا۔ علماء نے ان کی اباطیل کا توڑ مہیا کیا اور یہ بے دین اپنے عزائم قبیحہ میں خائب و خاسر ہوئے۔ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔

۶۔ چھٹا عنوان یہ ہے کہ علما نے بعض احادیث کو ترک کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ حدیث کی وقعت و اہمیت کے قائل نہ تھے اور وہ خواہشاتِ نفس کے بندے تھے۔ پناہ بخدا ایسا ہرگز نہیں۔ وہ دین کے رہنما و پیشوا اور حامیِ سنت تھے۔

قرآن عزیز میں فرمایا۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔	جو لوگ نبی کریم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے کہ وہ فتنہ کی لپیٹ میں آجائیں یا دردناک عذاب میں مبتلا ہوں۔
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔	اور خواہش کی پیروی نہ کر وہ تجھے اللہ کی راہ سے برگشتہ کر دے گی۔
وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ۔	اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہے جو ہدایتِ خداوندی کے سوا اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے

سرورِ کائناتؐ نے ارشاد فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا اس کی خواہشات جب تک دین کے تابع نہ ہو جائیں جس کو میں لایا ہوں۔" (بخاری و مسلم)

حدیث پر ترکِ عمل کی علما کے نزدیک کئی صورتیں ہیں۔

۱۔ وہ حدیث انہیں پہنچی نہ ہو۔

۲۔ حدیث تو ان کو پہنچ گئی مگر ان کے نزدیک وہ صحیح نہیں۔

۳۔ حدیث صحیح بھی ہے مگر شریعت کی کوئی قوی تر دلیل اس کی معارض ہے۔

۴۔ وہ حدیث منسوخ ہے۔

و دیگر وجوہ جن کی تفصیل شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام" میں پیش کی ہے۔ ہم قبل ازیں مقدمہ میں بحث کر چکے ہیں اور اب

اس میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ و باللہ التوفیق۔

اول :- وہ عقائد جن پر اسلام کی صحت موقوف ہے عقلی و نقلی دلائل قطعیہ سے ثابت ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور وحدانیت پر ایمان۔ ذاتِ باری کا اوصافِ کمال و جلال کے ساتھ متّصف اور علاماتِ حدوث و نقصان سے پاک ہونا۔ اللہ تعالیٰ کے ملائکہ، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور اچھی و بُری تقدیر پہ ایمان لانا۔ بعث بعد الموت پر ایمان۔ جنّت و جہنّم کی جزا و سزا پر ایمان۔

اس قسم کے عقائد یا تو صریح عقل اور نصوصِ قرآن سے ثابت ہوتے ہیں اور یا ان احادیث سے جو لفظاً و معناً متواتر ہوں۔ اگر اس ضمن میں کوئی حدیث غیر متواتر بھی وارد ہو تو اس کو ردّ نہیں کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ دلیلِ قطعی کی مؤیّد ہے۔

جہاں تک ان عقائد کا تعلق ہے جن پر ایمان و اسلام کا تحقق موقوف نہیں تو ان کو ایسی اخبارِ آحاد صحیحہ کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ جو قرآن کریم، احادیث متواترہ، اجماع اور عقلِ صریح کے معارض نہ ہوں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا اوصافِ کمال میں سے کسی کے ساتھ تفصیلاً موصوف ہونا۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ۔ آئندہ پیش آنے والے غیبی واقعات سے آگاہ کرنا۔ قبر کا عذاب و ثواب۔ روز قیامت شفاعت کی تفصیلات نیز وزنِ اعمال و رؤیتِ باری تعالیٰ وغیرہ۔

مزید برآں ایسے عقائد کے بارے میں جو احادیث آحاد وارد ہوتی ہیں، اکثر و بیشتر ان کے طُرق و اسانید متعدد ہوتے ہیں اور اس طرح وہ شہرت یا تواتر کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ حدیث میں کوئی خاص قرینہ پایا جاتا ہے یا کسی قرآنی آیت یا اجماع سے اس کی تائید و حمایت ہوتی ہے۔ جس سے وہ یقینی اور قطعی دلیل کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ ایسے عقائد کا منکر شخص خود بھی گمراہ، فاسق، بدعتی ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا ہے۔

دوم :- قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں کہ حدیث غیر متواتر، جس کو محدثین کی اصطلاح میں خبرِ واحد کہتے ہیں، اس سے ایسے عقائد کے بارے میں احتجاج کر سکتے ہیں جس پر اصل ایمان موقوف نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے عقائد میں ظنِ قوی ہی کافی ہے۔ یا اس لیے کہ اکثر محققین کے نزدیک خبرِ واحد سے بھی یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اس کے طُرق متعدد ہوں۔ یا ظواہرِ قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہو۔ یا اس پر علمائے دین کا اجماع منعقد ہو چکا ہو۔

امام مالک، احمد بن حنبل اور محدثین کی ایک جماعت سے منقول ہے کہ خبرِ واحد صحیح سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ امام ابن حزم نے اس کو داؤد ظاہری سے نقل کیا اور خود اس کی تائید کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی شرح نخبہ میں لکھتے ہیں کہ خبرِ واحد جس میں کوئی قرینہ پایا جاتا ہو، یقینی علم کا فائدہ دیتی ہے۔ مثلاً وہ حدیث جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہو یا حدیث مشہور جب متعدد طُرق سے منقول ہو اور ضعفِ رُواۃ و عِلَل سے پاک ہو۔ یا وہ حدیث مسلسل جس کے تمام راوی امام اور حافظ ہوں اور وہ حدیث غریب بھی نہ ہو۔" (شرح نخبہ)

امام بخاری نے اپنی صحیح کے آخر میں "کتاب التوحید" کے نام سے ایک عنوان قائم کیا ہے۔ جس میں احادیثِ صحیحہ میں سے اخذ کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے اوصافِ جلال و کمال ثابت کیے ہیں۔ اس کی شرح و توضیح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

"امام بخاری نے کتاب التوحید میں یہ انداز اختیار کیا ہے کہ وہ صفاتِ باری سے متعلق احادیث ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر حدیث ایک باب میں ذکر کرتے ہیں اور اس کی تائید میں ایک قرآنی آیت لاتے ہیں۔ یہ طرز و انداز اختیار کر کے امام بخاری نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ اخبارِ آحاد سے صفاتِ الٰہی کا اثبات نہیں ہوتا۔ نیز

یہ کہ جو شخص صفاتِ الٰہی سے انکار کرتا ہے وہ کتاب و سنت دونوں کا منکر ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب "کتاب الرد علی الجھمیہ" میں بسند صحیح امام بخاری کے شیخ الشیخ سلام بن ابی مطیع کے بارے میں نقل کیا ہے کہ موصوف نے مبتدعین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "خدا انہیں غارت کرے وہ احادیث کا انکار کیوں کرتے ہیں؟ بخدا حدیثیں کوئی چیز ایسی نہیں جو قرآن میں نہ ہو۔ مثلاً مندرجہ ذیل قرآنی آیات۔

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔

اور دیگر آیات۔ سلام بن ابی مطیع عصر سے لے کر تا غروب آفتاب قرآنی آیات تلاوت کرتے رہے۔ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۳۰۴)۔

سوم:۔ صفاتِ الٰہی: امام محمد بن حسن شیبانی فرماتے ہیں۔

"مشرق و مغرب کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ خداوند کریم کی جو صفات قرآنِ کریم اور احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں بلا تشبیہ و تمثیل ان پر ایمان لایا جائے۔ جو شخص جہم بن صفوان کی پیروی میں صفاتِ الٰہی کی تفسیر و توضیح کرتا ہے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی جماعت سے باہر نکل گیا۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کو "لاشئ" (کچھ نہیں) قرار دیتا ہے۔"

محدث ابن ابی حاتم مناقب شافعی میں یونس بن عبدالاعلیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کو فرماتے ہوئے سنا کہ "اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات ہیں جن کو کوئی شخص رد نہیں کر سکتا۔ جو شخص حجت ثابت ہو جانے کے بعد اس کی خلاف ورزی کرے۔ اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔ البتہ قیام حجت سے پہلے بنا بر جہالت اس کو معذور تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ صفاتِ الٰہی کا علم عقل و فکر سے حاصل نہیں

ہو سکتا۔ ہم صفاتِ الٰہی کا اثبات کرتے اور تشبیہ و تمثیل کی نفی کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود اس نے فرمایا۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ — اس جیسی کوئی چیز نہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں۔

"یہ روایات ثابت ہیں اس لیے ہم ان پر ایمان لاتے ہیں اور کسی وہم میں مبتلا نہیں ہوتے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ صفاتِ الٰہی کی کیفیت کیا ہے۔ امام مالک ابن عُیَیْنَہ اور ابن مبارک بھی صفاتِ الٰہی کو بلاکیف تسلیم کرتے ہیں۔ اہل السنت علماء کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ البتہ جھمیہ صفاتِ الٰہی کے مُنکر ہیں۔ ان کے نزدیک صفاتِ الٰہی کا اثبات تشبیہ ہے۔

اسحاق بن راھَوَیہ فرماتے ہیں کہ "تشبیہ اس وقت لازم آتی ہے جب یہ کہا جائے کہ اللہ کے ہاتھ ہمارے جیسے اور اس کے کان ہمارے کانوں جیسے ہیں"۔ سورہ المائدہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بقول ائمہ کرام ہم ان احادیث پر بلا تشریح و تفصیل ایمان لاتے ہیں۔ امام ثوری، مالک، ابن عُیَیْنَہ اور ابن مبارک کا یہی زاویۂ نگاہ ہے"۔

امام ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں۔

"جو صفاتِ الٰہی کتاب و سُنت میں وارد ہوئی ہیں اہل السُّنت اجماعاً ان کو بلاکیف تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ جھمیہ خوارج اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اس کا اقرار و اعتراف "تشبیہ" ہے۔ اہل السنّت جھمیہ کو "مُعطِّلہ" کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ذاتِ الٰہی کو صفاتِ الٰہی سے عاری مانتے ہیں"۔

امام الحرمین "الرسالۃ النظامیہ" میں فرماتے ہیں۔

"صفاتِ الٰہی کے بارے میں علماء کے نظریات مختلف ہیں۔ بعض علماء کتاب و سنّت میں واردشدہ صفات کی تاویل کرتے ہیں۔ ائمہ سلف ان کی تاویل نہیں کرتے

بلکہ ان کو ظاہر پر محمول کر کے ان کے معانی اللہ تعالیٰ کو تفویض کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ہماری ذاتی رائے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں علمائے سلف کا اتباع ہے۔ اس لیے کہ قطعی دلیل سے اجماعِ اُمت کی حجیت ثابت ہوتی ہے۔ اگر صفاتِ الٰہی کی تاویل ضروری ہوتی تو وہ فروعی مسائل میں مشغول ہونے کے بجائے ان کی تاویل کا اہتمام کرتے۔ جب عصر صحابہ و تابعین کا اجماع تاویل سے باز رہنے پر ہوا تو ہمیں بھی اس روشنی پر چلنا چاہیے۔"

(فتح الباری ج ۳ ص ۳۴۲)

مندرجہ صدر بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ائمہ سلف نے ان احادیث صحیحہ کو رَد نہیں کیا جو صفاتِ الٰہی پر مشتمل ہیں۔ بلکہ وہ ان پر اسی طرح ایمان لائے تھے۔ جس طرح وہ وارد ہوئی تھیں۔ البتہ وہ ان کے معانی و مطالب میں نہیں اُلجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک خیال کرتے تھے احادیث صحیحہ کا انکار علمائے سلف نے نہیں بلکہ جہمیہ اور دیگر مبتدعین نے کیا ہے۔ اور ان کو قرونِ ثلاثہ کے علماء میں کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں۔ حافظ ابنِ حجر فرماتے ہیں۔

" اہل الحدیث کے سوا دوسرے لوگوں کا یہ شیوہ ہے کہ وہ احادیث صحیحہ کو رد کر دیتے ہیں۔ ائمہ حدیث کو ہدفِ نقد و جرح بناتے ہیں۔ حالانکہ ان کی مرویات میں توجیہہ و تاویل کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس کی وجہ قصورِ فہم و ادراک کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لیے شارح کرمانی کا قول ہے کہ ثقہ راویوں کو خطاکار قرار دینے کی ضرورت نہیں صفاتِ الٰہی سے متعلق جو احادیث انہوں نے روایت کی ہیں، ان کا حکم وہی ہے جو متشابہات کا ہوتا ہے۔ یعنی یا تو ان کا معنی و مفہوم اللہ تعالیٰ کو سونپ دیا جائے اور یا ان کی تاویل کی جائے۔" (فتح الباری ج ۱۳ ص ۳۳۹)۔

قبل ازیں ہم اس حقیقت پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ علمائے سلف تفویضِ صفات

الٰہی کا معنی و مطلب اللہ تعالیٰ کو سونپنا) کی روش پر گامزن تھے لہٰذا ہم بھی اس کے سوا کسی اور بات کو تسلیم نہیں کرتے۔

چہارم:۔ نصوص شرعیہ کو ان کے ظواہر پہ محمول کیا جائے گا۔ بشرطیکہ عقل صریح یا نقل صحیح یا اجماع ظاہر کی بنا پر ان کو ظاہری مفہوم سے ہٹانا ضروری نہ ہو، نصوص کو کسی طرح بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح خواہش نفس کی بنا پر یا غائب کو حاضر پر قیاس کر کے یا استبعادِ عادی کے باعث کسی نص کے ظاہری مفہوم کو رد نہیں کر سکتے۔ اسی طرح کسی نص کے ظاہری مفہوم کو اس لیے بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ان اصول و قواعد کے خلاف ہے جس پر یہ جہان چل رہا ہے۔ جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر جہان کا ایک اپنا نظام ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے اپنے اصول و قواعد ہیں جن کے مطابق وہ چل رہا ہے۔

بنا بریں ان احادیث کو رد کر دینے کی کوئی وجہ جواز نہیں۔ جن میں دجّال یا نزولِ عیسیٰ علیہ السلام یا آفتاب کے مغرب سے طلوع پذیر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے یا وہ احادیث جن میں عذاب قبر یا نبی کریمؐ کی شفاعت یا رُویت باری تعالیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان احادیث کو تسلیم نہ کرنا سخت غلطی ہے۔ جن میں نبی کریمؐ کے سینہ کو چاک کرنے کا ذکر کیا گیا ہے یا چاند کے شق ہو جانے کا ذکر ہے یا اِسراء و معراج اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ کے حسّی معجزات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جب ان سب خارقِ عادت امور و افعال کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے تو اس پر اعتراض کیا ہے؟ آسمان ہو یا زمین، اللہ تعالیٰ کسی امر کے انجام دینے سے بھی قاصر و عاجز نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ معجزات کی اساس خوارقِ عادات پر رکھی گئی ہے۔ ورنہ ان کو معجزہ قرار دینا ہی درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ جس شخص کو جس بات سے نوازنا چاہے وہ ایسا کر سکتا ہے۔ آیت قرآنی "لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا"

معجزات کے منافی نہیں۔ اس آیت کا تعلق اہل اسلام اور کفار کی جنگ کے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو آزماتا ہے۔ آخر کار غلبہ مسلمانوں ہی کو ہوتا ہے۔ جب لوگ رسولوں کی تکذیب کرتے اور ان کے احکام سے بغاوت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر سخت گرفت کرتا ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا۔

"اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھوں نے اپنے رب اور رسولوں کے حکم سے بغاوت کی۔ ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور بہت برے عذاب میں مبتلا کیا۔ اس نے اپنے کیے کا مزا چکھا اور اس کا انجام خسارے کا ہوا۔ اور اگر کفار تم سے لڑیں تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور کوئی دوست اور مددگار نہ پائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو اس سے قبل جاری رہی ہے۔"

یہ ہے ان آیات کا سیاق وسباق۔ یہ حد درجہ کی حماقت ہوگی کہ صرف ظاہری آیت کو دیکھ کر بلا سوچے سمجھے ان احادیث کا انکار کر دیا جائے۔ قرآن عزیز نے صراحۃً بعض انبیاء کے حسّی معجزات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ و عیسیٰ و ابراہیم علیہ السلام اب سوال یہ ہے کہ کیا زنادقہ اور ملاحدہ کی طرح ان معجزات کا صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ یہ خارقِ عادت ہیں؟ یا راسخین فی العلم کی طرح ان نصوص کو یہ کہہ قبول کیا جائے کہ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اہل حق ہی کا مسلک قرین حق وصواب ہے۔ اس لیے کہ احادیث بھی خدا کی نازل کردہ ہیں۔

قرآن عزیز میں فرمایا۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔	اور ہمارا رسول اپنی مرضی سے نہیں بولتا وہ تو وحی ہے جو کی جاتی ہے۔

پنجم:۔ پانچواں عنوان احادیث نبویہ سے لغت ونحو میں استشہاد کرنے سے

متعلق ہے۔

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ کتب حدیث کی تدوین کے بعد روایت بالمعنیٰ کا جواز باقی نہیں رہا۔ روایت بالمعنیٰ کا رواج پہلی صدی ہجری میں عربی زبان میں بگاڑ پیدا ہونے سے قبل اگرچہ پایا جاتا تھا مگر بہت کم اور شاذو نادر۔ راویانِ حدیث اس بات کے دلدادہ تھے کہ حدیث کی روایت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی الفاظ میں کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین علمائے عربیت نے احادیث نبویہ سے اثبات لغت و قواعد نحو کے سلسلہ میں استشہاد کو جائز قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل اکابر کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

علامہ رضی۔ البدر الدمامینی۔ صاحب خزانۃ الادب۔ ابن مالک۔

خزانۃ الادب کی عبارت اس ضمن میں نہایت جامع ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ابن مالک کے لغت و نحو کے سلسلہ میں حدیث نبوی کے ساتھ استدلال جائز ہے۔ شارح رضی کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ مگر ان کے نزدیک اہل بیت کے کلام سے بھی احتجاج درست ہے۔ ابو حیان اور ابن الضائع حدیث نبوی سے احتجاج جائز نہیں سمجھتے۔ وہ اس کی دو دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ احادیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظوں کی روایت نہیں کی گئیں بلکہ ان کی روایت بالمعنیٰ کی گئی ہے۔

۲۔ بصرہ و کوفہ کے متقدمین علمائے نحو احادیث سے احتجاج نہیں کرتے۔

پہلی دلیل کا جواب کا یہ ہے کہ روایت بالمعنیٰ اس وقت کی جاتی تھی جب کتب حدیث کی تدوین نہیں ہوئی اور عربی زبان بگاڑ اور فساد سے محفوظ تھی۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا لفظ رکھ دیا جائے۔ لہذا اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اور احتجاج درست ہے۔ مزید برآں لغوی استشہاد کے لیے یقین شرط نہیں

بلکہ ظنی علم کافی ہے۔

دوسری دلیل کو یوں رد کیا گیا ہے کہ کوفہ و بصرہ کے علمائے نحو کے استدلال نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حدیث نبوی کے ساتھ احتجاج درست ہی نہیں۔

اس ضمن میں صحیح مسلک یہ ہے کہ حدیث نبوی کے ساتھ احتجاج درست ہے جیسا کہ شارح رضی نے کہا ہے کہ اقوال صحابہ و اہل بیت کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے گا۔"

(خزانۃ الادب ج ا ص ۵)

آگے چل کر خزانۃ الادب کا مصنف "الدمامینی" سے اس مسلک کی تردید نقل کرتا ہے کہ حدیث سے احتجاج درست نہیں۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہے۔

"البدر الدمامینی نے شرح التسہیل میں حدیث نبوی سے لغت میں احتجاج نہ کرنے کی بہت عمدہ تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تسہیل کے مصنف ابن مالک نے احادیث سے بکثرت احتجاج کیا ہے۔ ابوحیان ابن مالک کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حدیث سے استدلال درست نہیں۔ کیونکہ اس میں روایت بالمعنیٰ کا احتمال ہے، اس لیے پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آنحضورؐ ہی کے الفاظ ہیں۔ تاکہ ان کے ساتھ احتجاج کیا جا سکے۔ الدمامینی کہتے ہیں کہ جب میں نے ابوحیان کا یہ قول اپنے استاد کو سنایا تو انہوں نے ابن مالک کی رائے کو درست ٹھہرایا۔ اس لیے کہ یہاں یقین مطلوب نہیں بلکہ ظن غالب کافی ہے۔ جس پر شرعی احکام کی اساس رکھی گئی ہے مفردات الفاظ اور قوانین اعراب کے سلسلہ میں بھی ظن غالب کو کافی تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے ان تمام مواقع پر ظن پر اکتفا کرنا چاہیے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حدیث نبوی کے جن الفاظ کے ساتھ استشہاد کیا جا رہا ہے ظن غالب کی حد تک وہ نبی کریمؐ سے منقول ہیں اور دوسرے الفاظ میں تبدیل نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ اصل ان کا تبدیل نہ ہونا ہے۔ خصوصاً جب کہ حدیث نبوی کے رُواۃ

وناقلین اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ حتی الامکان آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کو تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔ اور جو شخص روایت بالمعنیٰ کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عقل انسانی اس کے جواز کے حق میں ہے۔ ضروری نہیں کہ روایت ہمیشہ دوسرے الفاظ ہی میں کی جائے جو اصلی نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ روایت بالمعنیٰ کو جائز قرار دینے کے باوجود محدثین آنحضورؐ کے اصلی الفاظ روایت کرنے پر زور دیتے رہے ہیں۔ بنابریں ظنِ غالب یہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلی الفاظ تبدیل نہیں ہوئے اس لیے تبدیلِ الفاظ کا احتمال نہایت کمزور ہوگا۔ اور اس کو معتبر نہیں سمجھا جائے گا۔ لہذا وہ صحتِ استدلال میں خلل انداز نہ ہوگا۔

پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ روایت بالمعنیٰ کے سلسلہ میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ان احادیث کے بارے میں ہے جو کتبِ حدیث میں مدوّن نہ ہوئی ہوں جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جو کتبِ حدیث میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ ان کے الفاظ کو ہرگز تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس میں کوئی اختلاف ونزاع نہیں پایا جاتا۔

محدث ابن الصلاح روایت بالمعنیٰ کا اختلاف ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"ہمارے علم کی حد تک جو احادیث کتب حدیث میں یکجا ہیں، ان کے بارے میں یہ اختلاف باقی نہیں رہا۔ اب کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی تالیف شدہ کتاب کے الفاظ کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے الفاظ ثبت کر دے"۔ (مقدمہ ابن الصلاح)

اس میں شک نہیں کہ احادیث و اخبار کی جمع و تدوین صدرِ اول میں عربی زبان میں فساد پیدا ہو جانے سے قبل عمل میں آگئی تھی۔ جب کہ ان کے ساتھ احتجاج جائز اور درست تھا۔ روایت بالمعنیٰ کی صورت میں جو تبدیلی ہوتی وہ اسی نوع کی تھی کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا گیا۔ لہذا جب پہلے لفظ کے ساتھ احتجاج درست تھا تو جو لفظ اس کی جگہ رکھی گیا۔ اس کے ساتھ بھی جائز ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ

صحتِ استدلال کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ (صاحب خزانتہ الادب کی تحریر ختم ہوئی)۔

سیّد رشید رضا کا موقف:

شیخ محمد رشید رضا صاحب مجلّہ المنار نے رسالہ مذکور کی مجلد دہم کی دسویں جزء میں "تدوین حدیث" سے متعلق ایک مقالہ تحریر کیا ہے جس میں علماء کے عام طریق سے ہٹ کر بحث کی ہے۔ ہم ان کی تحریر کا خلاصہ ذکر کر کے اس کی تردید کرتے ہیں۔

اول:- سیّد رشید رضا رسالہ مذکور کے صفحہ ۷۵۴ پر لکھتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں تابعین میں سے جس شخص نے احادیث نبویہ کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا وہ خالد بن معدان حمصی تھے۔ منقول ہے کہ وہ ستر صحابہ سے مل چکے تھے۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بحیر کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے خالد سے بڑھ کر علم کا شائق نہیں دیکھا اس نے اپنے علم کو ایک رسالہ میں جمع کر کے اس کو مقفّل کر رکھا تھا۔"

شیخ موصوف مزید لکھتے ہیں۔

"خالد نے اپنی معلومات کو ایک تصنیف میں جمع کر کے اس کو ہر طرح محفوظ کر رکھا تھا۔ تاکہ ضائع نہ ہو جائے۔ یہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ اس لیے کہ خالد کی وفات ۱۰۳ھ یا ۱۰۴ھ میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔ بخلاف ازیں مشہور یہ ہے کہ سب سے پہلے حدیثیں ابن شہاب زہری نے جمع کیں۔ مگر شیخ رشید نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس کے اثبات میں وہ صرف بحیر کا قول خالد بن معدان کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔ اور کوئی دلیل مذکور نہیں۔ حالانکہ بحیر کے قول سے یہ بالکل ثابت نہیں ہوتا کہ اس ضمن میں خالد کو اولیت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ خالد نے جو کتاب مرتب کی تھی، وہ ان کی ذاتی کاوش تھی۔ جو انہوں نے اپنے لیے انجام دی تھی۔ خالد سے پہلے یہی کام حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کر چکے تھے۔ بحیر نے خالد کے بارے میں جو شہادت دی ہے وہ صرف اس حد تک ہے کہ خالد

کثیر العلم تھے۔ اور اپنی معلومات کے کھو جانے کے ڈر سے ایک کتاب میں مرتب کرتے جاتے تھے۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ ابن شہاب خالد بن معدان سے بڑھ کر علم کے شیفتہ و فریفتہ اور تدوین حدیث کے اس سے بڑھ کر شائق تھے۔ ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ تابعین میں سے سب سے پہلے تدوین حدیث کا بیڑا امام زہری نے اٹھایا۔ شیخ رشید نے بذات خود امام زہری کی مدح و ستائش سے متعلق علما کے جو اقوال نقل کیے ہیں، وہ خالد کے بارے میں بحیر کے قول سے زیادہ زوردار ہیں۔ پھر انہوں نے زہری کو حدیث نبوی کا اولین جامع و مدوّن کیوں قرار نہ دیا؟

شیخ رشید فرماتے ہیں۔ صفحہ ۷۶۵

دوم :- کتابت حدیث کے بارے میں جو احادیث صحیحہ وارد ہوئی۔ ان سے علی الاطلاق کتابت حدیث کی اجازت کا استفاد نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کا تعلق خاص مواقع و موضوعات کے ساتھ ہے۔ اور جن احادیث سے مطلقاً کتابت حدیث کی اجازت مفہوم ہوتی ہے وہ ضعیف اور ناقابل احتجاج ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل احادیث۔

۱۔ ابوہریرہؓ سے مروی یہ حدیث کہ "ابو شاہ کو لکھ دو"۔ اگرچہ بخاری و مسلم کی حدیث ہے۔ مگر خاص موقع پر وارد ہوئی ہے۔ ابوہریرہؓ سے امام بخاری نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا"۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جس کا حافظہ خراب تھا، اس بات کی اجازت دی کہ وہ لکھ لیا کرے۔

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کہ "لکھ کر علم کو محفوظ کر لیا کرو" ضعیف ہے

۳۔ حضرت ابوبکرؓ سے منقول حدیث کہ "جس شخص نے کوئی حدیث تحریر کی۔ جب تک وہ حدیث باقی رہے گی۔ اس کے لیے اجر و ثواب لکھا جاتا رہے گا"۔ ابن عساکر نے اس کو اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے۔ یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔

۴۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ہم آپ سے جو باتیں سنتے ہیں، کیا ان کو لکھ لیا کریں؟ فرمایا لکھ لیا کرو۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اس حدیث کو حکیم ترمذی، طبرانی اور خطیب نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔

۵۔ حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ "علما کے رخصت ہو جانے سے پہلے علم کو قلمبند کر لو" ابن النجار نے اس کو اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے۔ یہ ضعیف بلکہ موضوع ہے۔

۶۔ ابو جُحیفہ کہتے ہیں، میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرض کی۔ کیا آپ کے پاس قرآن کے سوا کوئی اور چیز بھی موجود ہے جو آپ نے رسول کریمؐ سے حاصل کی ہو؟ فرمایا اس ذات کی قسم جس نے دانے کو اُگایا اور رُوحوں کو پیدا کیا، ہمارے پاس کوئی چیز ایسی نہیں، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو فہم قرآن عطا کر دے۔ البتہ میرے پاس ایک رسالہ محفوظ ہے۔ میں نے کہا اس رسالے میں کیا لکھا ہے؟ فرمایا قیدیوں کو آزاد کرنے کے احکام اور یہ کہ کسی مسلم کو کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔

اس حدیث کو امام احمد، بخاری، ترمذی، نسائی و ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس کا موضوع خاص ہے اور وحی کی جانب منسوب ہے۔

۷۔ عمرو بن حزم راوی کے پاس جو کتاب الصدقات والدیات والفرائض" تھی، وہ بھی اس کی ایک مثال ہے۔ اس کو ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ اس کے عنوانات بھی مخصوص ہیں۔ یہ احکام عمرو بن حزم کو اس وقت تحریر کر کے دیئے گئے تھے، جب ان کو نجران کا عامل مقرر کیا گیا تھا۔ حدیث مذکور کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو صدقہ، دیت اور فرائض سے متعلق احکام لکھوا دیئے تھے۔

۸۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ

میں جو کچھ آپ سے سنوں، اسے لکھ لیا کروں ؟ فرمایا ہاں! میں نے عرض کی "خواہ آپ رضا کی حالت میں ہوں یا غصہ میں ؟" فرمایا ہاں! میں سب حالات میں حق ہی کہتا ہوں"۔

شیخ رشید کہتے ہیں کہ یہ حدیث میرے علم کی حد تک امام احمد و ابوداؤد و حاکم نے بالفاظ مختلف دو سندوں کے ساتھ روایت کی ہے۔ ایک سند تو یہ ہے کہ عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کرتے ہیں۔ اس سند پر محدثین کی نقد و جرح مشہور ہے۔ اگرچہ بعض متاخرین نے اس سے احتجاج کیا ہے مگر وہ سہل انگاری پر مبنی ہے۔

دوسری سند از عبداللہ بن مؤمل از ابن جریج از عطا ہے۔ اس حدیث میں "قیدوا العلم" (علم کو پابند کرو) کے الفاظ ہیں۔ عبداللہ بن المؤمل کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ منکر حدیثیں روایت کرتا ہے۔ نسائی و دارقطنی نے اس کی تضعیف کی ہے۔

امام ابن عبدالبر نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے نقل کیا ہے کہ دو چیزوں کی وجہ سے مجھے زندگی عزیز ہے۔ ان میں سے ایک تو "صادقہ" ہے اور دوسری "الوھط"۔ "صادقہ" تو ایک رسالہ ہے جو میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا تھا۔ اور "الوھط" زمین کا ایک قطعہ تھا۔ جس پر میں گذر بسر کرتا تھا۔ وہ میرے والد حضرت عمرو بن العاصؓ نے صدقہ کر دی۔

مندرجہ صدر حدیث کی سند میں لیث مجاہد سے روایت کرتے ہیں۔ لیث سے مراد لیث بن سلیم ہے۔ جس کو یحییٰ بن معین اور نسائی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام احمد بن حنبل کے بیٹے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے کہا کہ یحییٰ بن سعید کسی شخص کے بارے میں اتنی بری رائے نہیں رکھتے جتنی بری رائے ان کی لیث و محمد بن اسحاق اور ہمام کے بارے میں تھی۔ اس ضمن میں کوئی شخص ان سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میزان الاعتدال میں لیث بن سلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عمر کے آخری حصہ میں اس کا حافظہ خراب ہو گیا تھا۔

اب ہم شیخ رشید رضا کے مندرجہ صدر بیان پر تنقید کرتے ہیں۔

ابو ہریرہؓ کی روایات ثلاثہ پر اعتراض: شیخ موصوف نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث جو بخاری و مسلم نے روایت کی ہے کہ "اکتبوا لابی شاہ" وہ ابو شاہ یمنی کے ساتھ مختص ہے۔ مگر شیخ نے اس خصوصیت کی وجہ نہیں بتائی۔ علماء کے نزدیک یہ طے شدہ بات ہے کہ اختصاص کا دعویٰ بلا دلیل قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شیخ کا مقصد یہ ہے کہ حضور کا یہ ارشاد صرف فتح مکّہ کے ساتھ مختص ہے تو حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ مگر اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس خطبہ کے سوا اور کچھ نہ لکھا جائے۔ یا ابو شاہ کے سوا کسی اور کو کچھ لکھ کر نہ دیا جائے۔ اس لیے کہ جہاں تک احادیث کی حفاظت و صیانت کا تعلق ہے اس میں فتح مکّہ کا خطبہ اور دیگر احادیث مساوی ہیں۔ دونوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح ابو شاہ کی تخصیص بھی بے معنی ہے۔ آخر ابو شاہ اور دیگر صحابہ بلکہ جملہ اہل ایمان میں کیا فرق ہے؟ اگر کہا جائے کہ ابو شاہ کا حافظہ خراب تھا۔ اس لیے آپ نے اس کو لکھ کر دینے کا حکم دیا۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس نے کتابت کی خواہش کا اظہار اس لیے کیا ہوگا کہ خطبہ کو یاد رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کو لکھوا کر محفوظ رکھنے سے اس کی حفاظت کا اور زیادہ اہتمام ہو جائے۔ احتمالات کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کی کوئی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ پس یہ کہنا کہ فلاں احتمال درست اور باقی سب باطل ہیں، سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول دوسری حدیث کا شیخ رشید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ حدیث یوں ہے، ہمّام بن مُنَبِّہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو ہریرہ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ اصحاب رسولؐ میں مجھ سے بڑھ کر حدیثیں اور کوئی نہیں جانتا۔ ماسوا عبداللہ بن عمرو بن العاص کے۔ اس لیے کہ عبداللہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ (صحیح بخاری)

جب امام بخاری نے اس حدیث کو روایت کیا ہے تو اب ہمّام بن منبّہ پر نقد و جرح کسی

طرح مقبول نہیں۔ ہم اس حدیث کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ کتابتِ حدیث نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے۔ اس لیے کہ حضرت عبداللہ حدیثیں لکھا کرتے تھے اور ابوہریرہ نے اسے ناپسند کیا۔ بلکہ اس کو محاسن میں شمار کیا۔ اور اسی بنا پر وہ کثیر الحدیث تھے۔

مجاہد و مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہ کہتے سُنا کہ اصحابِ رسولؐ میں عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے سوا مجھ سے زیادہ کوئی شخص حدیثیں نہیں جانتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ اپنے ہاتھ سے لکھتے اور دل کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ اور میں لکھتا نہ تھا۔ عبداللہؓ نے نبی کریمؐ سے کتابتِ حدیث کی اجازت طلب کی تھی۔ جو آپ نے مرحمت فرما دی۔ اس حدیث کی اسناد حسن ہے۔ (فتح الباری ج ا ص ۱۸۴ نیز مسند احمد و بیہقی فی المدخل)

اس حدیث سے مستفاد ہُوا کہ حضرت عبداللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتابتِ حدیث کی اجازت طلب کی تھی اور آپ نے عنایت فرما دی۔ حالانکہ حضرت عبداللہ کسی وجہ سے کتابت کے لیے مجبور نہ تھے۔ اس لیے کہ ابوہریرہؓ خود کہتے ہیں کہ "عبداللہ اپنے ہاتھ کے ساتھ لکھتے اور دل کے ساتھ یاد رکھتے تھے"۔ مزید برآں عبداللہؓ جو احادیث لکھا کرتے تھے۔ وہ کسی ایک موضوع کے ساتھ متعلق نہیں ہُوا کرتی تھیں۔ بلکہ عام ہُوا کرتی تھیں۔

باقی رہی حضرت ابوہریرہؓ سے منقول تیسری حدیث کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو جس کا حافظہ خراب تھا۔ حدیثیں لکھنے کی اجازت فرما دی تھی۔ اس حدیث سے صراحۃً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسے معذور شخص کے لیے لکھنے کی اجازت ہے۔ مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قوی الحفظ کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بلکہ اس سے تو اس کے حافظہ کو مزید تقویت ملے گی۔ غالباً شیخ رشید نے ترمذی کی یہ حدیث لاکر اس جانب اشارہ کیا ہے کہ سابق الذکر بخاری کی حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی کتابتِ حدیث کا جو ذکر کیا گیا وہ اسی بنا پر تھا کہ عبداللہؓ کا حافظہ خراب تھا۔ حالانکہ یہ غلط ہے اور ہم اس کی تردید کر چکے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ کے تعارف کے سلسلہ میں ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ ایک

ہمارے پاس عبداللہ کی جو احادیث نقل ہو کر پہنچی ہیں۔ وہ حضرت ابو ہریرہ کی مرویات کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، حالانکہ وہ حدیثیں یاد رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کو لکھ بھی لیا کرتے تھے۔

صحیفۂ علی و کتاب عمرو بن حزم:

شیخ رشید نے ان دونوں حدیثوں کی صحت کو تسلیم کیا، مگر یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ خاص موضوع سے متعلق ہیں۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ مکتوب یا کاتب کے خاص ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ان دونوں کے تبدیل ہو جانے کی صورت میں کتابت حدیث کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ حدیث وحیِ الٰہی ہے۔ جس کی تبلیغ لوگوں پر واجب ہے اور کتابت بھی تبلیغ کے ذرائع میں سے ایک ہے۔

عمرو بن حزم کی حدیث کے بارے میں شیخ رشید کا یہ قول بڑا عجیب دکھائی دیتا ہے کہ "اس کا موضوع خاص ہے اور آپ نے یہ احکام ان کو اس لیے لکھوا کر دیئے تھے کہ ان کو نجران کا عامل مقرر کیا گیا تھا۔ اور یہ احکام تحریر کر دیئے کہ وہ ان کے مطابق لوگوں کے تنازعات فیصل کر دیا کریں۔"

بخلاف ازیں حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم کو ایک تحریر لکھ دی تھی، جو صدقات و دیات اور فرائض و سنن پر مشتمل تھی"۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریر صرف عمرو بن حزم کے لیے نہیں بلکہ سب لوگوں کے لیے تھی اور اس کا موضوع بھی خاص نہ تھا۔ شیخ رشید نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ یہ تحریر مقدمات فیصل کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس سے لازم آتا ہے کہ حفظ کرنے کے لیے کسی چیز کو لکھ لینا درست نہیں۔ حالانکہ شرعی مسائل کو زبانی یاد کر لینے سے بھی مقدمات فیصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

امام ابن قیمؒ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جو آپ نے مسلمانوں کے نام تحریر فرمائے تھے۔ "سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطوط مسلمانوں کے نام تحریر کیے تھے۔ ان میں سے ایک خط وہ ہے جو حضورؐ نے اہل یمن کے نام

لکھا۔ اس مکتوب گرامی کو ابوبکر بن عمرو بن حزم نے روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں حاکم و نسائی اور دیگر محدثین نے اس کو بسند متصل روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد نے مرسلاً۔ حضور کا یہ مکتوب گرامی کثیر مسائل پر مشتمل ہے۔ مثلاً زکوٰۃ و دیات کے احکام کبائر طلاق و عتاق کا ذکر ایک کپڑے میں نماز پڑھنے اور اس کو ایک خاص طریقہ سے اوڑھنے کا مسئلہ۔ نیز قرآن کریم کو چھونے کا بیان وغیرہ۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "اس میں شبہ نہیں کہ حضورؐ نے یہ خط تحریر کروایا تھا اور فقہا نے اس میں مندرج تمام احکام و مسائل کے ساتھ احتجاج کیا ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس خط کا موضوع خاص نہ تھا۔ اور اس کے مخاطب بھی عوام الناس تھے۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت پر اعتراض:

اس حدیث کو محدثین نے صحیح قرار دیا ہے یہ اس امر کی نہایت قوی اور صریح ترین دلیل ہے کہ کتابت حدیث نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے۔ یہ متعدد طرق و اسانید سے مروی ہے۔ اور ایک طریق دوسرے کا مؤید ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"یہ حدیث احمد و ابوداؤد کے نزدیک از طریق یوسف بن ماہک از عبداللہؓ بن عمرو بن العاص منقول ہے۔ حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ میں جو بات نبی کریمؐ سے سنتا، اس کو لکھ لیا کرتا تھا۔ میرا ارادہ اس کو حفظ کرنے کا ہوتا تھا۔ قریش نے مجھے منع کیا۔ وہ کہنے لگے تم جو بات بھی حضورؐ سے سنتے ہو، اس کو قلم بند کر لیتے ہو۔ حالانکہ آپ کبھی راضی ہوتے ہیں کبھی ناراض۔ یہ سن کر میں نے لکھنا بند کر دیا۔ اور آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی۔ حضورؐ نے اپنی انگشت مبارک کے ساتھ اپنے منہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "لکھتے رہو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس منہ سے حق بات ہی نکلتی ہے" یہ حدیث متعدد طرق کے ساتھ حضرت عبداللہ سے منقول ہے۔ یہ اسانید و طرق ایک دوسرے کی تقویت کا باعث

ہیں۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۱۴۹)۔

شیخ رشید نے جب دیکھا کہ یہ حدیث اس مقصد کے خلاف ہے، جس کو وہ ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ تو کبھی اس کی سند پر معترض ہوتے ہیں اور گاہے متن پر نقد و جرح کرتے ہیں۔ چنانچہ حدیث کے متن پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ دو سندوں سے مروی ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ کا مختلف ہونا اس میں قدح کا موجب نہیں ہے۔ جب کہ وہ الفاظ متعارض و متصادم نہ ہوں حدیث زیر قلم کی یہی حالت ہے۔ اس کے الفاظ اگرچہ بلحاظ طوالت و اختصار مختلف ہیں، مگر ان میں منافات نہیں پائی جاتی۔ اس لیے اس پر جرح و قدح کا کوئی جواز نہیں۔

حدیث زیر تبصرہ کی سند پر شیخ رشید نے بایں الفاظ جرح کی ہے کہ یہ دو سندوں سے مروی ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ پہلی سند از "عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ" ہے۔ محققین اور جمہور متقدمین و متاخرین اس سے احتجاج کرتے ہیں۔ محدث ابن الصلاح اپنے مقدمہ کی پینتالیسویں نوع پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ یعنی شعیب اپنے دادا سے ایک بڑا صحیفہ روایت کرتے ہیں جس میں فقہ کے بڑے عمدہ مسائل مذکور ہیں"

اس سند میں جس شعیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص مراد ہیں۔ اکثر محدثین نے شعیب کی مرویات سے احتجاج کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ جدّ (دادا) سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص صحابی مراد لیتے ہیں۔ نہ کہ حضرت عبداللہ کے بیٹے محمد جو شعیب کے والد ہیں۔" (مقدمہ ابن الصلاح)

امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں۔

"امام بخاری فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل، علی بن مدینی، اسحٰق بن راہویہ، ابو عبیدہ اور ہمارے عام اصحاب اس سند سے احتجاج کرتے ہیں۔ کسی نے بھی اس کو ترک نہیں

کیا۔ایک مرتبہ علی بن مدینی یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، ابو خیثمہ اور چند شیوخ حدیث جمع ہوئے اور عمرو بن شعیب کی سند کا ذکر چل نکلا تو انہوں نے اس کو قابل احتجاج اور صحیح قرار دیا۔

(تدریب الراوی)

احمد بن سعید دارمی کہتے ہیں کہ ہمارے اصحاب عمرو بن شعیب کی مرویات سے احتجاج کرتے ہیں۔امام نوویؒ نے شرح المہذب میں لکھا ہے کہ محققین اہل الحدیث کے نزدیک صحیح اور مختار مذہب یہی ہے۔وہی اس فن کے اہل ہیں اور انہی کے قول پر عمل کیا جاتا ہے۔اس سند میں جد (دادا) سے حضرت عبداللہؓ صحابی مراد ہیں نہ کہ ان کے بیٹے محمد جو کہ تابعی ہیں۔شعیب کا سماع اپنے دادا حضرت عبداللہؓ صحابی سے ثابت ہے۔

مشہور محدث اسحٰق بن راہویہ فرماتے ہیں۔

"عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ" کی سند اسی طرح ہے جیسے ایوب از نافع از ابن عمرؓ"

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ کی مذکورہ صدر تشبیہ ان کی عظمت و جلالت کی دلیل ہے۔

محدث علائی نے اس سند سے احتجاج کے جواز اور اس پر وارد شدہ اعتراضات کے جواب میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔وہ کہتے ہیں، اس سند کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ امام مالک نے موطا میں روایت کی ہے۔کہ ایک" سوار شیطان ہوتا ہے۔دو سوار بھی شیطان ہیں۔اور تین سوار ایک قافلہ ہوتا ہے۔ (موطا امام مالک)

امام مالک فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اس سند سے احتجاج نہیں کرتے۔اس لیے کہ عمرو بن شعیب کی روایت اپنے باپ سے اور شعیب کی روایت اپنے دادا سے کتاب اور وجادہ کی بنا پر ہے۔یعنی شعیب اپنے دادا حضرت عبداللہ کی کتاب سے دیکھ کر حدیثیں روایت کرتا ہے۔اس کے ضعیف ہونے کی یہی وجہ ہے۔بنا بریں اصحاب صحاح اس سے احتراز کرتے ہیں۔اس لیے کہ کتاب سے دیکھ کر روایت کرنے میں تصحیف کا احتمال ہوتا ہے۔

محدث ابن حبان فرماتے ہیں۔

" اگر جدّ (دادا) سے حضرت عبداللہ صحابی مراد ہیں تو اس میں شک نہیں کہ شعیب کی ملاقات ان سے نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ سند منقطع ہے۔ اور اگر اس سے محمد بن عبداللہ مراد ہے تو وہ صحابی نہیں بلکہ تابعی ہے۔ اس لیے یہ سند مرسل ہے۔"

امام ذہبی فرماتے ہیں۔

" محدث ابن حبان کی بات کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ شعیب کا سماع اپنے دادا حضرت عبداللہ سے ثابت ہے۔ جب شعیب کا والد محمد فوت ہو گیا تو ان کے دادا عبداللہ نے ان کی پرورش کا فریضہ ادا کیا۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی اولاد کی تحویل میں ایک کتاب تھی جو حضرت عبداللہ نے نبی اکرمؐ سے احادیث سن کر تحریر کی تھی۔ اسی لیے بعض لوگوں نے عمرو بن شعیب کی مرویات پر جرح وقدح کی ہے۔ شعیب سے اس سند میں شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص مراد ہے۔ محدثین کا کہنا ہے کہ "جدہ" سے عمرو کا دادا محمد مراد لیا جائے تو سند مرسل ہوگی۔ کیونکہ محمد نے نبی اکرمؐ کا زمانہ نہیں پایا۔ اور اگر اس سے عمرو کا جد اعلیٰ (پردادا) یعنی حضرت عبداللہ صحابی مقصود ہو تو سند منقطع ہوگی۔ کیونکہ شعیب کی ملاقات حضرت عبداللہ سے نہیں ہوئی۔

مگر جمہور علماء، اور محدثین عمرو بن شعیب کی مرویات سے احتجاج کرتے ہیں۔ مثلاً امام مالک بن انس وسفیان بن عُیَینہ، شافعی، احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ و دیگر محدثین۔ وہ کہتے ہیں کہ جد سے دادا یعنی حضرت عبداللہ مراد ہیں۔ چنانچہ بعض سندوں میں ان کا نام بھی مذکور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شعیب کی ملاقات حضرت عبداللہ سے ثابت ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کتاب سے روایت کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ بلکہ اس سے تو اس کو مزید تقویت حاصل

ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمرو بن شعیب کی کتاب میں فقہی مسائل پر مشتمل احادیث مذکور ہیں۔ جن سے عام علماء مستفید ہو سکتے ہیں"۔ (قواعد التحدیث ص ۳۶)

دوسری سند جس کو ائمہ حدیث نے بقول شیخ رضا ضعیف قرار دیا ہے۔ اگرچہ احتجاج کے قابل نہیں۔ البتہ تائید و تقویت کے لیے بطور شاہد کے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور جب دیگر احادیث صحیحہ کے ساتھ حجت قائم ہو چکی ہے تو اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

احادیث ضعیفہ سے استدلال: شیخ رشید رضا نے حضرت انس، ابو بکر و رافع بن خدیج و حذیفہ رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث کو ضعیف قرار دیا۔ اور علماء کے اس مسلمہ قاعدہ کو بھول گئے کہ احادیث ضعیفہ جب متعدد طرق سے مروی ہوں تو انہیں تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ احتجاج کے قابل ہو جاتی ہیں۔ مزید برآں کتابتِ حدیث کی اجازت کے بارے میں احادیث صحیحہ وارد ہوئی ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہم یوں بھی احادیث ضعیفہ سے بے نیاز ہیں۔

سوم:۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں، شیخ رشید رضا کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ جن احادیث کو کتابتِ احادیث کی اجازت کے بارے میں پیش کیا جاتا ہے، ان سے کتابت کی اجازت ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو احادیث کتابتِ حدیث سے ممانعت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ وہ اِذنِ کتابت کی احادیث کے مقابلہ میں ارجح ہیں۔ مزید برآں ممانعت میں وارد شدہ احادیث میں قوی ترین روایت حضرت ابو سعید کی ہے۔ جو صحیح مسلم اور مسند احمد بن حنبل میں منقول ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ "قرآن کے سوا مجھ سے سُن کر کوئی چیز نہ لکھا کرو۔ جس نے کوئی ایسی چیز تحریر کی ہو، وہ اسے مٹا دے"۔ یہ اس ضمن میں مروی احادیث میں سے صحیح ترین حدیث ہے۔

ہم اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ جن احادیث میں کتابتِ حدیث کی اجازت دی گئی ہے وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک قسم کی احادیث تو وہ ہیں، جو صحیح ہیں۔ اور صراحۃً یا دلالۃً اجازت پر دلالت

ذاتی ہیں۔ دوسری قسم کی احادیث اگرچہ ضعیف ہیں۔ مگر کثرتِ طرق کی بنا پر ان سے احتجاج کیا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اذنِ کتابت اور ممانعت پر مشتمل حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت کے مابین جمع وتطبیق کی کیا صورت ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کتابت حدیث سے اس وقت منع کیا گیا جب قرآن نازل ہو رہا تھا۔ مبادا قرآن وحدیث دونوں باہم خلط ملط ہو جائیں جب یہ خطرہ ٹل گیا تو اس کی اجازت دے دی گئی یا ممانعت کا مطلب یہ تھا کہ قرآن وحدیث دونوں کو یک جا نہ لکھا جائے۔ الگ الگ تحریر کرنے کی اجازت تھی۔ یا کتابتِ حدیث سے اس شخص کو منع کیا گیا تھا جس کے بارے میں یہ خدشہ دامن گیر تھا کہ وہ کتابت پر بھروسہ کرکے حافظہ سے کام لینا چھوڑ دے گا۔ اور جس کے بارے میں یہ خدشہ نہ ہو اس کو حدیثیں لکھنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

چہارم:۔ شیخ رشید رضا نے منع کتابت و اذنِ کتابت کی احادیث کے مابین جمع و تطبیق کی جو صورتیں پیش کی ہیں وہ کسی طرح بھی درست نہیں۔ شیخ موصوف فرماتے ہیں، کہ جمع و تطبیق کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

۱۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوشاہ کو خطبہ لکھ کر دینے کا جو حکم دیا تھا، ممکن ہے، وہ خصوصی طور پر صرف اسی کے لئے ہو۔

۲۔ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ ابوشاہ کا حافظہ خراب ہو اور جب اس نے خطبہ لکھوانے کی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے اس کی تکمیل فرمادی۔

۳۔ کتابت سے اس صورت میں منع کیا گیا تھا جب اس تحریر کو محفوظ رکھا جائے۔ جو شخص لکھ کر اس کو مٹادے، اس کو لکھنے کی اجازت ہے۔ اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو ابن عبدالبر نے زید بن ثابت، ابن مسعود اور علی رضی اللہ عنہم سے تحریر کو مٹانے کے سلسلہ میں نقل کی ہے۔ اس ضمن میں امام مالک کا قول بھی نقل کیا ہے۔ اس زمانہ میں لوگ

کوئی چیز اس لیے لکھتے تھے کہ اس کو حفظ کر لیا جائے۔ جب یاد کر لیتے تو پھر اسے مٹا دیتے تھے۔
ممکن ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو اسی لیے کتابتِ حدیث کی اجازت دی گئی ہو جیساکہ عبداللہ خود فرماتے ہیں کہ میں جو بات نبی کریم سے سنتا، اس کو حفظ کرنے کے ارادہ سے لکھ لیا کرتا تھا۔ انہوں نے خود ہی تصریح فرما دی کہ وہ یاد کرنے کے لئے لکھا کرتے تھے۔ عمرو بن شعیب کی روایت کے بارے میں آپ علماء کے خیالات معلوم کر ہی چکے ہیں۔ حضرت علی کے صحیفہ اور کتاب عمرو بن حزم کا بھی یہی جواب ہے۔"

ہم شیخ رشید کے مذکورہ صدر بیانات کے جواب میں کہتے ہیں کہ خصوصیت صرف احتمال سے ثابت نہیں ہوتی۔ باقی رہی یہ بات کہ ابوشاہ کا حافظہ خراب تھا تو یہ محتاجِ دلیل ہے۔ مگر اس ضمن میں کوئی دلیل موجود نہیں۔ اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا کہ ابوشاہ کا حافظہ خراب تھا، تو اذنِ کتابت کے بارے میں ہمارے پاس اور احادیث بھی موجود ہیں۔

جمع و تطبیق کی تیسری صورت بیان کرتے ہوئے شیخ موصوف نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اس لئے درست نہیں کہ حضرت عبداللہ اس لیے حدیثیں تحریر نہیں کیا کرتے تھے کہ ان کا حافظہ خراب تھا، بلکہ اس لئے کہ عندالضرورت اس کی جانب مراجعت فرمائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کتابتِ حدیث کی جو اجازت دی تھی۔ وہ بھی علی الاطلاق و بدوں قیود و شرط تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں سن کر اپنا صحیفہ "صادقہ" مرتب کیا۔ جو ان کے خاندان میں باقی رہا۔ حتیٰ کہ ان کے پرپوتے عمرو بن شعیب اس سے دیکھ کر حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ اور اکابر محدثین مثلاً امام بخاری، مالک، احمد بن حنبل۔ اسحٰق بن راہویہ وغیرہم ان کی مرویات پر اعتماد کرتے تھے۔

مزید براں یہ بات بھی اس کے خلاف ہے کہ شیعہ یہ خیال کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو وحیِ الٰہی کی بنا پر چند ایسی باتیں بتائیں، جن میں اور کسی کو شریک نہ فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابوجُحیفہ و قیس بن عبادہ اور اشتر نخعی نے حضرت علی سے یہ بات دریافت کی۔ تو آپ

نے فرمایا "ہمارے پاس کتاب الہٰی اور اس صحیفہ کے سوا اور کچھ موجود نہیں"۔ اس صحیفہ میں دیت کے احکام و اقسام بیان کیے گئے تھے۔ نیز قیدیوں کو دشمن سے چھڑانے کی ترغیب، زکوٰۃ کے مسائل اور یہ کہ مسلم کو کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے۔ یہ سب مسائل اس صحیفہ میں مرقوم تھے۔ اگر حدیث کی کتابت صرف زبانی یاد کرنے کے لیے عمل میں لائی جاتی ہے اور پھر اس کا مٹانا ضروری ہوتا ہے تو وہ صحیفہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانہ تک کیوں کر باقی رہتا۔

باقی رہی یہ بات کہ بعض صحابہ نے اپنی تحریروں کو مٹا دیا یا دوسروں کو مٹانے کا حکم دیا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ تحریر کو محفوظ رکھنا جائز نہیں بلکہ مٹانا ضروری ہے۔ اس کے وجوہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ صحابہ اس امر سے خائف تھے کہ لوگ ان تحریری مسودات میں مشغول ہو کر قرآن کو ترک نہ کر دیں۔ حالانکہ قرآن انہوں نے ابھی یاد بھی نہ کیا تھا۔

۲۔ ان کا خیال یہ تھا کہ لوگوں میں حافظہ پر اعتماد کرنے کے ملکہ کو ابھارا جائے تاکہ ان کی قوت حافظہ جو ضرب المثل کی حد تک مشہور تھی باقی رہے اور تحریر پر تکیہ کر کے ان کی ہمت پست نہ ہو جائے۔

۳۔ اکثر و بیشتر صحیفے اہل کتاب سے منقول ہوا کرتے تھے۔ اس لیے صحابہ نے خطرہ محسوس کیا کہ لوگ ان میں مشغول ہو کر کہیں اپنے دین کو نہ چھوڑ بیٹھیں۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابن عبدالبر نے نقل کی ہے کہ اسود اور علقمہ کو ایک صحیفہ ملا جسے وہ لے کر حضرت ابن مسعودؓ کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ ہمیں یہ صحیفہ ملا ہے۔ اس میں بڑی اچھی باتیں مرقوم ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس صحیفہ کو پانی سے دھو ڈالا اور یہ آیت تلاوت کی۔ "نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ"۔ وہ دونوں کہنے لگے "اس صحیفہ کو دیکھیے اس میں بڑی اچھی باتیں تحریر ہیں" حضرت ابن مسعودؓ اس صحیفہ کو مٹانے جا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ فرماتے جاتے تھے کہ "یہ قلوب برتن ہیں، ان کو قرآن کے ساتھ پُر کیجیے۔ اور کسی چیز کے ساتھ نہیں"۔ اس روایت

کے ایک راوی ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ چونکہ وہ صحیفہ اہل کتاب سے منقول تھا۔ اس لیے ابن مسعودؓ نے اس کے مطالعہ کو ناپسند فرمایا۔ لہذا جمع و تطبیق کا وہی طریق بہتر ہے جو ہم نے بیان کیا نہ کہ شیخ رشید کا بیان کردہ طریق تطبیق۔

پنجم: شیخ رشید رضا لکھتے ہیں۔

"اگر فرض کر لیا جائے کہ منع کتابت و اذنِ کتابت کے سلسلہ میں منقول احادیث کے درمیان تعارض پایا جاتا ہے۔ لہذا ان میں سے ایک قسم کی احادیث ناسخ اور دوسری قسم کی منسوخ ہوں گی۔ تو ہم کہیں گے کہ کتابتِ حدیث سے ممانعت کی احادیث متاخر ہونے کی وجہ سے ناسخ ہیں۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔

۱۔ جن صحابہ سے منع کتابت کی احادیث مروی ہیں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حدیثیں لکھنے سے منع کیا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہی از کتابت پر مشتمل احادیث ناسخ ہیں۔

۲۔ منع کتابت پر مشتمل احادیث کے ناسخ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام نے بذاتِ خود احادیث کی جمع و تالیف میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اور اگر وہ احادیث کو مدوّن کر دیتے تو ان کی جمع کردہ احادیث تواتر کے درجہ تک پہنچ جاتیں۔ اس کا جواب حسب ذیل ہے۔

ا۔ جن احادیث میں کتابت کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ محدثین کے نزدیک نہی پر مشتمل احادیث کے مقابلہ میں صحیح تر ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام بخاری اور دیگر محدثین نے ابو سعید خدریؓ سے منقول منعِ کتابت پر مشتمل حدیث کو معلول قرار دیا اور کہا ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں بلکہ ابو سعید خدریؓ کا قول ہے۔ حالانکہ شیخ رشید رضا اس حدیث کو منع کتابت پر مشتمل تمام احادیث میں سے اقویٰ قرار دیتے ہیں۔

ب۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ اذنِ کتابت و منع کتابت پر مشتمل احادیث میں تعارض پایا جاتا ہے تو ہم کہیں گے کہ ان دونوں میں سے متاخر اور ناسخ اذنِ کتابت پر مشتمل احادیث

ہیں۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ جب حضورؐ کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو فرمایا میرے پاس لکھنے کا سامان لاؤ تاکہ میں تمہیں ایسی چیز لکھ دوں، جس کی موجودگی میں تم گمراہ نہ ہو سکو۔ سعید بن جُبیر سے منقول ہے کہ یہ جمعرات کا واقعہ ہے۔ اس کے چار دن بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔

(صحیح البخاری ج ا ص ۱۴۶)

وجہ استدلال یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی وفات سے چند روز پہلے اپنی اُمت کے لیے یہ تحریر لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا تاکہ آپ کے بعد لوگ اختلاف میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ آپ اسی چیز کا ارادہ فرما سکتے تھے جو جائز اور درست ہو۔

ج۔ بعض صحابہ جو کتابتِ حدیث سے بذاتِ خود باز رہے اور لوگوں کو اس سے منع کرتے رہے اس کی وجہ نہیِ کتابت پر مشتمل احادیث نہ تھیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ منع کتابت کے بارے میں جو آثار وارد ہوئے ہیں۔ ان میں یہ علّت مذکور نہیں۔ بخلاف ازیں ان آثار و اقوال میں منعِ کتابت کی یہ علّت ذکر کی گئی ہے کہ لوگ احادیث میں منہمک ہو کر کتاب اللہ کو پسِ پشت نہ ڈال دیں۔ یا یہ کہ لوگ کتابت پر بھروسہ کر کے قوتِ حافظہ سے کام لینا ترک نہ کر دیں وغیرہ وجوہ واسباب۔

د۔ صحابہ نے حدیثِ نبوی کی جمع و تدوین اس لیے ترک نہیں کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے بلکہ اس خدشہ کے پیش نظر کہ احادیث پر مشتمل صحائف کہیں مصحفِ قرآنی کے ساتھ گڈمڈ نہ ہو جائیں۔ اور لوگ دونوں کے مابین فرق و امتیاز سے قاصر رہیں۔ اور وقت بھی ایسا تھا کہ ہنوز صرف چند صحابہ قرآن عزیز کو جمع کر پائے تھے۔

عُروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حدیثیں لکھنے کا ارادہ کیا اور اس ضمن میں اصحاب رسولؐ سے مشورہ طلب کیا۔ صحابہ نے حدیثیں لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ حضرت عمرؓ اس کے بعد ایک مہینہ تک استخارہ کرتے رہے۔ ایک دن

صبح کے وقت پختہ عزم کے ساتھ فرمایا کہ میں نے کتابتِ حدیث کا ارادہ کیا تھا۔ پھر مجھے ایک قوم یاد آگئی جو تم سے پہلے تھی۔ اس قوم نے خود ہی کچھ تحریریں مرتب کیں۔ پھر اپنے آپ کو ان کے لیے وقف کر دیا اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ کسی چیز کو مخلوط نہ ہونے دوں گا۔" (بیہقی فی المدخل)

اس روایت سے کتابت حدیث کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کو حدیثیں لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ البتہ حضرت عمرؓ نے قرآن کریم کی حفاظت وصیانت کے نقطۂ خیال سے بنا بر حزم و احتیاط کتابت کو صرف قرآن تک محدود رکھنا چاہا۔ احادیث کے بارے میں یہ فرمایا کہ ان کو یاد کیا جائے مگر لکھا نہ جائے۔ تاکہ دونوں مل جل نہ جائیں۔ اگر حضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں کتابتِ احادیث سے منع فرمایا ہوتا۔ تو صحابہ حضرت عمرؓ کو یہ مشورہ ہرگز نہیں دے سکتے تھے۔ مزید براں کتابتِ حدیث سے نہی کا حکم اگر باقی ہوتا تو صحابہ حضرت عمرؓ کے اس ارادہ پر خاموش تماشائی نہ بنے رہتے۔ کہ وہ حدیثیں تحریر کروائیں گے۔ اور حضرت عمرؓ کو کتابتِ حدیث کے مشورہ دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب ہم کتابتِ حدیث سے متعلق بعض علما کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

"کتابتِ علم کے بارے میں علمائے سلف کے یہاں اختلاف پایا جاتا تھا۔ آگے چل کر یہ اختلاف باقی نہ رہا اور جوازِ کتابت پر علما کا اجماع منعقد ہو گیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ کتابت کے استحباب پر علماء متفق الرائے ہو گئے۔ علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ جس شخص پر علم کو دوسروں تک پہنچانا واجب ہو۔ مگر اس کا حافظہ خراب ہو تو اس کے لیے علمی معلومات کا تحریر کر لینا ضروری ہے۔" (فتح الباری ج ۱ ص ۱۴۶)

امام ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں۔

"جو لوگ کتابتِ احادیث کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس کے دو وجوہ ہیں۔

۱۔ تاکہ قرآن کے ساتھ کوئی دوسری کتاب نہ ہو جو اس سے ملتی جلتی ہو۔

۲۔ تاکہ حافظ کتابت پر بھروسہ کرکے قوتِ حافظہ سے کام لینا چھوڑ نہ دے۔ اور اس طرح حافظہ کمزور پڑ جائے۔ مگر آج کوئی شخص کتابت کو ناپسند کرنے کے حق میں نہیں۔ اگر تحریر نہ ہوتی تو علم کا بڑا حصہ رائگاں چلا جاتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علمی باتوں کو لکھنے کی اجازت دی ہے۔ علما کی ایک جماعت بھی اس کی قائل ہے اور تحریر کو مدح و ستائش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ابراہیم نخعی نے جب لکھنا چھوڑ دیا تو ان کی قوت حافظہ بھی ٹھیک نہ رہی۔ منصور کا قول ہے کہ ابراہیم نخعی حدیث کا کچھ حصہ چھوڑ جاتے تھے۔ میں نے کہا کہ سالم بن جعد تو پوری حدیث بیان کرتے ہیں۔ نخعی کہنے لگے کہ سالم لکھ لیا کرتے تھے۔ اور میں لکھتا نہ تھا۔ امام ابن عبد البر کہتے ہیں کہ نخعی کتابتِ حدیث کو ناپسند کرنے کے باوجود اس کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہیں۔" (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۸)

محدث ابن الصلاح فرماتے ہیں۔

"عہد سلف میں کتابتِ علم کا مسئلہ متنازع فیہ تھا۔ بعض علماء کتابت کو ناپسند کرتے اور حفظ کا حکم دیتے تھے۔ بخلاف ازیں بعض علماء اس کی اجازت دیتے تھے۔ پھر یہ اختلاف باقی نہ رہا اور سب اہل اسلام اس کی اباحت پر متفق ہو گئے۔ اگر علم کو کتابوں میں مدون نہ کیا گیا ہوتا۔ تو پچھلے تاریخی ادوار میں اس کا نشان بھی باقی نہ رہتا۔" (مقدمہ ابن الصلاح ج ۱ ص ۶۸)

حیرت کی بات ہے کہ اگر حضورؐ کا آخری حکم منع کتابت پر مشتمل ہوتا تو مسلمان اس کی نقیض پر کیوں کر متفق ہو جاتے؟

ششم:۔ شیخ رشید رضا اس بحث سے یہ خلاصہ نکالتے ہیں کہ صحابہ نے احادیث کو اس لیے مدون نہیں کیا تھا۔ کہ وہ احادیث کو قرآن کی طرح دائمی دین کی حیثیت

نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ اس کی تائید حضرت عمرؓ کے اس رویہ سے کرتے ہیں۔ جو آپ نے بعض احادیث کے خلاف اختیار کیا۔ نیز یہ کہ اکابر علما مثلاً امام ابوحنیفہؒ نے صرف انہی احادیث پر اکتفا کیا جو ان کو آسانی سے میسّر آگئیں۔ اور ان کی جمع وتالیف کا اہتمام نہ کیا۔ مزید براں فقہا بکثرت احادیث صحیحہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ اب ہم شیخ کے اقتباسات نقل کر کے پھر اس کی تردید کرتے ہیں۔

شیخ رشید رضا رقمطراز ہیں:۔

۱۔ "جب ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ نہ صرف یہ کہ روایتِ حدیث میں دلچسپی نہیں لیتے تھے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر روایتِ حدیث سے اعراض کرتے ہیں اور دوسروں کو روایت کرنے سے روکتے تھے تو اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ احادیث کو قرآن کی طرح دائمی دین کا درجہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔"

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ شیخ نے چند بے بنیاد مقدمات ترتیب دے کر ان سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ باطل اور بے معنی ہے۔ صحابہ نے قلّتِ روایت کا حکم صرف اس لیے دیا تھا۔ تاکہ احادیث میں خطاء وسہو کی بھرمار نہ ہو۔ اور ان میں وہ باتیں شامل نہ ہو جائیں، جو در اصل حدیث نہیں ہیں۔ نیز اس لیے کہ منافقین احادیث نبویہ کو رسول کریم پر جھوٹ باندھنے کا ذریعہ نہ بنالیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ احادیث میں منہمک ہو کر لوگ قرآن سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ خصوصاً جب کہ ہنوز قرآن ان کے ذہنوں میں راسخ بھی نہیں ہوا تھا۔ علاوہ ازیں احادیث کے لکھنے سے یہ خطرہ بھی دامن گیر تھا کہ قرآن وحدیث پر مشتمل صحیفے باہم مخلوط ہو جائیں۔ اور لوگ ان میں امتیاز نہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خطرہ بھی پیش نظر تھا کہ قوت حافظہ سے کام نہ لینے سے حفظ کا ملکہ کمزور نہ پڑ جائے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ صحابہ کی عدم تدوین اور قلّتِ تحدیث کا مقصد وہ نہیں تھا جو شیخ رشید رضا نے بیان کیا کہ صحابہ حدیث کو ایک عام اور دائمی دین کا درجہ نہیں

دینا چاہتے تھے۔ اس نتیجہ کے لیے سرے سے کوئی اصل و اساس موجود ہی نہیں بلکہ خود قرآن عظیم سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں دین اسلام میں حدیث کا مقام بیان کرتے ہوئے تفصیلاً بتایا ہے۔

ب۔ شیخ رشید رضا لکھتے ہیں۔

"اگر صحابہ کو معلوم ہوتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کتابتِ حدیث کو پسند کرتے ہیں تو وہ خود بھی حدیثیں لکھتے اور دوسروں کو بھی لکھنے کا حکم دیتے۔ پھر خلفائے راشدین صحابہ کی تحریر کردہ احادیث کو جمع کرتے اور حفظ و ضبط کے بعد ان کو اطرافِ ملک میں اپنے عمّال کی جانب بھیجتے، تاکہ وہ آگے پہنچائیں۔ اور ان پر عمل کریں۔ اندریں صورت خلفائے راشدین صرف قرآن کریم اور ان مشہور احادیث ہی پر عمل پیرا نہ ہوتے جو لوگوں میں عام طور پر معروف تھیں، بلکہ تمام احادیث نبویہ کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ صحابہ احادیث کی نشر و اشاعت میں صرف روایت پر اکتفا کرتے تھے۔ اس کا قول درست نہیں۔

ہم شیخ موصوف کے جواب میں کہتے ہیں کہ صحابہ اس بات سے بخوبی آشنا تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سنت کو دائمی دین کی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ حضورؐ نے حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے ہوئے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ قبل فرمایا تھا "وہ شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ سرزمین عرب میں اس کی عبادت کی جائے۔ اب وہ صرف اسی بات پر قانع ہے کہ تم چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی اطاعت کرنے لگو گے نہ اسے ڈرتے رہو، میں تمہارے اندر وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم اسے تھامے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز کتاب الٰہی اور سنت رسولؐ ہے۔" امام حاکم نے روایت کر کے اس کو صحیح قرار دیا۔ اس کی اصل بخاری و مسلم میں بھی موجود ہے۔ حضورؐ نے ایک اور حدیث میں فرمایا۔ "جس نے میری سنت سے منہ موڑا، اس کا مجھ سے کچھ واسطہ نہیں۔" اس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس ضمن میں بکثرت احادیث مشہورہ وارد ہوئی ہیں۔ (الترغیب والترہیب ج ا ص ۴۰)۔

صحابہ کرام حضورؐ سے دریافت کر کے حدیث کی وقعت و اہمیت کیوں نہ جانتے ہوتے۔ جب کہ قرآن کریم ان کو اطاعت رسولؐ کا حکم دیتا اور آپ کی مخالفت سے روکتا ہے۔ اس ضمن میں بکثرت آیات قرآنی وارد ہوئی ہیں۔ حق بات یہ ہے کہ صحابہ اس بات سے بخوبی آگاہ و آشنا تھے۔ کہ حدیث نبوی قرآن کریم ہی کی طرح دائمی دین کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات ان کے نزدیک بدیہیات میں شامل تھی۔ جس کے لیے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ بلکہ دینی ضروریات میں سے یہ بھی ایک ضرورت ہے اور ہر زمانہ میں آج تک سب مسلمانوں کے نزدیک اس کو ایک بدیہی امر تصور کیا جاتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ صحابہ اگر اس کو جانتے ہوتے تو وہ احادیث کو لکھتے اور دوسروں سے لکھواتے تو یہ درست نہیں، جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔

ہم شیخ رشید رضا کی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ خلفائے راشدین قرآن اور سنت معروفہ پر اکتفا کرتے تھے۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے۔ جو خلفائے راشدین اور حضرات صحابہ کے طرز و انداز سے نابلد محض ہو۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ پیش آمدہ مسئلہ کا حل پہلے قرآن عزیز میں معلوم کرتے تھے۔ اگر اس میں نہ ملتا تو حدیث رسول میں تلاش کرتے۔ اگر حدیث نبوی میں بھی دستیاب نہ ہوتا تو اہل علم اور اکابر صحابہ کو بلا کر ان سے مشورہ کرتے اور کسی رائے پر متفق ہو جاتے۔

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہما کا طریق کار یہ تھا کہ جب وہ کسی پیش آمدہ مسئلہ کا فیصلہ کرتے اور پھر اپنے فیصلہ کے خلاف ان کو کوئی حدیث مل جاتی تو اپنے فیصلہ کو چھوڑ کر حدیث نبوی کی جانب رجوع کرتے۔ جن لوگوں کے احترام سنت کا یہ عالم ہو، ان کے بارے میں یہ بات کہنا کہاں تک درست ہے کہ وہ حدیث نبوی کو دائمی دین کا درجہ دینے کے خواہاں نہ تھے۔ یہ حقائق سے انکار اور زبردست قسم کی دھاندلی نہیں تو اور کیا ہے؟

قرآن کریم میں فرمایا۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ — اور اس شخص سے زیادہ گمراہ اور کون ہے جو ہدایت

بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ۔ خداوندی کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔

جب حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا یہ حال تھا جو سنّتِ رسولؐ کو سب صحابہ سے زیادہ جانتے تھے تو پھر یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ صحابہ کرام قرآن عزیز اور سنّتِ معروفہ پر اکتفا کرتے تھے؟

ج۔ شیخ رشید رضا لکھتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ صحابہ کی موجودگی میں حدیث کے خلاف حکم صادر کرتے تھے۔ پہلی اور دوسری صدی کے علماء مثلاً امام ابوحنیفہ کی حالت یہ تھی کہ جو احادیث ان کو معلوم ہُوا کرتی تھیں ان پر اکتفا کرتے، اگرچہ وہ تعداد میں کم ہوں۔ اور مزید احادیث کی جمع و تالیف میں محنت و کاوش انجام نہیں دیتے تھے۔"

ہم اس کی تردید میں کہتے ہیں۔

ا۔ یہ کہنا کہ فاروق اعظمؓ صحابہؓ کی موجودگی میں حدیث کے خلاف حکم صادر فرماتے تھے ان پر بہتانِ عظیم ہے۔ حضرت عمرؓ تو وہی ہیں جو ارشاد فرماتے ہیں۔

"اصحاب الرائے حدیث کے دشمن ہیں۔ جب احادیثِ نبویہ کو یاد نہ کرسکے اور اس بات سے شرمائے کہ لوگ مسائل پوچھیں گے اور وہ کہیں گے ہمیں نہیں معلوم، تو انہوں نے اپنی رائے کے ساتھ احادیث کا مقابلہ شروع کر دیا۔ ایسے لوگوں سے دُور رہو۔" (اعلام الموقعین ج اص ۵۵)

ذرا غور فرمائیے کیا یہ اس صحابی کا قول ہے جو حدیث کو داخلِ دین نہیں سمجھتا اور دانستہ اس کی خلاف ورزی کرتا ہے؟ یا اس شخص کا ارشاد ہے جو سنّتِ نبوی کا قدرشناس ہے۔ لوگوں کو اس کی مخالفت سے باز رکھتا اور اصحاب الرائے کے خلاف آرا کی مذمت کرتا ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بعض صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین نے بعض احادیث کی خلاف ورزی کی ہے۔ تو ہم نے ان کے عذرات کا تفصیلی جائزہ کتاب ہذا کے مقدمہ میں کرا دیا ہے۔ اسے ملاحظہ کر لیا جائے تاکہ ائمہ پر سے اس اعتراض کا ازالہ ہو جائے۔"

۲- شیخ رشید رضا پہلی اور دوسری صدی ہجری کے علما پر یہ بہتان لگاتے ہیں کہ وہ احادیث کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں محنت و کاوش سے کام نہیں لیا کرتے تھے۔ مگر قارئین کرام ان حقائق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ جو ہم نے پہلی صدی ہجری کے صحابہ و تابعین کے سفر و سیاحت کے سلسلہ میں تحریر کیے ہیں۔ مزید برآں دوسری صدی ہجری میں جو مساعی جمیلہ حدیث نبوی کی جمع و تدوین سے متعلق انجام دی گئیں، وہ بھی ان سے مخفی نہیں۔ اس صدی میں اسانید کی چھان پھٹک، متن کی نقد و جرح اور وضاعینِ حدیث کے مقابلہ کے لیے جو جہد و سعی عمل میں آئی۔ اس کی نظیر کسی قوم میں نہیں مل سکتی۔

۳- شیخ رشید رضا نے "امام ابو حنیفہ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ قلیل التعداد احادیث پر اکتفا کرتے تھے۔ اور اس بات کی زحمت انہیں گوارا نہ تھی کہ دین اسلام کا مکمل فہم و ادراک حاصل کرنے کے لیے دیگر احادیث کی طلب و تلاش کریں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ" کا نقطۂ نظر حدیث نبوی کے بارے میں وہی تھا، جو شیخ رشید رضا کا تھا۔ ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور دیگر علمائے کرام اس بدترین طرزِ فکر میں شیخ رشید رضا کے ہمنوا ہوں۔ امام ابو حنیفہ ایک صاحبِ اجتہاد امام تھے اور مقدور بھر اس امر کے لیے کوشاں رہتے تھے کہ قرآن و سنت سے شرعی احکام استنباط کریں۔ امام ابو حنیفہ سے جو بعض احکام احادیث نبویہ کے خلاف منقول ہیں۔ وہ ان میں معذور تھے جیسا کہ ہم مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔

ہم یہاں اس بات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ جس ماحول میں بود و باش رکھتے تھے۔ اس کے زیر اثر آپ نے حدیث نبوی کو قبول کرنے کے سلسلہ میں چند کڑی شرطیں عائد کر رکھی تھیں۔ آپ عراق میں سکونت گزیں تھے۔ جو خوارج و شیعہ کا مرکز و محور تھا۔ علاوہ ازیں طرح طرح کے لوگ عراق میں رہائش پذیر تھے۔ ان میں بہت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ گوئی کے خوگر ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ عراق کے بارے میں یہ ضرب المثل مشہور تھی کہ "عراق

حدیث کا ٹکسال ہے۔"

اندریں حالات کچھ عجب نہیں کہ امام ابو حنیفہ کو اپنا دین بچانے کی فکر دامنگیر ہو اور وہ حدیث نبوی کے بارے میں محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ اس میں اباطیل کا عمل دخل نہ ہو جائے طلب حدیث کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہ کے زیادہ سفر و سیاحت نہ کرنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کوفہ ان دنوں صحابہ کا مرکز تھا جنھوں نے عراق کے تابعین میں احادیث نبویہ اور اپنے علمی معلومات کو پھیلا دیا تھا۔ چنانچہ آگے چل کر ہم دوسری صدی ہجری میں حجیت حدیث پر بحث کرتے وقت اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

د۔ شیخ رشید رضا لکھتے ہیں۔

"اگرچہ فقہاء اس ضمن میں متفق الرائے ہیں کہ احادیث نبویہ احکام شرعیہ کے اصول و قواعد میں سے ایک عظیم اصل و اساس کا درجہ رکھتی ہیں۔ نیز یہ کہ حفاظ حدیث نے ان کو کتب حدیث میں مدون کر دیا۔ اور احادیث صحیحہ و سقیمہ میں فرق و امتیاز بھی قائم کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوصف فقہا احادیث پر عمل کرنے کے سلسلہ میں ہم خیال نہ ہو سکے۔ چنانچہ حنفیہ، شافعیہ اور مالکیہ کی کتب حدیث کو دیکھیے، ان میں سینکڑوں مسائل ہیں جو ان احادیث کے خلاف ہیں جن کی صحت پر اتفاق کیا گیا ہے۔ مگر ان میں سے کسی فقیہ کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاتی کہ اس نے ایک دینی اصل کی خلاف ورزی کی ہے۔ امام ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لاتعداد شواہد پیش کیے ہیں جن میں فقہا نے قیاس پر عمل کر کے احادیث صحیحہ کو رد کر دیا ہے۔ اس ضمن میں عجیب ترین بات یہ ہے کہ بعض فقہا نے ایک ہی حدیث کے ایک حصہ پر عمل کیا اور دوسرے کو ترک کر دیا ہے۔ ابن قیم نے اس کی ساٹھ سے زیادہ مثالیں پیش کی ہیں۔"

ہمارا جواب حسب ذیل ہے۔

یہ درست ہے کہ سب فقہا حدیث نبوی کو احکام شرعی کے اثبات کے لیے ایک اصل تسلیم کرتے ہیں اور اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ کسی ایک امام کے

پاس بھی تمام احادیث نبویہ جمع نہیں ہوئی تھیں۔ تاکہ ان کا اجتہاد نصوص کے مطابق ہوتا بخلاف ازیں ایک امام کو جو احادیث پہنچتیں وہ دوسرے کو نہ پہنچتیں۔ اور ایک کے پاس جو احادیث صحیحہ ہوتیں، وہ دوسرے کے یہاں نہ ہوتیں۔ اسی لیے شرعی احکام میں ائمہ کے مابین اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور بعض اوقات ان سے حدیث کی خلاف ورزی بھی صادر ہو جاتی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتے تھے۔ یا حدیث ان کے نزدیک دائمی دین کی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ بخلاف ازیں اس کے کچھ اور اسباب تھے، جو علما کو معلوم ہیں اور انہوں نے اس ضمن میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان علماء میں سے ایک واجب الاحترام شخصیت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی ہے۔ آپ نے "رفع الملام عن الأئمۃ الاعلام" اسی موضوع پر تصنیف کی۔

باقی رہا شیخ رشید رضا کا یہ اعتراض کہ کتب فقہ سینکڑوں خلافِ حدیث مسائل پر مشتمل ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ پچھلے ادوار میں لوگ تقلید جامد پر جم گئے تھے۔ اس لیے فقہ اسلامی ترقی کر کے احادیث نبویہ کے ساتھ ہم رنگ وہم آہنگ نہ ہو سکی۔ اگر فقہائے متاخرین میں علمی تحقیق کا ذوق ہوتا۔ اور وہ اپنے ائمہ کے مذاہب کو احادیث صحیحہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے تو فقہ اسلامی کو اس کے اصلی منبع یعنی کتاب وسنت کی جانب لوٹا دیتے اور ان کے درمیان اختلاف کا دائرہ بڑی حد تک محدود ہو جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ امام ابن قیم نے فقہائے متاخرین پر ملامت کی بوچھاڑ کی ہے کہ وہ اپنے ائمہ کے آراء کو حدیث صحیحہ کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب ائمہ اتباع سنت کا حکم دیتے اور لوگوں کو اپنی آراء ترک کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ بشرطیکہ حدیث صحیح موجود ہو۔ مگر شیخ رشید رضا نے یہ فرق نہیں کیا کہ فقہائے متاخرین کے پاس ترکِ حدیث کے لیے کوئی عذر نہ تھا۔ جب کہ فقہائے متقدمین ترکِ حدیث میں معذور تھے۔ شیخ نے دونوں قسم کے فقہا کو یکساں صرف اس لیے قرار دیا ہے کہ اپنے اس نظریہ کو ثابت کر سکیں کہ احادیث دائمی دین کا درجہ نہیں رکھتیں۔

سابقہ بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ رشید رضا کا دعویٰ بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ نصوص قرآن، احادیث متواترہ اور تمام اہل اسلام کے اجماع کے خلاف ہے جس پر عہد رسالت سے لے کر عصر حاضر تک کے مسلمان متفق رہے ہیں۔

چوتھا دور

حدیث دوسری صدی ہجری میں

دوسری صدی ہجری میں حدیث پر گفتگو مندرجہ ذیل پانچ مباحث پر مشتمل ہے۔

۱۔ اس عصر میں تدوینِ حدیث اور مشہور کتب مؤلفہ۔

۲۔ وضعِ حدیث کا آغاز اور وضاعین کے خلاف علما کی معرکہ آرائی۔

۳۔ اس دور میں حجیتِ حدیث میں نزاع۔

۴۔ مشاہیر محدثین کا تعارف۔

۵۔ مستشرقین کے الزامات کا ابطال۔

اب ہم یکے بعد دیگرے ان عنوانات پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔

اس عصر میں تدوینِ حدیث اور مشہور کتب مؤلفہ: سابقہ بیانات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ صحابہ و تابعین نے حدیث نبوی کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں کس قدر مساعی جمیلہ انجام دیں اور سیر و سیاحت کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے ساتھ احادیث نبویہ کے دامن کو خرافات اور اکاذیب کی آلودگی سے پاک کیا۔ خوارج، شیعہ اور اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے ایرانی، رومی اور یہودیوں کے مابین جو احادیث زبان زدِ عام تھیں، ان کی نشان دہی کی۔ یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو گئی کہ صحابہ و تابعین احادیث کو اپنے قوی ترین حافظہ میں جگہ دے کر کتابت سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ ان میں بعض کے بارے میں جو مروی ہے کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے تو اس کی وجہ ان کے حافظہ کی کمزوری نہ تھی۔ بلکہ اس لیے کہ ضبطِ تحریر میں لا کر احادیث کو اچھی طرح سے محفوظ کر لیا جائے۔

جب اسلام مختلف دیار و امصار میں پھیل گیا۔ اس کی جغرافیائی حدود میں وسعت آگئی۔ بدعت کا ظہور وشیوع ہوا اور صحابہ ادھر اُدھر شہروں میں بٹ گئے۔ ان میں بہت سے لڑائیوں میں فوت ہو گئے۔ قوت حافظہ کے کمزور پڑ جانے سے ضبط میں کمی آگئی تو احادیث کی تدوین وکتابت کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اندریں حالت امیر المؤمنین عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے پہلی صدی ہجری کے اختتام پر مدینہ کے عامل وقاضی ابوبکر بن حزم کو ان الفاظ پر مشتمل حکم ارسال کیا۔

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو احادیث دستیاب ہوں، انہیں لکھ لو۔ اس لیے کہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علما کے رخصت ہو جانے کا ڈر ہے۔"

حضرت عمر بن عبد العزیز نے ابوبکر بن حزم کو خصوصی طور پر یہ ہدایت فرمائی کہ عمرہ بنت عبد الرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر سے جو حدیثیں ملیں، ان کو تحریر کر لو۔ غرض یہ کہ آپ نے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنے عُمّال کو یہ حکم لکھ بھیجا کہ احادیث نبویہ کو یکجا کیا جائے۔ جن علما کو حضرت عمر بن عبد العزیز نے احادیث کی جمع وتالیف کے سلسلہ میں مامور فرمایا تھا۔ ان میں سے ایک محمد بن شہاب زہری بھی تھے۔ اس وقت سے علما نے احادیث کی جمع وتدوین کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ امام زہری کے طبقہ میں جو علما شامل تھے۔ انہوں نے خصوصی طور پر اس سلسلہ میں انتہائی محنت وکاوش سے کام لیا۔

مندرجہ ذیل علما کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

اسم گرامی	نام شہر	سال وفات ہجری
ابن جُریج	مکہ	۱۵۰
ابن اسحاق	مدینہ	۱۵۱
امام مالک	"	۱۷۹
ربیع بن صبیح	بصرہ	۱۶۰
سعید بن ابی عروبہ	"	۱۵۶

اسم گرامی	نام شہر	سال وفات ہجری
حماد بن سلمہ	بصرہ	۱۷۶
سُفیان ثوری	کوفہ	۱۶۱
اَوزاعی	شام	۱۵۶
ہُشَیم	واسط	۱۸۸
معمر	یمن	۱۵۳
جریر بن عبدالحمید	خراسان	۱۸۸
ابن المبارک	"	۱۸۱

یہ سب لوگ ایک ہی زمانہ میں تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس ضمن میں سبقت کا شرف کس کے حصے میں آیا۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی ان کے دیگر معاصرین بھی اس روش پہ گامزن ہو گئے ان کا طرز و انداز یہ تھا کہ وہ باہم ملتی جلتی احادیث کو ایک باب میں جمع کرتے تھے۔ پھر ایک باب کے بعد دوسرا باب علی الترتیب تحریر کرتے جاتے تھے۔ پھر ان تمام ابواب کو ایک تصنیف میں یک جا کر دیتے۔ احادیث کو صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاویٰ کے ساتھ مخلوط کر دیا کرتے تھے مگر پہلی صدی ہجری کے مؤلفین مثلاً زُہری کا انداز اس سے مختلف تھا۔ وہ ہر مسئلہ کے بارے میں الگ تصنیف لکھا کرتے تھے۔ اور اس میں احادیث کے ساتھ اقوال صحابہ و تابعین سب مخلوط کر دیا کرتے تھے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، تدوین حدیث کا آغاز اموی خلافت کے اواخر میں ہوا۔ مگر اس کو عروج خلافت عباسیہ کے دوران دوسری صدی ہجری کے نصف میں حاصل ہوا۔ جب مختلف علوم و فنون کی تدوین عمل میں آئی، تو حدیث نبوی کو بھی اس کا جائز حصہ مل گیا۔

مگر سوال یہ ہے کہ جو جامع تصانیف امام زُہری اور ان کے بعد آنے والے محدثین نے مرتب کی تھیں، وہ کہاں گئیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم کتب نقل ہو کر ہم تک

پہنچ سکی ہیں۔ مثلاً موطا امام مالک و مسند امام شافعی و کتاب الآثار محمد بن حسن شیبانی متوفی ۱۸۹ھ جو موطا امام مالک کے ایک راوی بھی ہیں۔

تصنیف و تالیف میں تدریج کی جو سنت رائج ہے، عین ممکن ہے کہ وہ ان تصنیفات کے مٹ جانے کا باعث بنی ہو۔ تاریخ اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے کہ مختلف علوم و فنون کی تالیف و تصنیف میں تدریجاً حسن پیدا ہوتا چلا گیا۔ ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ اور ایک عہد کے بعد دوسرا عہد پہلے سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ حسن و خوبی کے اعلیٰ معیار پر فائز ہو گیا۔ حدیث نبوی بھی اس سے خارج نہیں اور اس میں کچھ مضائقہ بھی نہیں۔ اس لیے کہ جو احادیث زہری و دیگر محدثین کی تصانیف میں موجود تھیں۔ وہ اگلے ادوار میں اشاعت پذیر ہونے والی کتب حدیث میں بھی موجود ہیں۔ البتہ ان کی ترتیب و تہذیب کا رنگ ڈھنگ جداگانہ طرز کا ہے اور وہ اس عصر و عہد کی غمازی کرتا ہے جس میں ان کو مرتب کیا گیا۔ اب ہم زیر بحث عصر و عہد کی مشہور ترین کتاب موطا پر تفصیلی تبصرہ کرتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۔ تدریب الراوی ص ۴۔ کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۶-)

موطا امام مالک: اس کتاب کے مولف امام مالک رحمہ اللہ ہیں۔ یہ احادیث رسولؐ اور صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاویٰ کی جامع ہے۔ خلیفہ منصور عباسی نے امام مالک سے درخواست کی تھی کہ جو احادیث ان کے نزدیک صحیح ہوں۔ ان کو ایک کتاب میں یکجا کر دیا جائے چنانچہ آپ نے یہ کتاب تالیف کر کے اس کا نام موطا رکھا۔

وجہ تسمیہ: موطا کے معنی پامال اور ہموار راستہ کے ہیں۔ اس کتاب کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جناب امام نے یہ کتاب تالیف کر کے اپنے شیوخ و اساتذہ کو دکھائی۔ "فَوَاطَؤُہُ عَلَیْہِ" (انہوں نے اس کی موافقت و تائید کی) اس لیے امام مالک نے اس کا نام "اَلْمُوَطَّا" (موافقت کردہ شدہ) تجویز کیا۔

جلال الدین سیوطی نے اپنی شرح موطا کے مقدمہ میں امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے یہ کتاب مدینہ کے ستر (۷۰) فقہا کو دکھائی۔ سب نے میری تائید کی۔ اس لیے میں نے اس کا نام "موطا" رکھا"۔

امام مالک نے موطا میں اہل حجاز راویوں کی احادیث صحیحہ شامل کرنے کا التزام کیا ہے علما کا قول ہے کہ آپ چالیس سال موطا کی کانٹ چھانٹ کرتے رہے۔ امام سیوطی اپنی شرح موطا کے مقدمہ میں اوزاعی سے نقل کرتے ہیں کہ ہم نے امام مالک کو ان کی کتاب موطا چالیس دنوں میں سنائی۔ فرمانے لگے "جس کتاب کو چالیس سال میں مرتب کیا تھا وہ تم نے چالیس دنوں میں پڑھ لی۔ تم نے اس کے مطالب و مندرجات کس قدر کم سمجھے ہیں"۔

موطا میں امام مالک کی یہ عادت ہے کہ باب کے شروع میں جو احادیث اس سے متعلق وارد ہوئی ہیں۔ وہ بیان کر دیتے ہیں۔ پھر صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار ذکر کرتے ہیں۔ یہ صحابہ و تابعین اکثر و بیشتر اہل مدینہ میں سے ہوتے ہیں۔ امام مالک شاذ و نادر ہی اہل مدینہ کے سوا کسی اور سے روایت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ مدینہ سے باہر تشریف ہی نہیں لے گئے تھے۔ بعض اوقات اہل مدینہ کے تعامل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ گاہے حدیث کے بعض مشکل الفاظ یا جملوں کی شرح و تفسیر بھی فرماتے ہیں۔

احادیث موطا کا درجہ: احادیث نبویہ کے بارے میں جو شخص امام کی روش سے آگاہ ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ حدیث کا متن ہو یا سند آپ اس میں حد درجہ غور و فکر سے کام لینے کے عادی ہیں۔ علمائے قدیم و جدید اس کا اعتراف کر چکے ہیں۔ چونکہ موطا جناب امام کی چالیس سالہ جانفشانی و عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔ اس لیے یہ کتاب نہایت بلند پایہ اور اپنے باب میں عدیم النظیر ہے۔ علمائے سلف و خلف بیان کر چکے ہیں کہ موطا میں مندرجہ تمام احادیث صحیح ہیں، اسی طرح ان کی جملہ اسانید متصل ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

"امام مالک کی کتاب ان کے اور ان کے مقلدین کے نزدیک صحیح ہے اور ان کے اس قاعدہ کے مطابق ہے کہ وہ مرسل ومنقطع احادیث سے احتجاج کرنے کے قائل ہیں۔"

حافظ ابن حجر نے یہاں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ دیگر علما کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ موطا میں جو مرسل ومنقطع احادیث پائی جاتی ہیں، دوسرے طرق سے ان کا متصل ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ اس طرح موطا کی تمام احادیث صحیح ہیں۔ امام مالک کی زندگی ہی میں علما نے احادیث موطا کی تخریج کا کام شروع کر دیا تھا۔ اور جو احادیث اس کی مرسل یا منقطع ہیں، ان کا متصل ہونا بھی ثابت کیا تھا۔ ان میں وہ اکابر علما بھی شامل ہیں، جنہوں نے امام مالک کے شیوخ سے بذات خود استفادہ کیا تھا۔ مثلاً سفیان ثوری وسفیان بن عیینہ وابن ابی ذئب و دیگر علماء۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۳)

پانچویں صدی ہجری کے جید عالم ابن عبدالبر نے اس ضمن میں ایک جامع کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں موصوف نے ان تمام احادیث کا متصل ہونا ثابت کیا ہے۔ جن کو امام مالک نے بصورت مرسل ومنقطع ومعضل روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں موطا میں جہاں بھی امام مالک نے "بَلَغَنِیْ" (مجھے یہ حدیث پہنچی) یا "اَلثِّقَۃُ" (ایک ثقہ راوی سے روایت ہے) کہتے ہیں۔ اور اس حدیث کو متصلاً روایت نہیں کرتے، موطا میں ایسی کل اکسٹھ احادیث ہیں۔ یہ تمام احادیث امام مالک کے علاوہ دوسری اسانید سے متصلاً مذکور ہیں۔ البتہ چار احادیث ایسی ہیں۔ جن کا متصل ہونا ثابت نہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ "اِنّی لا اَنسٰی" یہ حدیث باب العمل فی السہو میں مذکور ہے۔

۲۔ "اُری اعمار الناس قبلہ" یہ حدیث باب ما جاء فی لیلۃ القدر کتاب الاعتکاف میں ہے۔

۳۔ "آخر ما اوصانی بہ رسول اللہ" یہ حدیث کتاب الجامع میں مرقوم ہے۔

۴۔ "اذا نشأت بحریۃ ثم تشاءمت" یہ حدیث باب الاستمطار بالنجوم میں مذکور ہے۔

مگر صحیح یہ ہے کہ ان مذکورہ صدر احادیث اربعہ کا موصول ہونا ثابت ہے۔ ابن عبدالبر پہلی حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہے۔ سفیان کا قول ہے کہ جب امام مالک "بلغنی" کہتے ہیں تو اس کو اسناد صحیح پر محمول کرنا چاہیے۔ امام جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تنویر الحوالک میں دوسری حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اس مُرسل کے شواہد موجود ہیں، جو معنوی اعتبار سے اس کی تائید کرتے ہیں"۔ پھر سیوطی نے وہ شواہد ذکر کیے ہیں۔ باقی رہی تیسری حدیث، تو ترمذی میں اس کی ہم معنی حدیث موجود ہے۔ چوتھی حدیث کا شاہد امام شافعی نے اپنی کتاب "الام" میں اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سند میں امام مالک نہیں ہیں۔

علما نے ان احادیث اربعہ کو بحث و تمحیص کا مرکز بنایا اور ان کا متصل ہونا ثابت کیا ہے حافظ ابن الصلاح نے ایک مستقل تصنیف میں ان کو موصول قرار دیا ہے۔ اسی طرح حافظ بن مرزوق المعروف بالخطیب نے احادیث اربعہ کی اسانید کو ایک جداگانہ کتاب میں جمع کیا ہے۔ حافظ ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب "التقید التقیید" میں ان میں سے دو احادیث کو مسند ٹھہرایا ہے۔ سفیان بن عُیَیْنَہ کے مندرجہ ذیل قول سے احادیث اربعہ کا دیگر احادیث کی طرح متصل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"امام مالک صرف اسی حدیث کو روایت کرتے ہیں جو صحیح ہو۔ آپ ہمیشہ ثقہ راویوں سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے"۔ (اضاءۃ الحالک ص ۶۳)

علمائے سلف و خلف کی مندرجہ صدر شہادتوں کی بنا پر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ موطا میں مندرج تمام احادیث صحیح اور متصل ہیں۔ امام مالک جیسے جلیل القدر محدّث و نقاد اور امام مدینہ و عالم اہل حجاز سے اس کے سوا کسی اور اس بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

احادیث موطا کی تعداد:

احادیث موطا کی تعداد کے بارے میں علماء مختلف الرائے ہیں۔

ابن الهباب کہتے ہیں۔

" امام مالک نے ایک لاکھ احادیث روایت کی تھیں۔ ان میں سے موطا میں دس ہزار حدیثیں جمع کیں۔ پھر کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھ کر بدستور ان میں کانٹ چھانٹ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ پانچ سو (۵۰۰) احادیث باقی رہیں"۔

ابوبکر ابھری لکھتے ہیں۔

احادیث موطا کی تعداد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ احادیث نبویہ مع اقوال صحابہ و تابعین کل ایک ہزار سات سو بیس (۱۷۲۰)۔

۲۔ مرفوع احادیث، چھ سو (۶۰۰)۔
۳۔ مرسل روایات، دوسو بائیس (۲۲۲)۔
۴۔ موقوف روایات، چھ سو تیرہ (۶۱۳)۔
۵۔ اقوال تابعین، دوسو پچاسی (۲۸۵)

} کل تعداد ۱۷۲۰

امام ابن حزم فرماتے ہیں۔

" میں نے موطا امام مالک اور سفیان بن عُیَیْنہ کی کتاب میں مندرج احادیث شمار کیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک میں پانچ سو سے زائد احادیث مرفوع ہیں۔ تین صد سے زائد مرسل روایات۔ اور ستر سے زائد احادیث ایسی ہیں جو امام مالک کے نزدیک معمول بھا نہیں ہیں۔ ان میں ایسی احادیث بھی ہیں جن کو جمہور علماء نے ضعیف قرار دیا ہے"۔

موطا میں شامل احادیث کی تعداد میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ موطا کے نسخہ جات اور اس کے روایت کرنے والوں کا تنوع و اختلاف ہے۔ احادیث شمار کرنے والوں کو جو نسخہ ہاتھ آیا۔ اسی کے پیش نظر انہوں نے احادیث مندرجہ کی تعداد بتائی۔ امام سیوطی اپنی کتاب تدریب الراوی میں حافظ صلاح الدین عَلَائی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

" امام مالک سے متعدد لوگوں نے موطا روایت کی ہے۔ ان کی روایات میں

تقدیم و تاخیر اور کمی و بیشی پر مشتمل بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ موطا کا جو نسخہ بروایت ابن مُصعب منقول ہے، وہ بہت زیادہ اضافہ پر مشتمل ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ ابن مُصعب کے نسخہ میں ایک صد احادیث زائد ہیں جو دوسرے نسخہ جات میں نہیں ہیں۔ اسی طرح محمد بن حسن کے نسخہ میں ایک سو پچھتر (۱۷۵) زائد ہیں جو ایسی سند کے ساتھ مروی ہیں جس میں امام مالک شامل نہیں۔ ان میں تیرہ احادیث امام ابوحنیفہ سے چار قاضی ابو یوسف سے اور باقی دوسروں سے منقول ہیں۔" (تدریب الراوی ص ۳۲ و مفتاح السنۃ للخولی ص ۲۴)۔

روایاتِ موطا: اسی بنا پر موطا میں مندرج احادیث کی تعداد میں لوگوں کے اقوال مختلف ہیں۔ ہر شخص نے وہی بتایا جو وہ جانتا تھا۔ موطا کے نسخہ جات کی تعداد یوں تو بہت ہے مگر ان میں سے تیس نسخے مشہور ہیں۔ ان نسخہ جات میں کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے اعتبار سے بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ جلال الدین سیوطی ذکر کرتے ہیں کہ راویوں سے منقول چودہ نسخے بہت مشہور ہیں۔ ان چودہ نسخہ جات میں مندرجہ ذیل نسخے شامل ہیں۔

۱۔ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی اندلسی کا نسخہ۔ یحییٰ نے پہلے عبدالرحمٰن سے موطا سُنی، جو شبطون کے نام سے معروف تھے۔ پھر دو دفعہ امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور موطا سُنی۔ مگر کتاب الاعتکاف کے آخر کے تین ابواب نہ سن سکے۔

۲۔ مدینہ کے قاضی ابن مُصعب احمد بن ابی بکر کا نسخہ۔ علما کا کہنا ہے کہ ان کا مرتب کردہ نسخہ سب سے آخر میں امام مالک کو سنایا گیا تھا۔ موطا کے اس نسخہ میں دیگر نسخہ جات سے یک صد احادیث زائد ہیں جو دوسروں نسخوں میں نہیں ہیں۔

۳۔ امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید محمد بن حسن شیبانی کا نسخہ۔ یہ حدیث میں امام مالک کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ اسی طرح فقہ میں ان کا شمار امام ابوحنیفہ کے بہترین شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ان کے نسخہ میں یحییٰ کے نسخہ کی نسبت بکثرت اضافے ہیں۔ یہ نسخہ ہند و ایران میں طبع ہو چکا ہے، اور وہاں اور حرمین میں بہت مشہور ہے۔

صاحب کشف الظنون رقمطراز ہیں۔

"ابوالقاسم محمد بن حسین شافعی فرماتے ہیں کہ امام مالک سے مؤطا کے گیارہ نسخے منقول ہیں یہ قریب المعنیٰ ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل چار نسخے بہت مشہور ہیں۔

۱۔ یحییٰ بن یحییٰ کا نسخہ۔

۲۔ موطا ابن بکیر۔

۳۔ ابن مصعب کا نسخہ۔

۴۔ موطا بروایت ابن وہب۔

چاروں نسخہ جات میں سے مقبول ترین نسخہ یحییٰ کا ہے اور پھر ابن بکیر کا۔

(اضاءۃ الحالک ص ۴۰۔ کشف الظنون ج ۲ ص ۳۷۰)

شرح موطا:

متعدد علما نے موطا کی شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں۔

۱۔ حافظ ابوعمر بن عبدالبر قرطبی متوفی ۴۶۳ھ۔ آپ نے موطا کی دو شرحیں لکھی ہیں۔ ایک کا نام "التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید" ہے۔ اس کو امام مالک کے شیوخ کے اسما کے مطابق بترتیب حروف تہجی مرتب کیا ہے۔ ایسی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ "فقہ الحدیث کے موضوع پر میرے علم میں اس جیسی کتاب اور کوئی نہیں۔ اور اس سے بہتر کتاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ابن عبدالبر نے اس شرح کی تعریف میں یہ اشعار لکھے ہیں۔

۱۔ سمیر فؤادی من ثلاثین حجۃ	وصاقل ذھنی والمفرج عن ھمتی
۲۔ لبسطت لھم فیہ کلام نبیھم	لما فی معانیہ من الفقہ والعلم
۳۔ وفیہ من الآداب مایھتدی بہ	الی البر والتقوی ونھی عن الظلم

ترجمہ۔ ۱۔ یہ کتاب، تیس ۳۰ سال سے میرے دل کی ہم راز چلی آرہی ہے، میرے ذہن کو

صاف کرنے والی اور پریشانیوں کو دُور کرنے والی ہے۔

۲۔ میں نے اس میں رسول کریم کے کلام کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور اس کے معانی فقہ و علم پر مشتمل ہیں۔

۳۔ اس میں ایسے آداب مذکور ہیں جن سے نیکی و تقویٰ کی راہ ملتی ہے اور آدمی ظلم سے باز رہتا ہے۔

ابن عبد البر کی دوسری شرح کا نام "کتاب الاستذکار فی شرح مذاہب علماء الامصار" ہے۔ یہ موطا کی بہترین شرح ہے۔ ابن عبد البر بہت لائق مصنف تھے۔

۲۔ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ۔ آپ کی شرح کا نام کشف المغطیٰ فی شرح الموطا ہے۔ پھر موصوف نے اس کا اختصار "تنویر الحوالک" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب مصر سے تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

۳۔ محمد بن عبد الباقی زرقانی مصری مالکی متوفی ۱۱۲۲ھ ان کی شرح متوسط ہے اور تین جلدوں میں ہے۔

۴۔ مولانا عبد الحی بن محمد لکھنوی ہندی ولادت ۱۲۶۴ھ۔ آپ کی شرح کا نام "التعلیق الممجد علی موطا الامام محمد" ہے۔ یہ شرح پاکستان و ہند میں طبع ہو چکی ہے۔

۵۔ مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے جن کا نام قطب الدین احمد بن عبد الرحیم ہے۔ موطا کی دو شرحیں تحریر کیں۔ آپ کا سال وفات ۱۱۷۶ھ ہے۔ ایک شرح فارسی زبان میں لکھی۔ اس کا نام "المصفّٰی" ہے۔ یہ صرف احادیث و آثار کی شرح ہے۔ امام مالک کے اقوال اور بلاغات اس میں حذف کر دیئے ہیں۔ اس شرح میں آپ نے مجتہدانہ انداز تحریر کیا ہے۔ دوسری شرح عربی میں ہے۔ اس کا نام "المسوّٰی" ہے۔ اس میں اختلاف مذاہب پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کسی حد تک مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۳۸۰ مفتاح السنہ ص ۷۰۔ الانتقاء ص ۵ نیز اضاءۃ الحالک ص ۸)۔

مندرجہ ذیل علما نے موطّا کو مختصر کیا اور اس کا خلاصہ لکھا۔

مختصراتِ موطّا: ۱- امام ابو سلیمان خطابی متوفی ۳۸۸ھ۔

۲- امام ابو الولید الباجی متوفی ۴۷۴ھ۔

۳- ابن رشیق القیروانی متوفی ۴۵۶ھ

۴- ابن عبدالبرؒ متوفی ۴۶۳ھ- ان کی کتاب کا نام "التقصی فی مسند الموطا ومرسلہ"۔

۵- ابو القاسم عبدالرحمٰن الغافقی الجوہری متوفی ۳۸۵ھ- ان کی مختصر چھ سو چھیاسٹھ مسند احادیث پر مشتمل ہے۔ (الرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۱- کشف الظنون ج ۲ ص ۳۸۰)۔

موطّا کی اہمیّت: جب سے امام مالک نے موطّا تالیف کی، علماء دور دراز کا سفر طے کر کے امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سے موطّا کا درس لیتے رہے۔ حتٰی کہ ایک ہزار سے زیادہ لوگوں نے براہِ راست موطا آپ سے سُن کر روایت کی۔ گویا امام مالک ترمذی کی مندرجہ ذیل حدیث نبوی کے مصداق تھے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وہ زمانہ کچھ دُور نہیں جب لوگ سوختہ جگر اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی تلاش کو نکلیں گے اور مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو نہ پائیں گے۔" (ترمذی)

اس حدیث کے راوی عبدالرزاق کہتے ہیں کہ "عالم مدینہ" سے اس حدیث میں امام مالک مراد ہیں۔

لاتعداد علماء نے باختلافِ مسالک و مشارب موطّا امام مالک کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

عظیم فقہاء: امام شافعی- محمد بن حسن شیبانی- ابن وہب- ابن القاسم۔

اکابر محدثین: یحییٰ بن سعید القطان- عبدالرحمٰن بن مہدی- عبدالرزاق بن ہمام۔

ملوک و اُمراء: خلیفہ ہارون الرشید اور ان کے دونوں بیٹے۔

موطا اپنے موقف امام مالک کی زندگی ہی میں حد درجہ شہرت پذیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ تمام دیار و بلاد اور دُور نزدیک کے رہنے والے اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا موطا کی شہرت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اس میں تعجب کی بات بھی کیا ہے۔ اس لیے کہ فقہانے موطا ہی کو اپنے فقہی مذہب و مسلک کو اساس قرار دیا تھا۔ اس کی حد یہ ہے کہ (حنفیہ کے مرکز) عراق میں بھی فقہی مسائل کی بنا موطا ہی پر رکھی گئی تھی۔

علماء کی قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ کوئی اس کی احادیث کی تخریج کرتا اور کوئی اس کے متابعات و شواہد تلاش کرتا۔ بعض علمانے اس کے مشکل الفاظ کی شرح لکھی۔ اور ان کو ضبط کیا۔ بعض نے اس کے فقہی مباحث کو موضوع سخن بنایا۔ دیگر علمانے اس کے رجال کے بارے میں داد تحقیق دی۔ دوسری طرف خلفاء و سلاطین موطا کی قدر شناسی کا حق ادا کرتے رہے۔

ابو نعیم حلیۃ الاولیا میں امام مالک سے نقل کرتے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید نے مجھ سے مشورہ کیا کہ موطا کو کعبہ میں آویزاں کر دیا جائے۔ اور لوگوں کو مامور کیا جائے کہ وہ اس کی پیروی کریں۔ میں نے کہا کہ ایسا نہ کیجیے۔ اس لیے کہ اصحاب رسول مختلف شہروں میں بس گئے تھے اور وہ دین کے فروعی مسائل میں مختلف الرائے تھے۔ اور اپنی اپنی جگہ سب درست ہی کہتے تھے۔ ہارون الرشید کہنے لگا ابو عبداللہ (امام مالک کی کنیت) خداوند کریم آپ کو توفیق عطا فرمائے۔"

قاضی فاضل نے اپنے بعض خطوط میں لکھا ہے کہ "مجھے نہیں معلوم کہ کوئی بادشاہ کبھی علم کی تلاش میں نکلا ہو بجز ہارون الرشید کے۔ خلیفہ ہارون اپنے دونوں بیٹوں امین و مامون کو لے موطا سننے کے لیے امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔" موطا کے جس نسخے سے ہارون نے امام مالک سے سماع کیا تھا وہ مصر کے دار الکتب میں موجود تھا۔ اسی طرح سلطان صلاح الدین علی بن طاہر بن عوف سے موطا کا درس لینے کے لیے اسکندریہ حاضر ہوئے تھے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۳۔ تاریخ الخلفاء ص ۱۹۵۔ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۱۳)

امام مالک محدث نہ تھے؟ عصر حاضر کے بعض مصنف کہتے ہیں کہ امام مالک محدث نہ تھے

نیز یہ کہ موطا احادیث و آثار کی کتاب نہیں بلکہ فقہ کی کتاب ہے۔ اس رائے کا اظہار پروفیسر علی حسن عبد القادر نے اپنی کتاب "نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی" میں کیا ہے۔ چنانچہ پہلے ہم ان کے خیالات نقل کر کے پھر ان کا ابطال کریں گے۔

موصوف لکھتے ہیں۔

"امام مالک کی بنیادی کتاب موطا ہے۔ اگر زید کے فقہی مجموعہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو موطا اسلام میں فقہ کی اولین کتاب ہے۔ جو نقل ہو کر ہم تک پہنچی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ امام مالک کے زمانہ میں فقہی تدوین کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ موطا کو حدیث کی اولین عظیم کتاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ باوجودیکہ موطا کو اسلام میں بڑا مقام حاصل ہے اور اس کے مؤلف امام دار الہجرت تھے اور ان کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تاہم موطا در اصل حدیث کی کتاب شمار نہیں کی جاتی۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ امام مالک کی کتاب ان کتب حدیث کی طرح نہیں جو محدثین نے اگلے تاریخی ادوار میں تالیف کی تھیں۔ تاریخ کتب میں موطا کو کتب حدیث میں شمار نہیں کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ موطا فقہ کی کتاب ہے۔ اس لیے نہیں کہ موطا میں وہ تمام ابواب مفقود ہیں جو عام طور سے جامع کتب حدیث میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ امام کی غرض فقہ کی کتاب مرتب کرنا تھا اور اس کی وضع و ترتیب بھی کتب فقہ سے ملتی جلتی ہے۔ امام مالک کا مقصد یہ نہ تھا کہ جو احادیث صحیحہ دستیاب ہیں، ان کو موطا میں یکجا کر دیا جائے۔ بخلاف ازیں وہ فقہ و قانون کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کے خواہاں تھے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ امام مالک نے اس میں صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاویٰ اور اپنے افکار و آراء جمع کر دیئے ہیں۔ بنا بریں ہم کہتے ہیں کہ امام مالک محدث نہ تھے۔ بلکہ عملی و فقہی حیثیت سے احادیث کے شارح تھے۔ چنانچہ موطا سے اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں

پھر موصوف نے چند امثلہ کا تذکرہ کیا ہے۔ علی حسن نے جہاں رائے وقیاس کے بارے میں امام مالک کا زاویۂ نگاہ بیان کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ ہم اس سے بسہولت یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ امام مالک محدث نہ تھے۔ نیز یہ کہ وہ حدیث آحاد کو قابل اعتماد بھی نہ سمجھتے تھے۔"

(نظرۃ عامۃ ص ۲۴۴-۲۴۹)۔

مندرجہ بیانات سے ہم دو نتیجے نکال سکتے ہیں۔

۱۔ موطا حدیث کی کتاب نہیں۔

۲۔ امام مالک محدث نہ تھے۔

اس بات کی تردید کہ موطا حدیث کی کتاب نہیں

۱۔ علی حسن عبدالقادر نے موطا کو کتب حدیث سے خارج کرنے کے سلسلہ میں دو باتوں پر اعتماد کیا ہے۔ اول یہ کہ امام مالک کا مقصد حدیث کی کتاب تالیف کرنا نہ تھا۔ بخلاف ازیں وہ فقہی مسائل کا مجموعہ مرتب کرنے کے خواہاں تھے۔

دوم یہ کہ موصوف نے اپنی کتاب کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا ہے۔

اب ہم اس کی تردید کرتے ہیں۔

۱۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ امام مالک فقہی مسائل کا مجموعہ مرتب کرنا چاہتے تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کا مقصد یہ بھی ہو کہ فقہی مسائل کے ساتھ ساتھ اس میں احادیث صحیحہ بھی جمع کر دی جائیں۔ اور اس طرح آپ کی کتاب حدیث نبوی اور فقہ اسلامی دونوں کا مجموعہ ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی کتاب محدثین اور فقہا دونوں کا مرجع و محور ہوگی۔

دراصل یہ بات درست بھی ہے اور تاریخ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ثقہ راویوں سے مروی و منقول ہے کہ مختلف بلاد و دیار کے علماء اختلافِ مسلک و مشرب کے باوجود امام سے موطا کا سماع کرنے کے لیے بنفس نفیس مدینہ حاضر ہوئے۔ ان میں امام مالک کے ہم پلہ مجتہدین فقہا بھی تھے۔ مثلاً شافعی، محمد بن حسن شیبانی و قاضی ابو یوسف شاگردان امام ابوحنیفہ

وغیرہم۔ ان اکابر فقہاء کا موطا کو سننا، اس کی روایت کرنا، اس میں غور وفکر کرنا اور اپنے فقہی مسلک کو چھوڑ کر احادیث موطا کے مدلول و مفہوم کی طرف رجوع کرنا جیسا کہ محمد بن حسن شیبانی نے کیا۔ اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ موطا کا تعلق جس قدر حدیث نبوی کے ساتھ ہے فقہ و رائے کے ساتھ اس حد تک نہیں۔

ہم قبل ازیں اس بات پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ محدثین نے امام مالک کے زمانہ میں موطا کے ساتھ کس قدر اعتنا کیا تھا۔ اس کی حد یہ ہے کہ عظیم محدثین مثلاً یحییٰ بن سعید القطان وعبدالرحمٰن بن مہدی و عبدالرزاق اور ملوک و امراء مثلاً ہارون الرشید اور آگے چل کر صلاح الدین ایوبی بذات خود موطا کے سماع کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ کہ موطا فقہ سے زیادہ حدیث کی کتاب ہے۔

۲۔ علی حسن کا یہ استدلال کہ امام مالک نے موطا کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا اور اس میں صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاوی کو یکجا کیا ہے۔ اس لیے موطا فقہ کی کتاب ہے ہمارے نزدیک قابل تسلیم نہیں اور اس کی بنا پر موطا کو کتب حدیث سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ بخاری بلا نزاع و جدال امام المحدثین ہیں۔ اور وہ بھی صحیح بخاری میں اسی روش پر گامزن رہے ہیں۔ امام موصوف نے صحیح بخاری کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا اور بے شمار موقوف احادیث اور قرآنی آیات بھی اس میں یکجا کر دی ہیں۔ مزید براں صحیح بخاری میں ان کے ذاتی افکار و آراء اور اجتہادات بھی مذکور ہیں۔ مگر آج تک ایک عالم بھی ایسا نہیں جس نے یہ بات کہی ہو کہ صحیح بخاری حدیث کی کتاب نہیں بلکہ فقہ کی کتاب ہے۔ اور وہ حدیث کی نسبت اقرب الی الفقہ ہے۔

امام بخاری کا مقصد یہ نہ تھا کہ جو احادیث صحیحہ ان کے عصر و عہد میں موجود ہیں سب کو یکجا کر دیا جائے۔ اور اگر استاد علی حسن عبدالقادر کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ صحیح بخاری اس امر کے لیے موزوں تر ہے کہ اسے کتب حدیث کے زمرہ سے نکال دیا جائے

حالانکہ وہ بلا نزاع و خلاف اُمہاتِ کتب حدیث میں شمار کی جاتی ہے بلکہ ان سب میں اَولیٰ و افضل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موطا کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کرنے اور اس میں احادیث نبویہ کے ساتھ صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاویٰ کو مخلوط کرنے میں امام مالک منفرد نہیں تھے۔ بلکہ امام مالک کے ہم عصر تمام اہل تصنیف محدثین کا طرز و انداز یہی تھا۔ مثلاً ابن عُیینہ و شعبہ بن حجاج و عبدالرزاق ولیث بن سعد وغیرہم۔

ب۔ علی حسن نے دوسری بات یہ کہی ہے کہ امام مالک محدث نہ تھے۔ اب ہم اس کی تردید کرتے ہیں۔

علی حسن اپنی کتاب کے بیشتر مقامات پر یہ بات دُہراتے ہیں کہ امام مالک محدّث نہ تھے۔ حالانکہ یہ بات جملہ اہل اسلام کے اجماع کے خلاف ہے جو جمیع عصور و ازمنہ میں منعقد ہوتا رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ علی حسن دیکھتے ہیں کہ بعض مسائل میں امام مالک ایسا اجتہاد کرتے ہیں جو نصوص کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ یا ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہو کہ موطا حدیث کی کتاب نہیں بلکہ فقہ کی کتاب ہے۔ اس لیے امام بھی فقیہ ہیں محدث نہیں۔ ہم قبل ازیں اس زعم فاسد کا ابطال کر چکے ہیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ جناب امام رائے و اجتہاد سے کام لیتے تھے تو یہ ایک مسلمہ بات ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ وہ ایک جلیل القدر امام تھے۔ اور اجتہاد مطلق کے مرتبہ پر فائز تھے۔ مگر اس سے ان کے ایک عظیم محدث و نقاد ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ آپ احادیث نبویہ کے گراں بہا ذخیرہ سے مالا مال تھے۔ اور اس ضمن میں کوئی معاصر ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔ منقول ہے کہ آپ نے ایک لاکھ احادیث نبویہ روایت کیں۔ آپ رُواۃ و رجال کے زبردست ناقد تھے اور اسانید کے جوہری تھے۔ اور یہ وہ بات ہے جس کا اعتراف ان کے تلامذہ سے پہلے ان کے اقران و اماثل کرتے ہیں۔

لوگ ہر عصر و عہد میں امام مالک کی مرویات پر اعتماد کرتے رہے۔ امام بخاری کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی حدیث امام مالک سے مل جاتی تو کسی دوسرے کی پروا نہ کرتے۔ اگر کوئی محدث رائے وقیاس سے کام لیتا ہو اور وہ اجتہاد کے درجہ پر فائز ہو اور تفسیر قرآن و فقہ الحدیث کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتا ہو تو وہ اس کی بنا پر محدثین کے زمرہ سے باہر نہیں نکل جاتا۔ ایسے شخص کو اگرچہ فقیہہ ٹھہرا سکتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ محدث نہیں رہتا۔ پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ امام مالک اس ضمن میں منفرد نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں دیگر محدثین بھی احادیث نبویہ کے ساتھ ساتھ رائے و اجتہاد کے جامع تھے۔ اور ان کا ایک خاص فقہی مسلک بھی تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ فقہی مسلک کرۂ ارضی سے ناپید ہو گیا۔ مثلاً ابن عُیَیْنَہ و سفیان ثوری و اوزاعی۔

امام بخاری ہی کو دیکھیے وہ اجتہاد کے درجہ پر فائز تھے اور ان کی متعدد فقہی آراء بکثرت فقہا کے خلاف ہیں۔ علی حسن عبدالقادر "تدوین حدیث میں موطا کا مقام" کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"امام مالک اگرچہ حقیقی محدث نہ تھے تاہم ان کے ذریعے محدثین کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ان کے پیش نظر زیادہ تر احادیث کا عملی پہلو ہوتا تھا۔ آپ دیکھتے تھے کہ مدینہ میں کون سی روایات زیادہ مقبول ہیں۔ امام مالک حدیث نبوی میں شک و ریب میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ جس نے پچھلے محدثین کی زندگی کو اجیرن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسناد کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک تہائی موطا بلا سند مرسل و منقطع روایات پر مشتمل ہے۔ امام مالک مراسیل روایت کرتے اور سہولت کے ساتھ ان سے فقہی نتائج نکالتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ بصمیم قلب سنت کی حمایت کرنا اور اس پر عمل کرنا چاہتے اور ان کو اس کے ظاہری نقد و جرح کی فکر چنداں دامنگیر نہیں ہوئی۔ مندرجہ ذیل تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

موطّا میں کل روایات	۱۷۲۰
مرفوع احادیث	۶۰۰
مرسل روایات	۲۲۲
موقوف روایات	۶۱۳
مقطوع روایات	۲۸۵

جب کہ محدثین ایک حدیث کو مختلف طرق و اسانید سے روایت کرتے ہیں امام مالک ایک ہی سند پر اکتفا کرتے ہیں۔ محدث اور غیر محدث میں فرق و امتیاز تو اسی سے واضح ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ امام مالک کے ہاں ہمیں ایسی احادیث ملتی ہیں۔ جو دوسرے محدثین کے یہاں موجود ہی نہیں۔" (نظرۃ عامۃ از علی حسن عبدالقادر ص ۲۵۰)

ہم علی حسن عبدالقادر سے کہیں گے کہ جب مالک خود محدث نہیں تو وہ محدثین کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟ جس کے پاس کوئی چیز موجود نہیں وہ دوسرے کو کیسے وہ چیز دے سکتا ہے؟ اور پھر امام مالک نقادانہ تاریخی بحث کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں۔ جب کہ وہ اسناد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور نہ ہی احادیث کے طرق و اسانید کو یکجا کرتے ہیں حالانکہ اسی بات سے محدث و غیر محدث کا فرق واضح ہوتا ہے۔ یہ کھلا ہوا تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟۔

علی حسن عبدالقادر کہتے ہیں کہ امام مالک اسناد کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ اس لیے کہ اسناد کو ان دنوں ضروری خیال نہیں کیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ امام مالک اسانید کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور نہ ہی ان کے بارے میں بحث و تمحیص سے کام لیتے ہیں۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ امالک نے موطا میں بکثرت مرسل موقوف اور مقطوع روایات مندرج کی ہیں۔ اگر وہ اسناد کو اہمیت دیتے ہوتے تو ایسی روایات کو موطا میں جگہ نہ دیتے۔

ہم کہتے ہیں کہ علی حسن عبد القادر کا مذکورہ صدر قول تاریخ پر عظیم بہتان ہے۔ کون کہتا ہے کہ امام مالک کے عصر و عہد میں اسناد کو چنداں وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا؟ حالانکہ علماء خوارج و شیعہ کے آغاز ظہور ہی سے اسانید اور احادیث صحیحہ و سقیمہ کے بارے میں بحث کرنے لگے تھے۔ پھر جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا حدیث نبوی میں دروغ گوئی سے کام لینے والوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا خصوصاً امام مالک کے زمانہ میں تو ایسے لوگ بڑے کثیر التعداد تھے۔ امام مالک کو اسناد کے بارے میں سہل انگاری سے کیسے متہم کیا جا سکتا ہے، جب کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

"بسا اوقات ایک شیخ ہمارے پاس بیٹھ کر دن بھر حدیثیں بیان کرتا رہتا تھا مگر ہم اس سے ایک حدیث بھی اخذ نہ کرتے۔ ہم اس پر دروغ گوئی کی تہمت عاید نہیں کرتے تھے۔ صرف بات یہ تھی کہ وہ محدث نہیں ہوتا تھا۔"

امام مالک ہی کا قول ہے۔

"اہل مدینہ کی ایک جماعت سے میری ملاقات ہوئی مگر میں نے ان سے مطلقاً علمی استفادہ نہیں کیا۔ حالانکہ لوگ ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے تھے۔ یہ لوگ کئی قسم کے تھے۔ ان میں سے ایک قسم کے لوگ تو وہ تھے جو لوگوں کے ساتھ بات چیت میں دروغ گوئی کے عادی تھے۔ مگر علمی باتوں میں جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ تاہم میں نے ان کے جھوٹ کی بنا پر ان سے استفادہ نہیں کیا۔ دوسری قسم کے لوگ جاہل تھے اور میری نگاہ میں اس بات کے مستحق نہ تھے کہ ان سے حدیثیں اخذ کی جائیں۔ تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جن کے بارے میں عوام الناس اچھی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔"

یحییٰ بن سعید القطان جیسا محدث امام مالک کے بارے میں کہتا ہے۔

"امام مالک امام فی الحدیث تھے۔"

ابو قدامہ فرماتے ہیں۔

"امام مالک اپنے زمانہ کے سب سے بڑے حافظِ حدیث تھے۔" (الانتقاء لابن عبدالبر)

جہاں تک مرسل موقوف اور مقطوع روایات کا تعلق ہے امام مالک ان سے احتجاج کرتے تھے۔ اور قبل ازیں ہم ان پر روشنی ڈال چکے۔ اس ضمن میں امام مالک کے معاصر سفیان بن عُیَیْنَہ کا قول ہی کافی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"امام مالک وہی حدیث روایت کرتے تھے جو صحیح ہو اور صرف ثقہ راویوں سے منقول ہو۔"

مندرجہ صدر بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب مالک حدیث و فقہ دونوں میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔

اس عصر میں وضع حدیث کا آغاز

حدیث نبوی کے حفظ وضبط اور جمع وتالیف کی مساعی جمیلہ کے باوصف اس دور میں ان لوگوں نے شر وفساد کے جراثیم وعوامل پھیلانا شروع کر دیئے تھے جو حدیثیں وضع کرتے اور لوگوں میں قصّے کہانیاں اور جھوٹی باتوں کی اشاعت کرتے تھے۔ اس دور میں بکثرت ایسے گروہ وجود پذیر ہو گئے تھے جو حدیثوں کو بگاڑتے اور ان میں اختلاط وآمیزش کا مذموم کاروبار انجام دیتے تھے۔ ان تمام گروہوں میں سے مشہور ترین گروہ یہ تھے۔

(۱) سیاسی داعی (۲) وعظ گو (۳) زنادقہ۔

اب ہم ان تینوں گروہوں کا مختصر حال بیان کرتے ہیں تاکہ پتہ چلے کہ ان سے حدیث نبوی کو کس قدر خطرہ لاحق تھا۔ نیز یہ کہ محدثین کی ذمہ داریاں اس دور میں کس حد تک بڑھ گئی تھیں اور ان کو کس قدر کٹھن مرحلہ درپیش تھا۔

۱۔ سیاسی داعی: دولتِ عباسیہ کی اساس اموی خلافت کے اختتام پر رکھی گئی تھی۔ اس لیے یہ سیاسی انقلاب کا دور تھا۔ جس میں خلافت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہو رہی تھی۔ بدیہی بات ہے کہ یہ انتقال فوری نہ تھا۔ بخلاف ازیں کافی عرصہ سے خفیہ دعوت کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ دعوت کبھی ظاہری ہوتی اور گاہے پردہ اخفا میں چلی جاتی۔ ایک اموی شاعر کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی قوم کو اس کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ؎

۱۔ اریٰ خلل الرماد ومیض نارٍ	ویُوشک ان یکون لہٗ ضرامٗ
۲۔ لئن لم یطفھا عقلاءُ قوم	یکون وقودھا جثث وھامٗ

ترجمہ:- ۱- میں راکھ کے درمیان آگ کی چمک دیکھ رہا ہوں اور یقین ممکن ہے کہ وہ بھڑک اٹھے۔

۲- اگر قوم کے دانشمندوں نے اس کو بجھانے کی کوشش نہ کی تو جسم اور سر اس کا ایندھن بن جائیں گے۔

خفیہ دعوت کا آغاز دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہوا۔ اس مقصد کے لیے بارہ آدمیوں کو نقیب مقرر کیا گیا۔ علاوہ ازیں ستر آدمی اور مقرر کیے گئے جو ان کے مشورہ پر چلتے اور چھپ چھپا کر لوگوں میں عباسی دعوت کو پھیلاتے۔ کبھی یہ لوگ سوداگری کے بھیس میں رونما ہوتے اور گاہے حاجیوں کی شکل میں لوگوں سے ملتے۔ یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔ اس ضمن میں ابومسلم خراسانی نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۲۷ھ میں ابومسلم خراسانی نے بلاد خراسان میں انقلابی تحریک کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے دیکھا کہ لوگ بنو عباس کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اس نے پورے خراسان میں داعیوں سے خوب کام لیا۔ (تاریخ الامم الاسلامیہ للخضری ص ۲۰)۔

ان داعیوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے جو حربے استعمال کیے۔ ان میں سے ایک حیلہ یہ بھی تھا کہ وہ مقصد براری کے لیے احادیث نبویہ سے کام لینے لگے۔ چنانچہ انہوں نے حسب منشا حدیثیں وضع کر کے ان میں شامل کر دیں۔ ان وضع کردہ احادیث میں ایک طرف بنو امیہ سے نفرت دلائی گئی تھی اور دوسری جانب بنو عباس کی خلافت کی بشارت دی گئی تھی۔ تاکہ لوگ بنو عباس کو چاہنے لگیں۔ چند خود ساختہ احادیث ملاحظہ فرمائیں مثلاً

۱- بنو امیہ سے نفرت دلانے پر مشتمل احادیث:

جب حضرت حسنؓ بن علیؓ نے امیر معاویہ کی بیعت کر لی تو ایک شخص نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ "آپ نے اہل ایمان کو (معاویہؓ کی بیعت کر کے) رسوا کر دیا"۔ حضرت حسنؓ نے فرمایا "مجھے معتوب نہ کیجیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے خواب میں بنو امیہ کو جب اپنے ممبر پر دیکھا تو آپ کو یہ بات پسند نہ آئی تب سورۃ الکوثر اور القدر نازل ہوئی۔ سورہ القدر میں فرمایا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ۔ (شب قدر ہزار رات سے بہتر ہے)، اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ بنو امیہ کی حکومت ہزار ماہ یعنی تراسی سال چار ماہ کے لگ بھگ ہوگی۔ حضورؐ نے بنو حکم بن ابی العاص کو خواب میں دیکھا کہ وہ آپ کے منبر پر بندروں کی طرح اچھل رہے ہیں۔ یہ منظر آپ پر بڑا ناگوار گزرا۔ چنانچہ آپ اس کے بعد کھل کر کبھی نہ ہنسے۔ یہاں تک کہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ "وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْٓ اَرَیْنَاکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَۃَ الْمَلْعُوْنَۃَ فِی الْقُرْاٰنِ" یعلیٰ بن مرہ روایت کرتے ہیں کہ اس آیت میں "الشجرۃ الملعونۃ" سے بنو امیہ کا خاندان مراد ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے مروان بن حکم سے کہا تھا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ تمہارے باپ اور دادا سے فرما رہے تھے۔ "الشجرۃ الملعونۃ" سے تم (بنو امیہ) مراد ہو۔ اس ضمن میں ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ "میں نے بنو امیہ کو زمین کے منبروں پر دیکھا ہے۔ وہ تمہارے بادشاہ قرار پائیں گے۔ اور تم ان کو بدترین حاکم پاؤ گے۔"

۲۔ عباسی خلافت کی بشارت سے متعلق احادیث:

چند احادیث موضوعہ ملاحظہ فرمایئے۔

عبدالعزیز بن بکار روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بنو امیہ نے جتنے روز حکومت کی ہوگی بنو عباس اس سے دوگنا عرصہ خلافت پر فائز رہیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو آتے دیکھا تو فرمایا "یہ میرے چچا چالیس خلفا کے باپ ہیں۔ یہ قریش میں سب

سے زیادہ سخی اور حسین وجمیل ہیں۔ ان کی اولاد میں سے خلیفہ سفاح منصور اور مہدی ہوں گے اے میرے چچا! میرے ساتھ اللہ نے اس امر کا آغاز کیا تھا اور اس کا خاتمہ تیری اولاد میں سے ایک شخص کے ہاتھوں انجام پائے گا۔"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب تیرے بیٹے سیاہ مکانوں میں رہیں۔ سیاہ لباس پہنیں اور اہل خراسان ان کے مددگار ہوں تو اقتدار ہمیشہ ان ہی میں رہے گا۔ حتیٰ کہ وہ اسے عیسیٰ علیہ السلام کے سپرد کر دیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ ہی سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میں نے بنوامیہ کو باری باری اپنے منبر پر چڑھتے دیکھا تو مجھے سخت ناگوار گزرا۔ پھر بنو عباس کو باری باری منبر پر چڑھتے دیکھا تو یہ دیکھ کر خوش ہوا۔"

اس قسم کی وہ احادیث ہیں جو بنو عباس کے داعیوں نے حضرت علیؓ اور ان کی اولاد سے یا دوسرے لوگوں سے نقل کی ہیں۔ ان کا مقصد دراصل شیعہ کو حضرت علیؓ کی اولاد کے لیے خلافت طلب کرنے سے روکنا اور بنوعباس کی خلافت کو مستحکم کرنا تھا۔ چند احادیث موضوعہ پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت علیؓ بن ابی طالب مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "جبریلؑ میرے پاس آئے اور انہوں نے سیاہ کوٹ اور سیاہ عمامہ پہن رکھا تھا۔ میں نے کہا کیا بات ہے آپ اس سے پہلے اس صورت میں کبھی نہیں آئے تھے ؟ کہنے لگے "اولاد عباس کے سلاطین اسی لباس میں ملبوس ہوں گے۔" میں نے جبریلؑ سے پوچھا کیا وہ حق پر ہوں گے ؟ کہنے لگے جی ہاں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے اللہ! عباس اور اس کی اولاد پر رحمت فرما وہ جہاں بھی ہوں۔" جبرئیل نے کہا آپ کی اُمت پر ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب سیاہ رنگ کی وجہ سے اللہ اسے عزت دے گا۔ میں نے کہا۔ "اس وقت برسر اقتدار کون لوگ ہوں گے" ؟ جبریل کہنے لگے "اولاد عباس"۔ میں نے

پوچھا ان کے پیرو کون لوگ ہوں گے؟ جبریل نے کہا "اہل خراسان"۔ میں نے کہا بنو عباس کس چیز کے مالک ہوں گے؟ جبریل نے کہا "وہ سیاہ و سفید، تاج و تخت، منبر، دنیا اور محشر ہر چیز کے مالک ہوں گے۔"

انہی موضوعات کے زمرہ میں یہ حدیث بھی شامل ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو مخاطب کرکے فرمایا، حضرت علیؓ بھی اس وقت موجود تھے، کہ آپ کی اولاد بادشاہ ہوگی۔ پھر حضرت علیؓ کی جانب متوجہ ہوئے اور کہا "آپ کی اولاد میں سے کوئی بھی خلیفہ نہ ہوگا۔"

اسی قسم کی ایک اور موضوع حدیث یہ بھی ہے کہ حضرت امّ سلمہؓ بیان کرتی ہیں میں آنحضور کی خدمت میں حاضر تھی۔ خلافت کا ذکر چل نکلا۔ حاضرین نے کہا "حضرت فاطمہؓ کی اولاد اس منصب پر فائز ہوگی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" وہ ہرگز برسر اقتدار نہیں ہوگی۔ البتہ میرے چچا کی اولاد خلیفہ بنے گی حتٰی کہ وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تشریف آوری پر یہ اقتدار ان کے حوالے کر دیں گے۔

۲۔ بنو عباس سے نفرت دلانے والی احادیث موضوعہ:

جب عباسی خلافت انعقاد پذیر ہو گئی یا ہونے والی تھی تو ہم دیکھتے ہیں کہ شیعہ اور دیگر داعیان بنی امیہ نے بنو عباس سے نفرت دلانے اور ان کی اطاعت نہ کرنے کے سلسلہ میں حدیثیں وضع کرنے کا دھندا شروع کر دیا۔ چند وضع کردہ احادیث حسب ذیل ہیں۔

سعید بن المسیّب بیان کرتے ہیں کہ جب خراسان کا کچھ علاقہ فتح ہو گیا تو حضرت عمرؓ روتے لگے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا، روتے کی کیا وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عظیم فتح عطا کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا، میرے نہ رونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ بخدا میں تو چاہتا تھا کہ ہمارے اور اہل خراسان کے درمیان آگ کا ایک سمندر حائل ہوتا۔

میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے "جب اولادِ عباس کے جھنڈے خراسان سے نکلتے ہوئے دکھائی دیں گے تو وہ اسلام کو مٹا دیں گے جو شخص ان کے جھنڈے تلے ہو گا اسے میری شفاعت حاصل نہیں ہو گی"۔

حضرت ثوبانؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "بنو عباس کی وجہ سے میری اُمت بڑی تکلیف میں مبتلا ہو گی۔ وہ کپڑوں کو سیاہ رنگ کر پہنیں گے خدا انہیں آگ کے کپڑے پہنائے گا۔ آپ نے حضرت اُمّ حبیبہؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بنو عباس کی تباہی اس کے خاندان والوں میں سے ایک کے ہاتھوں انجام پائے گی"۔

ابو شراعہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے گھر میں بیٹھے تھے۔ وہ دریافت کرنے لگے، یہاں کوئی اجنبی تو نہیں؟ حاضرین نے کہا "نہیں"۔ پھر فرمایا جب سیاہ جھنڈے نمودار ہو جائیں تو اہل فارس کے ساتھ نیک سلوک کیجیے۔ اس لیے کہ ہماری (بنو عباس کی) حکومت ان کی مدد سے تشکیل پائے گی۔ ابو ہریرہؓ نے کہا، کیا میں آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ کی حدیث نہ سناؤں؟ ابن عباسؓ نے حیرت سے پوچھا کیا آپ یہاں ہیں؟ تو اب وہ حدیث سنائیے ابو ہریرہ نے کہا "میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا "جب سیاہ جھنڈے مشرق سے نمودار ہو جائیں تو وہ ابتدا میں فتنہ کے موجب ہوں گے۔ درمیان میں تکلیف کا باعث ہوں گے اور آخر میں گمراہی کے موجب"۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۹ تفسیر ابن کثیر و روح المعانی نیز اللآلیٔ المصنوعہ سیوطی ج ۱)۔

مذکورہ صدر احادیث اباطیل کا پلندہ ہیں اور ہرگز قابل اعتماد نہیں۔ ان سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ بنو عباس کے داعی ہوں یا ان کے خصوم و اعداء شیعہ، یہ لوگ دین و اخلاق سے بالکل عاری تھے اور ذاتی اغراض کی تکمیل کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ بافی کرنے کو مباح خیال کرتے تھے۔

دوم۔ <u>زنادقہ</u>: یہ لوگ بباطن دشمن دین تھے اور بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھے رہتے

تھے۔ انہوں نے دین اسلام میں ایسے افکار و آراء اختیار کر رکھے تھے، جن کا دین اسلام کے بنیادی اور مسلّمہ اصول و عقائد کے ساتھ کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ ان کا مقصد دراصل یہ تھا کہ عوام الناس کو رفتہ رفتہ دین سے بدظن کر کے مسلمانوں کے رعب داب کو کم کیا جائے۔ اس عصر و عہد میں زنادقہ میں بکثرت لوگ تھے جو عام لوگوں کو اپنے افکار باطلہ کی طرف مائل کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ ان واضعین نے بے شمار احادیث کو وضع کر کے جھوٹ موٹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلفائے بنی عباس نے زنادقہ کا تعاقب کر کے ان کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ یا تو اس لیے کہ زنادقہ بنی عباس کی مذمت میں اور لوگوں کو ان سے نفرت دلانے کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ ان کا مطلب مسلمانوں کی سلطنت کو کمزور کرنا تھا خلفاء کے زنادقہ کو قتل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ دین اسلام کے علمبردار تھے اور وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ دین میں وضع حدیث کا دروازہ کھولا جائے۔

ہمیں اس بات سے بحث نہیں کہ زنادقہ کو قتل کرنے کی پہلی وجہ تھی یا دوسری وجہ اور یا دونوں۔ جو چیز ہماری نگاہ میں اہمیت کی حامل ہے، وہ یہ ہے کہ زنادقہ نے بکثرت حدیثیں وضع کیں۔ ان احادیث کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا تو درکنار، یہ اصول دین اور عقل سلیم سے بھی متصادم تھیں۔ اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا زنادقہ کا مقصد دین اسلام کو ملیامیٹ کرنا اور دین کے سرچشموں میں سے اس کے دوسرے مصدر و ماخذ یعنی حدیث نبوی کو ناقابل اعتماد ٹھہرانا تھا جس پر اسلامی احکام اور قرآن کے فہم و ادراک کا مدار و انحصار ہے۔

ابن عساکر روایت کرتے ہیں کہ ابن عُلیّہ نے کہا خلیفہ ہارون الرشید نے ایک زندیق کو پکڑ کر اسے قتل کرنے کا حکم دیا۔ زندیق نے دریافت کیا آپ مجھے کیوں قتل کر رہے ہیں؟ ہارون نے کہا میں مخلوق خدا کو تم سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ زندیق نے کہا

" ان ایک ہزار احادیث کا کیا بنے گا، جن کو میں نے وضع کرکے نبی کریمؐ کی جانب منسوب کر دیا ہے اور ان میں ایک حرف بھی حضورؐ کا فرمودہ نہیں؟ ہارون نے کہا فکر نہ کیجیے، ابو اسحاق فزاری اور عبداللہ بن مبارک ان کو چھانٹ لیں گے اور ایک ایک حرف الگ نکال لیں گے۔" (تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۹۲)

مذکورہ صدر واقعہ سے جہاں یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ زنادقہ نے حدیث نبوی سے کیا سلوک کیا تھا۔ دوسری جانب یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ محدثین نے احادیث کی چھان پھٹک اور نقد و جرح کے سلسلہ میں کس قدر مساعی جمیلہ انجام دیں تھیں۔ اس زندیق نے ایک ہزار احادیث وضع کی تھیں اور اگر وہ لمبی عمر پاتا تو احادیث گھڑ لیتا۔ اب اندازہ لگایئے کہ ان کثیر زنادقہ نے کس قدر احادیث وضع کی ہوں گی جو پوشیدہ طور پر حدیثیں گھڑنے کا دھندا انجام دیتے تھے۔

زنادقہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے اساتذہ کو حدیثیں لکھ کر دیا کرتے تھے۔ جونہی استاد ذرا غافل ہوتا تو وہ استاد کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس میں احادیث موضوعہ شامل کر دیتا تھا۔ شیخ ان کو مرویات سمجھ کر روایت کرتا رہتا تھا۔ خلیفہ مہدی عباسی کا قول ہے کہ ایک زندیق نے میرے پاس اعتراف کیا کہ میں نے چار سو احادیث وضع کی ہیں اور وہ لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اس قسم کے دیگر واقعات جن سے کتب موضوعات بھری پڑی ہیں۔

سوم قصہ گو: بے دین اور حدیث نبوی سے بے بہرہ لوگوں کی ایک جماعت نے پیشے بٹورنے کے لیے قصہ گوئی کا فن اختیار کر لیا تھا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔ محدثین کو ایسے لوگوں کی وجہ سے بڑی تکالیف کا سامنا ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ہر نئی اور انوکھی بات کو بہت پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً قصہ کہانیوں کو۔ چنانچہ عوام الناس ان افسانہ طراز لوگوں کی طرف مائل ہو گئے۔ افسانہ گو لوگ قصے کہانیاں گھڑ کر ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب

منسوب کر دیا کرتے تھے۔ حالانکہ حضور کا دامن ان جھوٹی کہانیوں سے پاک تھا۔ ذیل میں ہم چند واقعات ذکر کرتے ہیں۔ جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ احادیث نبویہ کو کس طرح بگاڑتے تھے۔ نیز یہ کہ عوام الناس ان پر کس حد تک فریفتہ تھے اور ان کو جید علماء کے مقابلہ میں ترجیح دیا کرتے تھے۔

۱۔ محدث ابن الجوزی اپنی کتاب "القصاص والمذکرین" میں ابوالولید الطیالسی سے نقل کرتے ہیں کہ میں شعبہ کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان ان کے پاس آیا اور ایک حدیث کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ شعبہ نے کہا "کیا آپ قصہ گو ہیں؟" اس نے کہا "جی ہاں" شعبہ نے کہا کہ "تو جائیے ہم قصہ گو لوگوں کو حدیثیں نہیں سنایا کرتے۔" میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "یہ لوگ ہم سے بالشت بھر حدیث لیتے ہیں اور اس کو ایک گز بنا دیتے ہیں۔"

یہ شعبہ کی شہادت ہے جو اس عصر و عہد میں محدثین کے سرخیل تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ ور قصہ گو احادیث نبویہ کو کس قدر بگاڑتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دور کے علماء ایسے لوگوں کی حرکتوں سے کس حد تک باخبر تھے۔

۲۔ ابن الجوزی اپنی سند کے ساتھ حجر بن عبدالجبار حضرمی سے نقل کرتے ہیں کہ کوفہ کی مسجد میں ایک قصہ گو شخص رہتا تھا۔ جس کو زرعہ کہتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کی والدہ ایک فتویٰ دریافت کرنا چاہتی تھیں، جو امام ابوحنیفہؒ نے بتا دیا۔ مگر والدہ نے اصرار کیا کہ میں زرعہ سے ہی پوچھوں گی۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ ان کو زرعہ کے پاس لے گئے۔ اور کہا یہ میری والدہ ہیں اور آپ سے فلاں مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہیں۔ زرعہ کہنے لگا "آپ مجھ سے بڑھ کر عالم اور فقیہہ ہیں، ان کو مسئلہ بتا دیجیے۔" امام صاحب نے فرمایا میں نے یہ مسئلہ ان کو بتا دیا ہے۔ یہ سُن کر زرعہ نے کہا "ابوحنیفہ ٹھیک کہتے ہیں۔" تب ان کی والدہ خوش ہو کر چلی گئیں۔ (تحذیر الخواص ص ۸۰)

اس واقعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ قصہ گو قسم کے لوگ عوام الناس کے قلب و ذہن پر اس حد تک چھائے ہوئے تھے کہ امام ابو حنیفہ کی والدہ ان کے فتویٰ پر قانع نہ تھیں اور زُرعہ افسانہ گو سے پوچھنے پر مُصر تھیں۔ حالانکہ جناب امام فقہ و علم اور فہم و ذکا میں ضرب المثل کی حد تک مشہور ہیں۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ صرف مندرجہ صدر تینوں فرقے ہی حدیثیں گھڑنے کا دھندا نہیں کرتے تھے۔ بخلاف ازیں ان کے علاوہ مجسّمہ و مُرجیہ اور دیگر بکثرت فرقے اپنے اپنے افکار و عقائد کی ترویج و اشاعت کے لیے حدیث سازی کا کام انجام دیتے تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ بہت سے صُوفی نما جاہل ترغیب و ترہیب سے متعلق حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ وہ اس زعم باطل میں مبتلا تھے کہ اس میں ہمارا اور عوام الناس کا بھلا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جن کو خدا نے گمراہ کر دیا تھا۔ یہ سب لوگ احادیث و اسانید وضع کرنے کے ناپاک کاروبار میں متحد الخیال تھے۔ مگر خداوند کریم نہیں چاہتا تھا کہ اس کے نبی کی احادیث کو بازیچہ اطفلاں بنا کر رکھ دیا جائے اور دروغ پیشہ لوگ حسب مرضی اس میں اضافہ کرتے چلے جائیں یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر عصر و عہد میں ایسے جلیل القدر محدثین کو پیدا کر دیا تھا جو حدیث رسول کے دفاع کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ کیا خوب فرمایا خداوند کریم نے کہ

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ۔

جھاگ دُور ہو جاتی ہے اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی چیز زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

وضّاعین سے علماء کا مقابلہ: خداوند کریم نے اس دَور میں احادیث نبویہ کا دفاع کرنے کے لیے کبار حفّاظ و نقّاد پر مشتمل جید علما کی ایک جماعت پیدا کر دی۔ ان علما نے حق و باطل کو ممیّز و ممتاز کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور رسول کریم پر دروغ بافی کرنے والوں کے جھوٹ کی قلعی

کھول کر تقرب خداوندی حاصل کیا۔ ان علمائے رواۃِ حدیث کا مرتبہ و مقام متعین کیا۔ اور مدح و ذم جس کے مستحق تھے، اسی سے ان کو ملقب کیا، چنانچہ خدا کے دین میں انہوں نے کسی کی رُو رعایت ملحوظ نہ رکھی۔ وہ صاف کہتے کہ فلاں ثقہ راوی ہے۔ فلاں حجت ہے۔ فلاں کذّاب اور فلاں لین الحدیث ہے۔ فلاں ضعیف ہے اور فلاں کی روایت قبول کرنے میں حرج نہیں اور اس قسم کے دیگر القاب جو رواۃِ حدیث کی عظمت و ثقاہت یا ان کے ضعف و سقوط کی علامت ہیں۔

اس دَور میں ــــ جس کو مورخین کی زبان میں عصرِ تدوین کہتے ہیں ــــ علمائے حدیث نے حدیثِ نبوی کی تالیف و تدوین میں حدّ درجہ عرق ریزی و جانفشانی سے کام لیا۔ محدثین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے حدیث کی کوئی کتاب مرتب نہ کی ہو یا جس نے احادیث کی تحصیل میں بلادِ اسلامیہ کے دُور دراز کے سفر نہ کئے ہوں۔ یہ انہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ ان کے پاس احادیث کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اور ان کے متعدد طرق و اسانید ان کے علم میں آگئے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ بعض اسانید کا اتّصال یا انقطاع جو قبل ازیں ان کی نگاہ سے اوجھل تھا، کھل کر سامنے آگیا۔ متونِ احادیث پر غائرانہ نگاہ ڈالنے اور گہری تحقیق و تدقیق کی بنا پر ان پر یہ حقیقت کھل گئی کہ اصلی احادیث کون سی ہیں اور مصنوعی کون سی۔

بنا بریں احادیث کی جمع و تالیف اور وضاعین کے مقابلہ کے لیے یہ تحریک بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ اعدائے اسلام اور واضعین حدیث کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کو بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ حدیث کے مشہور امام ابوداؤد سجستانی اپنے مکتوب بنام اہل مکہ میں لکھتے ہیں۔

"سفیان اور وکیع جیسے عظیم ناقدینِ حدیث بڑی محنت و کاوش کے بعد ایک ہزار احادیث کے ذخیرہ میں سے صرف ایک حدیث مرفوع متصل نکال سکتے تھے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۸)

جب ایک ہزار ضعیف اور موضوع احادیث کے ذخیرہ میں سے صرف ایک ایسی حدیث مل سکتی تھی جو شرائطِ صحت کی جامع ہو تو اس سے ظاہر ہے کہ ائمہ حدیث کو احادیث صحیحہ کی طلب و تلاش میں کس قدر محنت و کاوش کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حق بات یہ ہے کہ محدثین نے حدیثِ نبوی، اس کے رُواۃ و رجال اور متون و اسانید کی خدمت کر کے بہت بڑا علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔ شیوخ و اساتذہ سے احادیث اخذ کرتے وقت بھی وہ حد درجہ حزم و احتیاط سے کام لیا کرتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی حدیث کے صحت کے لیے محدثین کے نزدیک صرف یہی بات کافی نہیں کہ اس کا راوی دیندار امین اور حافظ ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا ضابط اور متنِ حدیث سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ کسی حدیث کا راوی اس میں سہل انگاری کا عادی نہ ہو۔

امام مالک فرماتے ہیں۔

حدیث نبوی کی نقل و روایت چار آدمیوں سے جائز نہیں اور ان کے سوا دوسروں سے درست ہے۔

۱۔ احمق آدمی سے حدیث روایت نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔ اس بدعتی آدمی سے روایت جائز نہیں جو لوگوں کو بدعت کی دعوت دیتا ہو۔

۳۔ لوگوں کے ساتھ جھوٹ بولنے والے سے روایت کرنا جائز نہیں۔ اگرچہ وہ روایت حدیث میں جھوٹا مشہور بھی نہ ہو۔

۴۔ ایسے آدمی سے روایت جائز نہیں جو اگرچہ نیک اور عبادت گزار ہو۔ لیکن فنِ حدیث سے بیگانہ ہو۔ (الانتقاء ابن عبدالبر ص ۱۵)۔

امام مالک سے دریافت کیا گیا کہ آیا ایسے شخص سے روایتِ حدیث کی جا سکتی ہے جو نہ تو تحصیل علم کے لیے باہر گیا ہو اور نہ ہی اسے علما کی ہم نشینی کی سعادت حاصل ہوئی ہو؟ فرمایا "نہیں"۔ پھر دریافت کیا گیا، کیا اس شخص سے حدیث روایت کر سکتے ہیں،

جو یوں تو ثقہ راوی ہو مگر حافظ نہ ہو نہ ہی متنِ حدیث کا فہم و ادراک رکھتا ہو؟ فرمایا علم اس شخص سے اخذ کیا جائے جو حافظ ہو۔ طلب علم کے لیے سفر کر چکا ہو علماء کی ہمنشینی کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو۔ حدیث کے معنی و مفہوم سے آگاہ ہو۔ اس پر عمل بھی کر چکا ہو اور متقی ہو۔"

امام مالک فرماتے ہیں۔

"میں ستر ایسے آدمیوں سے مل چکا ہوں جو کہتے تھے کہ نبی اکرم نے اس ستون کے پاس بیٹھ کر یوں ارشاد فرمایا۔ تاہم میں نے ان سے بالکل استفادہ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ایسے آدمی تھے کہ اگر ان کو کوئی بیت المال سپرد کیا جاتا۔ تو وہ امین ثابت ہوتے۔ مگر وہ محدث نہ تھے۔ اور جب ابن شہاب زہری ہمارے یہاں آئے تو ہم ان کے دروازہ پر جمع ہو جایا کرتے تھے۔"

عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں۔

"میں نے سفیان ثوری سے کہا کہ عباد بن کثیر یوں تو بڑا عابد ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ مگر وہ عجب حدیثیں بیان کرتا ہے۔ کیا آپ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ میں لوگوں سے کہہ دوں کہ اس سے حدیثیں روایت نہ کریں؟ سفیان نے کہا "ضرور کہہ دیجیے"۔ عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں جب میں کسی مجلس میں بیٹھتا اور وہاں عباد کا ذکر شروع ہو جاتا۔ تو میں اس کے دیندار ہونے کی تعریف کرتا۔ مگر ساتھ ہی یہ کہتا کہ اس سے حدیثیں روایت نہ کرو۔"

یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں۔

"دیندار لوگ حدیثوں کے روایت کرنے میں جس قدر جھوٹے ہوتے ہیں اور کسی بات میں اتنے جھوٹے نہیں ہوتے۔" (توجیہ النظر ص ۲۵)

سفیان ثوری کا قول ہے۔

"میں تین طرح احادیث لکھنے کا خواہاں ہوں۔

۱۔ وہ احادیث جن کو میں دین سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونا چاہتا ہوں۔

۲۔ بعض احادیث لکھ کر میں توقف اور سوچ بچار سے کام لیتا ہوں۔ نہ بالکل ہی نظر انداز کرتا ہوں اور نہ ان پر عمل کرتا ہوں۔

۳۔ میں ضعیف راویوں سے صرف اس لیے روایت کرتا ہوں کہ ان کی روایت کردہ احادیث کو پہچان سکوں۔ مگر میں ان روایات پر اعتماد نہیں کرتا۔

" احادیث صحیحہ و ضعیفہ دونوں ہی قسم کی احادیث کی روایت کرنا چاہیے۔ تاکہ جو احادیث ضعیف ہیں، ان کا علم ہو سکے۔ (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۶)

مندرجہ صدر بیانات اس امر کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ عصر زیر بحث کے ائمہ حدیث بڑے صاحب بصیرت نقّاد اور حدیث کے متون و اسانید میں مہارت تامّہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے احادیث نبویہ کی چھان پھٹک کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے بکثرت راویانِ حدیث کو روایتِ حدیث سے نااہل قرار دے کر حدیث و سنت کے دائرہ سے نکال دیا تھا۔ محدثین عصر نے احادیث کی درجہ بندی کی اور ان کو چند قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک قسم کی احادیث وہ تھیں جن کی صحت سے وہ آگاہ تھے اور ان پر عمل بھی کرتے تھے۔ دوسری قسم کی احادیث وہ تھیں، جن کے جھوٹے ہونے سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ اور ان کو نظر انداز کر چکے تھے۔ تیسری قسم کی احادیث وہ تھیں جن کے ضعف سے وہ باخبر تھے۔ اور ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ چوتھی قسم کی وہ احادیث تھیں جو مشتبہ تھیں۔ اور جن میں وہ توقف کر کے اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ ان کا معاملہ واضح ہو سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مذکورہ صدر تمام قسم کی احادیث جو بھی سنتے، جمع کر لیا کرتے تھے۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان احادیث کے مجموعہ سے احادیث صحیحہ منتخب کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوتا کہ محدثین صحیح معنی میں حدیث نبوی کے صراف اور اسانید و رجال کے نقّاد تھے۔

محدث ابن عدی اپنی کتاب "الکامل" میں اس دور کے محدثین کی مساعی جمیلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

" دوسری صدی ہجری کے اوائل میں اوساط تابعین کی ایک جماعت ضعیف راویوں پر مشتمل تھی۔ ان کے ضعیف راوی ہونے کی وجہ ان میں حفظ وضبط کا فقدان تھا۔ یہ راوی ارسال سے کام لیتے اور موقوف روایات کو مرفوعاً روایت کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی غلطیاں ان سے سرزد ہوتی تھیں۔ مثلاً ابوہارون عبدری متوفی ۱۴۳ھ

۱۵۰ھ میں جب تابعین کا دور ختم ہو گیا تو چند ائمہ حدیث نے جرح وتعدیل پر گفتگو کرنے کی طرح ڈالی۔ چنانچہ اعمش متوفی ۱۴۸ھ نے بعض راویوں کو ثقہ اور بعض کو ضعیف قرار دیا۔ اسی طرح مشہور محدث شعبہ متوفی ۱۶۰ھ نے بھی رجال پر نقد وجرح کی۔ شعبہ بڑے ثقہ راوی تھے اور کسی ضعیف راوی سے روایت نہیں کیا کرتے تھے۔ امام مالک متوفی ۱۷۹ھ اور ان کے دیگر معاصرین کا بھی یہی حال تھا۔ جب یہ ائمہ کسی راوی کے بارے میں نقد وتبصرہ کرتے ہیں تو اسے قبول کیا جاتا ہے۔ مثلاً امام مالک کے مندرجہ ذیل ہم عصر علماء۔

اسماء	سال وفات	اسماء	سال وفات
ہشام دستوائی	۱۵۴ ہجری	اوزاعی	۱۵۶ ہجری
معمر	۱۵۳ "	سفیان ثوری	۱۶۱ "
ابن الماجشون	۲۱۳ "	حماد بن سلمہ	۱۶۷ "
لیث بن سعد	۱۷۵ "		

پھر مذکورین کے بعد یہ علماء ہیں۔

اسماء	سال وفات	اسماء	سال وفات
عبداللہ بن مبارک	۱۸۱ ہجری	ہشیم بن بشیر	۱۸۸ ہجری

ابو اسحاق الفزاری	۱۸۵ ہجری	المعافی بن عمران موصلی	۱۸۵ ہجری
بشر بن مفضل	۱۸۶ "	ابن عُیینہ	۱۹۷ "
ابن عُلَیّہ	۱۹۳ "	ابن وَہب	۱۹۷ "
وکیع بن الجراح	۱۹۷ "		

اس دور میں نقدِ رجال کے سلسلہ میں دو شخصوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یہ دونوں عظیم حافظِ حدیث تھے یعنی یحییٰ بن سعید القطان متوفی ۱۸۹ھ اور عبدالرحمٰن بن مہدی متوفی ۱۹۸ھ۔ لوگ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ چنانچہ جس راوی کو ان دونوں نے ثقہ قرار دیا وہ مقبول ہوا۔ اور جس کو ضعیف سمجھا وہ مجروح ٹھہرا۔ اور جس راوی کی عدالت اور ضعف کے بارے میں یہ مختلف الخیال تھے، اس کو لوگوں نے اپنی دانست کے مطابق جس بات کو راجح سمجھا اس پر عمل کیا۔

پھر ان کے بعد نقادِ حدیث کا ایک اور طبقہ وجود پذیر ہوا۔ جن کی طرف حدیث کی نقد و جرح کے بارے میں رجوع کیا جاتا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل علماء قابل ذکر ہیں۔

یزید بن ہارون متوفی ۲۰۶ھ

ابوداؤد الطیالسی ۲۰۴ھ

عبدالرزاق ابن ہمام ۲۱۱ھ

ابو عاصم الضحاک النبیل بن مخلد۔

دوسری صدی ہجری میں حجیتِ سنت میں نزاع

آپ دیکھ چکے ہیں کہ واضعین نے احادیث کو بگاڑنے کی کس طرح کوشش کی۔ اور محدثین نے ان کے مزعوماتِ باطلہ کی دھجیاں بکھیرنے میں کون سی مساعی جمیلہ انجام دی تھیں۔ اب ہم ان دشمنانِ حدیث کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو اس دور میں رونما ہو کر حدیث اور اہل الحدیث کے خلاف خم ٹھونک کر میدانِ حرب و قتال میں آگئے تھے۔ یہ لوگ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ ایک گروہ نے اجمالاً و تفصیلاً سنت نبوی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اور وہ اس کو اسلامی قانون سازی کے اصول میں سے ایک اصل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ قرآن کی موجودگی میں دوسری کسی چیز کی حاجت نہیں۔ وہ اس زعمِ باطل میں گرفتار تھے کہ حدیث کے راویوں سے چونکہ خطا و نسیان اور کذب کے صادر ہونے کا امکان ہے۔ اس لیے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ دوسرے گروہ کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ ہم صرف انہی احادیث کو تسلیم کرتے ہیں۔ جو قرآن کی تفسیر کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔

۳۔ تیسرے گروہ کا خیال یہ تھا کہ ہم احادیث متواترہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اخبار آحاد کے راوی خواہ ضبط و عدالت کے کسی درجے پر بھی فائز کیوں نہ ہوں۔ ہم ان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

یہ تھے عصر زیر بحث کے وہ فرقے جو سنت کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ حدیث کے لیے یہ فرقے اتنے ہی خطرناک تھے، جتنے حدیثیں وضع کرنے والے گروہ۔ کبار ائمہ اسلام ان باطل فرقوں کی تردید کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ ان کبار میں امام جلیل محمد بن ادریس شافعی

تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے فصاحت وبلاغت زورِ استدلال اور بلند پایہ علم وفضل سے نوازا تھے۔ آپ کی مشہور کتاب "الام" میں بروایت ربیع بن سلیمان مرادی ایک مناظرہ منقول ہے۔ جو امام شافعی اور ان فرقوں میں سے ایک فرقے کی جانب منسوب ایک شخص کے ساتھ پیش آیا۔ امام شافعی نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں بھی حدیث نبوی کا بہت عمدہ دفاع کیا ہے۔ ہم ذیل میں امام شافعی کے چند اقوال ذکر کرتے ہیں۔ جس سے یہ حقیقت واضح ہو گی کہ علما نے ان باطل فرقوں کا کیا خوب مقابلہ کیا تھا۔

امام شافعی اور منکرِ حدیث کا مناظرہ : ہم اس مناظرہ کو سوال وجواب کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

منکرِ حدیث :۔ امام شافعی کو مخاطب کرتے ہوئے۔

"آپ عربی ہیں اور قرآن آپ کی زبان میں اُترا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ محفوظ کتاب ہے۔ اس میں خداوندی فرائض بیان کئے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس کے کسی حرف میں بھی شک وشبہ کا اظہار کرے تو آپ اس سے توبہ کا مطالبہ کریں گے۔ اگر توبہ کرے تو فبہا ورنہ (مرتد سمجھ کر) اسے قتل کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا ہے۔

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ — اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔

جب یہ بات ہے تو تمہارا یہ قول کیسے درست ہے کہ فرض عام بھی ہوتا ہے اور خاص بھی۔ نیز یہ بھی کہ امر وجوب کے لیے بھی ہوتا ہے اور اباحت کے لیے بھی۔ دوسری طرف آپ ایک شخص سے ایک یا دو تین احادیث روایت کرتے ہیں۔ پھر وہ شخص دوسرے شخص سے یہاں تک کہ راویوں کا سلسلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ برملا کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص سے فلاں حدیث میں غلطی سرزد ہوئی۔

میں جانتا ہوں کہ اگر آپ ایک حدیث کی بنا پر کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرائیں۔ اور کوئی

شخص اس حدیث کے بارے میں یہ کہہ دے کہ نبی کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا بلکہ تم سے یا اس شخص سے غلطی سرزد ہوئی ہے جس سے آپ نے یہ حدیث سُنی تو تم اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کرو گے۔ تم اسے صرف یہ بات کہو گے کہ تم نے بہت بُری بات کہی۔ یہ بات کیوں کر درست ہے کہ احادیث کی بنا پر قرآن کے ظاہری احکام میں تفریق کی جائے؟ جب تم احادیث کو وہی اہمیّت دیتے ہو جو قرآن کو حاصل ہے تو اس حدیث کا انکار کرنے والے کے خلاف تم کون سی حجّت قائم کر سکو گے۔؟

امام شافعی:۔ جو شخص اس زبان سے واقف ہے جس میں قرآن نازل ہوا وہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ احادیث رسولؐ پر عمل کرنا ضروری ہے۔

منکر حدیث:۔ اس کی کوئی دلیل آپ کو یاد ہو تو پیش کیجیے۔

امام شافعی:۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (سورۃ الجمعہ)

وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیات سناتا اور ان کو پاک کرتا اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے

منکر حدیث:۔ کتاب سے تو کتاب الہٰی مراد ہے مگر حکمت کیا چیز ہے؟

امام شافعی:۔ حکمت سے حدیث رسول مراد ہے۔

منکر حدیث:۔ کیا اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ رسول کریمؐ اجمالاً بھی قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ اور حکمت یعنی اس میں مذکور احکام بھی بیان فرماتے تھے۔

امام شافعی:۔ غالباً آپ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو فرائض مذکور ہیں مثلاً نماز زکوٰۃ حج وغیرہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کیفیت اور تفصیل بیان فرمایا کرتے تھے۔

منکر حدیث :۔ جی ہاں میرا یہی مطلب ہے۔

امام شافعی :۔ تو میں بھی آپ سے یہی کہہ رہا ہوں کہ فرائض کی تفصیل حدیث رسولؐ سے معلوم ہوتی ہے۔

منکر حدیث :۔ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ کتاب اور حکمت دونوں سے ایک ہی چیز مراد ہو اور کلام کو تکرار و اعادہ پر محمول کیا جائے۔

امام شافعی :۔ آپ خود ہی بتائیے کہ دونوں سے ایک چیز مراد لینا بہتر ہے یا دو چیزیں؟

منکر حدیث :۔ ہو سکتا ہے کہ کتاب و حکمت سے دو چیزیں یعنی کتاب و سنت مراد لی جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز یعنی قرآن مراد ہو۔

امام شافعی :۔ ہر دو احتمالات میں سے جو واضح تر ہے وہی افضل ہے اور جو بات ہم نے کہی ہے قرآن میں اس کی دلیل موجود ہے۔

منکر حدیث :۔ وہ دلیل کہاں ہے؟

امام شافعی :۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا۔	اور تمہارے گھروں میں خدا کی آیات اور جس حکمت کی تلاوت کی جاتی ہے، اس کو یاد کرتی رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ نرمی کرنے والا اور آگاہ ہے۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ اُمہات المومنین کے گھروں میں دو چیزوں کی تلاوت کی جاتی ہے۔

منکر حدیث :۔ قرآن کی تلاوت تو کی جاتی ہے حکمت کی تلاوت کا کیا مطلب؟

امام شافعی :۔ تلاوت کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح قرآن کے ساتھ نطق کیا جاتا ہے، اسی طرح سنت کا اظہار بھی قوت گویائی ہی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

منکر حدیث :۔ بے شک اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمت قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

امام شافعی :۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو فرض ٹھہرایا ہے۔

منکر حدیث :۔ اس کی دلیل کیا ہے؟

امام شافعی :۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء)

اور تیرے رب کی قسم لوگ مومن نہیں ہوں گے یہاں تک کہ اپنے جھگڑوں میں آپ کو فیصل نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ آپ صادر کر دیں اس کے بارے میں اپنے جی میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اپنا سر تسلیم خم کر دیں۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ۔ (النساء)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

جو لوگ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ انہیں ڈرنا چاہئے کہ وہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں یا دردناک عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔

منکر حدیث :۔ یہ درست ہے کہ حکمت سے سنتِ رسول مراد ہے۔ اگر میرے ہم خیال لوگوں کی یہ بات صحیح ہوتی کہ ان آیات میں رسولؐ کے احکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور رسول کا حکم وہی ہے جو اللہ نے قرآن کریم میں نازل کیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ جو شخص رسول کے احکام کی اطاعت نہیں کرتا، اس کو احکام خداوندی کا تسلیم نہ کرنے والا قرار دینا چاہیے نہ کہ احکامِ رسول کا باغی۔

امام شافعی :۔ اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کے احکام کا اتباع ہم پر فرض قرار دیا ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

وَمَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ | رسول جو کچھ تم کو دے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو۔

منکرِ حدیث:۔ قرآن سے بوضاحت یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنا اور جس بات سے منع کریں اس سے باز رہنا ہم پر فرض ہے۔

امام شافعی:۔ جو بات ہم پر فرض ہے وہ ہم سے پہلوں اور پچھلوں سب پر فرض ہے۔

منکرِ حدیث:۔ جی ہاں۔

امام شافعی:۔ اگر رسول کریمؐ کے دیئے ہوئے احکام کی اطاعت ہم پر فرض ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ ہم پر کسی بات کو فرض ٹھہراتے ہیں تو آپ ایک ایسے امر کی جانب ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ جس کی اطاعت ہمارے لیے ضروری ہے۔

منکرِ حدیث:۔ جی ہاں۔

امام شافعی:۔ اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسول کا جو حکم دیا ہے کیا آپ یا آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کوئی شخص جس نے حضورؐ کو نہ دیکھا ہو، احادیث نبویہ کے بغیر اس کی تعمیل کر سکتا ہے؟ اور حدیث نبوی کو نظر انداز کر کے احکامِ رسول کی تعمیل کیسے ممکن ہے؟ علاوہ ازیں حدیث نبوی قرآن کے ناسخ و منسوخ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

منکرِ حدیث:۔ اس کی کوئی مثال ذکر کیجیے۔

امام شافعی:۔ قرآن میں فرمایا۔

کُتِبَ عَلَيْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَيْرًا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (البقرہ) | جب تم میں سے کسی کا آخری وقت آجائے اور اس نے مال چھوڑا ہو تو تم پر والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت فرض کی گئی ہے۔

ترکہ کی تقسیم سے متعلق قرآن میں فرمایا۔

وَلِاَبَوَيْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا | اگر میت کی اولاد بھی ہو تو اس کے ترکہ میں سے

السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ۔ (النساء)

والدین میں سے ہر ایک کو ⅙ ملے گا۔ اگر میت کی اولاد نہ ہو۔ اور اس کے والدین اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کو ⅓ ملے گا۔ اور اگر میت کے بھائی بھی ہوں تو اس کی ماں کو ⅙ ملے گا۔

حدیث نبوی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ ترکہ کی تقسیم سے متعلق آیت نے وصیت پر مشتمل آیت کو منسوخ کر دیا۔ اگر ہم حدیث نبوی کو تسلیم نہ کرتے ہوتے اور ایک شخص ہمیں کہتا کہ وصیت پر مشتمل آیت نے تقسیم ورثہ سے متعلق آیت کو منسوخ کر دیا تو اس پر حجت صرف حدیث ہی کے ذریعے سے قائم کی جا سکتی ہے۔

منکر حدیث:۔ آپ نے مجھ پر حجت تمام کر دی ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ حدیث نبوی کو قبول کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے۔ حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد میں اس بات میں عار محسوس نہیں کرتا کہ حدیث نبوی کے بارے میں اپنا موقف چھوڑ کر آپ کا زاویہ نگاہ اختیار کر لوں۔ بلکہ مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں کہ ظہور حق کے بعد اس کو تسلیم کرنا میرے لیے ضروری تھا۔ مگر یہ بتائیے کہ اس کا کیا مطلب کہ قرآن کے بعض عام احکام اپنے عموم پر رہتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ان میں تخصیص پیدا ہو جاتی ہے؟

امام شافعی:۔ امام شافعی نے اس کے جواب میں متعدد مثالیں ذکر کیں۔ پھر اپنے حریف کو مخاطب کر کے فرمایا۔

اب آپ پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو قرآن عزیز میں فرض قرار دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کو قرآن کے عام و خاص اور ناسخ و منسوخ کا شارح و ترجمان ٹھہرایا ہے۔

منکر حدیث:۔ جی ہاں۔ آپ کا ارشاد بجا ہے مگر میں تو ہمیشہ اس کی مخالفت کرتا رہا۔ یہاں

تک کہ اس نکتہ نظر کی غلطی مجھ پر واضح ہو گئی۔ اس ضمن میں منکر حدیث دو فرقوں میں بٹ گئے ہیں ایک فریق کا کہنا یہ ہے کہ حدیث نبوی مطلقاً حجت نہیں ہے۔ اور قرآن کریم میں ہر چیز کی وضاحت و صراحت موجود ہے۔

امام شافعی:۔ حدیث نبوی سے صاف انکار کا نتیجہ کیا نکلا؟

منکر حدیث:۔ بہت برا نتیجہ برآمد ہوا۔ اس لیے کہ انکار حدیث کا عقیدہ رکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ جو شخص کم از کم ایسا کام کرے جس کو صلوٰۃ یا زکوٰۃ کہہ سکتے ہیں۔ اس نے صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حق ادا کر دیا۔ اس میں وقت کی پابندی نہیں۔ اگر کوئی شخص ہر روز یا کئی دنوں میں دو رکعت نماز ادا کرلے تو اس نے صلوٰۃ کا فریضہ ادا کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جو حکم قرآن میں نہ وارد ہوا ہو، وہ کسی پر فرض نہیں۔

منکرین حدیث کا دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ جو حکم قرآن میں مذکور ہے اس کے بارے میں حدیث کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور جس ضمن میں قرآن وارد نہیں ہوا، اس میں حدیث کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ نتیجہ اس کا بھی وہی ہوا، جو پہلے فرقے کا ہوا تھا۔ اس فرقہ نے پہلے حدیث کو رد کیا اور پھر اس کو قبول بھی کرنے لگے۔ یہ لوگ کسی خاص و عام یا ناسخ و منسوخ کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان دونوں کا گمراہ ہونا واضح ہے اور میں ان میں سے کسی کو بھی حق نہیں سمجھتا۔ مگر میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ایک حرام چیز کو بلا دلیل کیسے حلال سمجھنے لگتے ہیں؟ کیا آپ کے پاس اس کی کوئی دلیل موجود ہے؟

امام شافعی:۔ دلیل موجود ہے۔

منکر حدیث:۔ کون سی دلیل؟

امام شافعی:۔ میرے پاس جو شخص بیٹھا ہے، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اس کا خون اور مال حرام ہے یا نہیں؟

منکر حدیث:۔ اس کا خون اور مال حرام ہے۔

امام شافعی :- اگر دو شخص شہادت دیں کہ اس نے فلاں شخص کو قتل کیا اور اس کا مال لے لیا۔ اور وہ مال اب اس کے پاس موجود ہے تو اس کے بارے میں آپ کیا رویہ اختیار کریں گے؟

منکر حدیث :- میں اس کو فوراً قتل کر دوں گا اور اس سے مال لے کر مقتول کے وارثوں کو لوٹا دوں گا۔

امام شافعی :- کیا یہ ممکن نہیں کہ گواہوں نے جھوٹی اور غلط گواہی دی ہو؟

منکر حدیث :- ایسا ہو سکتا ہے۔

امام شافعی :- پھر آپ نے جھوٹی گواہی کی بنا پر اس شخص کے مال اور خون کو کیسے مباح قرار دیا۔ حالانکہ وہ خون اور مال حرام تھا؟

منکر حدیث :- اس لیے کہ شہادت کا قبول کرنا ضروری امر ہے۔

امام شافعی :- اگر تم گواہوں کی گواہی کو ظاہری صداقت کی بنا پر قبول کرنا ضروری سمجھتے ہو اور باطن کا علم تو صرف ذاتِ خداوندی ہی کو ہے تو ہم راوی کے لیے جو شرائط عاید کرتے ہیں، وہ گواہ کی شرائط سے زیادہ کڑی ہیں۔ چنانچہ ہم جن لوگوں کی شہادت کو قبول کرتے ہیں، ضروری نہیں کہ ان کی روایت کردہ حدیث کو بھی صحیح سمجھ لیں۔ راوی کی صداقت اور غلطی کا پتہ تو ان رُواۃ و رجال سے بھی چل جاتا ہے۔ جو روایت حدیث میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب و سنت سے بھی راوی کی غلطی واضح ہو جاتی ہے مگر شہادت میں ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی۔

منکر حدیث :- میں تسلیم کرتا ہوں کہ حدیث نبوی دین میں حجت ہے اور رسول کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے فرض ٹھہرایا ہے۔ جب میں نے رسول کریم کی کسی حدیث کو قبول کیا تو گویا خدا کے حکم کو قبول کیا۔ حدیث رسول کی حجیت پر سب مسلمانوں کا اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔ آپ کے بتانے سے مجھ پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ مسلمان ہمیشہ حق پر ہوتے ہیں۔" (کتاب الام ج ۷، ص ۲۵۰)

حجیتِ خبرِ واحد پر امام شافعی کا استدلال: امام شافعی اپنی مشہور کتاب "الرسالہ" میں "الحجۃ" کے زیر عنوان خبر واحد کی حجیت ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ایک شخص نے مجھ سے کہا، کسی آیت، حدیث یا اجماع کی دلیل سے خبر واحد کی حجیت ثابت کیجیے۔ میں نے کہا سفیان عبدالملک بن عمیر سے وہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود سے اور وہ اپنے والد ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرّم رکھے۔ جس نے میری بات سن کر اسے یاد رکھا اور آگے پہنچایا۔ علم کے بعض حامل فقیہہ نہیں ہوتے اور بعض لوگ ایسے اشخاص تک علم کو پہنچاتے ہیں جو ان سے بڑھ کر فقیہہ ہوتے ہیں۔ تین باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں کوئی مسلم خیانت نہیں کر سکتا۔ (۱) خالص رضائے الٰہی کے لیے نیک کام کرنا۔ (۲) مسلمانوں کی خیر خواہی و ہمدردی (۳) مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ وابستہ رہنا۔ کیوں کہ ان کی دعاءیں سب مسلمان شریک ہوتے ہیں۔"

اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات کو سننے، انہیں یاد رکھنے اور ایسے شخص تک پہنچانے کا حکم دیا ہے۔ جو انہیں آگے لوگوں تک پہنچا دے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص تک آپ کی بات پہنچائی جائے گی، وہ ایک بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ اسی شخص کو اپنا کلام آگے پہنچانے کا حکم دے رہے ہیں جس کی بات دوسروں کے نزدیک واجب التسلیم حجت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور کا جو ارشاد بھی دوسروں تک پہنچایا جائے گا۔ اس میں کسی حلال چیز کا ذکر ہوگا جس کو استعمال کیا جاتا ہے، یا کوئی حرام چیز مذکور ہوگی، جس سے پرہیز ضروری ہے۔ یا شرعی سزا اور یا مال کے لینے دینے کا ذکر ہوگا۔ یا دین و دنیا کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نصیحت فرمائی ہوگی۔ اس

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اشخاص علم کے حامل تو ہوتے ہیں مگر عالم نہیں ہوتے۔ ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ضرور یاد ہوتے ہیں۔ مگر وہ ان کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ حضور نے مسلمانوں کی جماعت سے وابستہ رہنے کا حکم بھی دیا ہے۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اجماع لازم الاتّباع حجّت ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں ہم نے امام مالک سے، انہوں نے عبداللہ بن عمر سے سُنا کہ لوگ (مدینہ کے نواح میں) مسجد قباء میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ نبی اکرم کو بیت اللہ کی جانب نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، تم بھی (حالت نماز میں) اس طرف مُڑ جاؤ۔ لوگ ملک شام کی جانب منہ کیے نماز ادا کر رہے تھے۔ وہ یہ سُن کر قبلہ رُخ ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ اہل قباء سابق الاسلام اور اصحاب علم تھے۔ وہ بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز ادا کر رہے تھے، جس کے لیے وہ من جانب اللہ مامور تھے۔ وہ اس فریضۂ خداوندی کو اس وقت تک چھوڑ نہیں سکتے تھے، جب تک ان کو ایسا حکم نہ دیا جائے۔ جس کی وجہ سے ان پر اتمام حُجّت ہو سکے۔ نہ وہ بذات خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے نہ براہِ راست تحویل قبلہ سے متعلق حکم آپ کی زبان سے سُنا۔ عام لوگوں سے بھی انہوں نے تحویل قبلہ کے بارے میں کوئی خبر نہیں سنی تھی۔ صرف ایک آدمی کے کہنے پر جس کو وہ صادق القول سمجھتے تھے، ایک فریضہ کو ترک کر دیا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خبر ان کو تحویل قبلہ سے متعلق ملی تھی، اس پر عمل کر لیا۔ اگر ایک شخص کی بات قابل اعتماد نہ ہوتی تو وہ اس کے کہنے پر ہرگز قبلۂ سابق کو ترک نہ کرتے۔ وہ ایک عظیم دینی معاملہ کو اپنی رائے سے طے نہیں کر سکتے تھے۔ مزید براں اگر تحویل قبلہ کے سلسلہ میں خبر واحد کو قبول کرنا ان کے لیے جائز نہ ہوتا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر عتاب فرماتے۔ حضور فرماتے کہ تم ایک قبلہ کی جانب رُخ کرنے کے لیے مامور تھے اور تم اس کو اسی صورت میں ترک کر سکتے تھے، جب نہیں کوئی ایسی خبر ملتی جس سے تم پر حجت قائم ہو جاتی۔ مثلاً تم نے براہِ راست مجھ سے سنا ہوتا۔

یا عام لوگوں نے اور کم از کم ایک سے زیادہ اشخاص نے تم کو یہ خبر دی ہوتی۔ مگر آپ نے یہ عتاب نہیں فرمایا۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ہمیں امام مالک نے بتایا علا انہوں نے اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ سے اور انہوں نے انس بن مالکؓ سے سُنا کہ میں ابو طلحہؓ و ابو عبیدہؓ بن الجراح اور اُبیؓ بن کعبؓ کو کھجوروں کی شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ شراب حرام ہو گئی ہے۔ ابو طلحہؓ نے انس سے کہا کہ اُٹھ کر شراب کے مٹکوں کو توڑ دیجیے۔ چنانچہ میں نے ایک پتھر مار کر ان کو توڑ دیا۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں جن صحابہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ نہایت جلیل القدر، قدیم الصحبت اور اصحاب علم و فضل تھے۔ کوئی عالم اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ شراب اس وقت حلال تھی۔ اور سب لوگ شراب پیتے تھے۔ ایک ہی شخص آتا ہے اور ان کو حرمتِ خمر سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ سُن کر شراب کے مٹکوں کا مالک ابو طلحہ انس کو مٹکے توڑنے کا حکم دیتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ نہ تو طلحہ نے نہ ان سب نے نہ ان میں سے کسی نے یہ بات کہی کہ ہم شراب کی حلت سے آگاہ ہیں۔ ہم خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کریں گے۔ یا عام لوگوں سے معلوم کریں گے۔ وہ ایک حلال چیز کو اس طرح انڈیل نہیں سکتے تھے کہ وہ ضائع ہو جائے۔ اگر خبر واحد ان کے نزدیک حجت نہ ہوتی تو وہ ایسا اقدام ہرگز نہ کرتے۔

امام شافعی فرماتے ہیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُنیسؓ کو حکم دیا کہ فلاں شخص کی بیوی کے پاس جائیے اور اگر وہ زنا کا اعتراف کر لے تو اسے سنگسار کر دیجیے چنانچہ اس عورت نے اعتراف جرم کیا اور اسے سنگسار کر دیا گیا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایک شخص کا اعتراف حجت ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو

کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ مختلف بلاد و قبائل کے حجاج آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور آپ ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ مناسک حج اور دیگر احکام بتاتے رہے اسی سال حضورؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایام حج میں مکہ بھیجا۔ جناب علیؓ نے یوم النحر کے دن مجمع عام میں لوگوں کو سورۃ التوبہ کی آیات تلاوت کر کے سنائیں۔ بعض قبائل کا عہد ان کو واپس کر دیا۔ کئی باتوں کا حکم دیا اور بعض امور سے منع فرمایا۔ مکہ والے حضرت ابوبکرؓ و علیؓ رضی اللہ عنہما کے علم و فضل اور امانت و صداقت سے آگاہ تھے۔ حاجیوں میں سے کوئی شخص اگر ان دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک سے ناواقف بھی ہوتا تو دوسرے لوگ اس کو ان کی صداقت سے آگاہ کر دیتے۔ ظاہر ہے کہ آپ نے ان دونوں بزرگوں کو الگ الگ اسی لیے بھیجا تھا کہ ایک شخص کی خبر سے حجت قائم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ ان کو جداگانہ طور مکہ نہ بھیجتے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اطراف و اکناف میں عمال و حکام مقرر کر کے بھیجے تھے ہم ان کے نام و مقام سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ ان عمال کو حکم دیا گیا تھا کہ جہاں ان کو مامور کیا گیا ہے۔ وہاں جا کر اللہ و رسول کے احکام پہنچائیں۔ چنانچہ انہوں نے تعمیل ارشاد کر دی۔ مگر بایں ہمہ ان لوگوں میں سے کسی نے بھی یہ بات نہ کہی کہ آپ اکیلے ہیں، ہم آپ کی بات تسلیم نہیں کریں گے۔ جب تک کہ براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سن لیں۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ نے ان حضرات کو اطراف ملک میں اسی لیے بھیجا تھا کہ ان کے ذریعہ ان لوگوں پر حجت قائم کی جائے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ اوامر و نواہی پر مشتمل خطوط اپنے عمال کے نام بھیجتے رہے۔ آپ کے کسی والی نے اس بنا پر حضور کی حکم عدولی نہ کی کہ صرف ایک قاصد یہ خط اس کے نام لایا ہے۔ حضور ہمیشہ اسی قاصد کو کسی علاقہ میں بھیجتے تھے، جس کے رہنے والے اس کو صادق القول تصور کرتے ہوں۔ حضورؐ کے خلفائے راشدین اور ان کے

عمال و حکام کا بھی یہی طریقہ رہا۔ مسلمانوں کا اجماع ہمیشہ اس بات پر قائم رہا کہ خلیفہ ایک ہوتا قاضی بھی ایک، امیر بھی ایک اور امام بھی ایک ہوتا۔ یہ سب لوگ امیر ہوں یا قاضی مقدمات فیصل کرتے۔ اور ان کے احکام نافذ ہوتے۔ یہ شرعی سزائیں بھی دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے احکام بھی ایک طرح کی خبر ہی تھے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہُوا کہ خبر واحد کو ہمیشہ حجت قرار دیا گیا۔

امام شافعی فرماتے ہیں، میں نے حدیثِ رسولؐ اور مسلمانوں کے اجماع کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہادت خبر اور حکم میں فرق ہوتا ہے۔ (الرسالۃ ص ۴۰۱)

خبر واحد کے قبول کرنے میں احتیاط: ارباب بدعت نے حدیث نبوی کے بارے میں جو طرز عمل اختیار کیا تھا۔ ہم قبل ازیں اس پر روشنی ڈالی چکے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کے بارے میں منکرین حدیث کے تین مذاہب تھے۔

۱۔ منکرین حدیث کا ایک گروہ جملہ اقسامِ حدیث کو تسلیم نہیں کرتا۔

۲۔ جو حدیث قرآن کی شرح و تفسیر میں وارد نہ ہوئی ہو، منکرین حدیث کا دوسرا گروہ اس کو تسلیم نہیں کرتا۔

۳۔ منکرین حدیث کا تیسرا گروہ صرف احادیث متواترہ پر یقین رکھتا ہے۔

جہاں تک علمائے اسلام کا تعلق ہے وہ اس ضمن میں متحد الخیال تھے کہ احادیث صحیحہ متواتر ہوں یا غیر متواتر اصولِ دین میں سے ایک عظیم اصل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ ان کے یہاں یہ امر متنازع فیہ تھا کہ خبر واحد کن شرائط کے پائے جانے کی صورت میں واجب الاتباع حُجت ہوتی ہے۔ امام مالک کے نزدیک خبرِ واحد اس وقت حُجت ہے جب جمہور اور اہل مدینہ کی اکثریت اس کے خلاف عمل نہ کر رہی ہو۔ اس لیے کہ اہل مدینہ کا تعامل ان کے نزدیک

وہی درجہ رکھتا ہے جیسے اہل مدینہ کی ایک جماعت رسول کریمؐ سے کسی حدیث کی روایت کر رہی ہو۔ کیونکہ ایک جماعت کی روایت دوسری جماعت سے اس بات سے اولیٰ ہے کہ ایک فرد دوسرے فرد سے روایت کر رہا ہو۔

قبولیتِ خبرِ واحد کے شرائط: امام ابوحنیفہ خبر واحد کی قبولیت کے لیے مندرجہ ذیل شرائط عائد کرتے ہیں۔

۱۔ خبرِ واحد اس صورت میں مقبول ہے جب کہ وہ سنتِ مشہورہ (خواہ قولی ہو یا فعلی) کے خلاف نہ ہو۔ اس لیے کہ دو دلیلوں میں سے اس دلیل پر عمل کیا جاتا ہے جو قوی تر ہو۔

۲۔ خبرِ واحد اس عمل متوارث کے خلاف نہ ہو جو صحابہ و تابعین میں مشترک طور سے پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ کسی شہر میں بھی سکونت پذیر ہوں۔ اس میں کسی شہر کی کوئی تخصیص نہیں۔

۳۔ خبرِ واحد اس صورت میں مقبول ہے جب کتاب اللہ کے عمومات و ظواہر کے خلاف نہ ہو۔ اس لیے کہ کتاب اللہ کے ظواہر و عمومات قطعی الدلالت ہیں اور قطعی ظنی کے مقابلہ میں مقدم ہوتا ہے۔ جس صورت میں خبرِ واحد کتاب اللہ کے عموم یا ظاہر کے خلاف نہ ہو۔ بلکہ قرآن کی شرح و تفسیر پر مشتمل ہو تو امام ابوحنیفہ اس پر عمل کرتے ہیں۔ اس لیے کہ شرح و تفسیر کے بغیر آیت قرآنی کسی بات پر دلالت ہی نہیں کر سکتی۔

۴۔ جب خبرِ واحد قیاسِ جلی کے خلاف ہو تو اس صورت میں مقبول ہوگی۔ جب کہ اس کا راوی فقیہ ہو۔ راوی کے غیر فقیہ ہونے کی صورت میں اس امر کا احتمال ہے کہ راوی نے روایت بالمعنیٰ کی ہو۔ اور اس میں اس سے غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

۵۔ یہ کہ خبرِ واحد کا تعلق ایسے اُمور کے ساتھ نہ ہو۔ جو عام لوگوں کو پیش آتے ہیں مثلاً حدود و کفارات جو ادنیٰ شبہ پیدا ہو جانے کی صورت میں باقی نہیں رہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عادۃً ایسے امور سے اکثر لوگ باخبر ہوتے ہیں نہ کہ صرف ایک دو شخص۔ اس لیے ایسے واقعات میں شہرت اور تلقی بالقبول ضروری ہے۔

۶۔ عہد سلف میں کسی عالم نے اس حدیث پر جرح وقدح نہ کی ہو۔ نیز یہ کہ حدیث کے راوی نے کسی دوسرے صحابی کے اختلاف کی وجہ سے اس پر عمل کو ترک نہ کیا ہو۔

۷۔ قبولیت خبر واحد کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ راوی کا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ رض نے یہ حدیث روایت کی کہ جب کتا کسی برتن میں منہ ڈالے تو اسے سات مرتبہ دھویا جائے مگر وہ اس کے خلاف فتویٰ دیتے تھے۔ اس لیے امام ابو حنیفہ نے ان کی روایت کردہ حدیث پر عمل کرنا ترک کر دیا۔

۸۔ خبر واحد اس صورت میں مقبول ہے۔ جب اس کا راوی دیگر ثقہ راویوں کے خلاف اس حدیث کی سند یا متن میں کوئی اضافہ نہ کر رہا ہو۔ اگر وہ اضافہ کرے گا، تو بنا بر احتیاط ثقات کی روایت پر عمل کیا جائے گا۔ اور اس کی زیادت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ (تانیب الخطیب محمد زاہد کوثری ص ۱۵۳ و شرح التوضیح ج ۲ ص ۲۵)

بخلاف ازیں جمہور محدثین وفقہاء جن کے سرخیل امام شافعی ہیں، یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ جب ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راوی سے روایت کرے اور اس کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے تو ایسی حدیث کی صحت ثابت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس کا راوی ایک ہی ہو۔ ان کے نزدیک مذکورہ صدر شرائط کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب اس طرح کسی حدیث کی صحت ثابت ہو جائے گی تو اصول شریعت میں سے اس کو ایک اصل قرار دیا جائے گا۔ اور کسی دوسرے کے قول یا فعل کو کچھ اہمیت نہیں دی جائے گی امام شافعی نے اپنی کتاب "الام" اور دوسری کتاب "الرسالۃ" میں اپنے اس موقف کو زبردست دلائل کی روشنی میں ثابت کیا اور اس کے مخالفین کی تردید کی ہے۔ محدثین نے حدیث نبوی کی حمایت ودفاع کا فریضہ ادا کرنے کی بنا پر امام شافعی کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اہل بغداد نے آپ کو "ناصر السنۃ" کے لقب سے نوازا۔

امام شافعی بنا بر احتیاط احادیث مرسلہ سے احتجاج نہیں کرتے۔ اگرچہ آپ کا یہ

موقف علمائے متقدمین مثلاً سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ و امام ابو حنیفہؒ کے خلاف ہے۔ البتہ امام شافعی کبار تابعین کی مرسل روایات کو تسلیم کرتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ کسی دوسری سند سے مروی ہوں، وہ سند مرسل ہی کیوں نہ ہو۔ یا کسی صحابی یا اکثر علماء کے قول سے اس کی تائید ہو رہی ہو۔ یا مرسل روایت کرنے والا راوی ہمیشہ ثقہ راویوں سے روایت کرنے کا عادی ہو۔ ان صورتوں میں کبار تابعین کی مرسل روایات امام شافعی کے نزدیک حجت ہوں گی۔ تاہم ان کا درجہ مرفوع متصل احادیث کے برابر نہ ہوگا۔ کبار تابعین کے سوا دوسرے کسی راوی کی مرسل روایت امام شافعی کے نزدیک کسی صورت میں بھی حجت نہیں ہے۔ (اختصار علوم الحدیث ص ۳۹)

سابقہ بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ حدیث نبوی کی قدر و قیمت متعین کرنے میں بڑا اختلاف پایا جاتا تھا۔ گاہے ایسا ہوتا کہ حنفی شخص حدیث کی شہرت کی بنا پر اس پر عمل کرتا اور شافعی المسلک ضعیف الاسناد ہونے کی بنا پر اس کو متروک العمل ٹھہراتا۔ ایک مالکی المسلک شخص ایک حدیث پر اس لیے عمل نہ کرتا کہ اہل مدینہ کا تعامل اس کے خلاف ہے۔ اس کے برخلاف شافعی المسلک صحیح الاسناد ہونے کی بنا پر اس پر عمل کرتا۔ آخری دور میں ایسے لوگ منظر عام پر آئے جو اپنے فقہی مسالک کی تائید و حمایت کرتے اور دوسرے ائمہ پر تنقید کرتے تھے۔ انہوں نے ان اصول و ضوابط کو نظر انداز کر دیا۔ جن پر ان کے ائمہ گامزن تھے۔ وہ جب دیکھتے کہ دوسرے فقہی مسلک کے حاملین نے کسی حدیث پر عمل نہیں کیا تو وہ ان پر معترض ہوتے کہ انہوں نے ایک صحیح الاسناد حدیث کی مخالفت کی ہے۔ اگرچہ وہ حدیث ان شرائط کی جامع نہ ہو۔ جو دوسرے فقہی مسلک کے حاملین کے نزدیک ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کرتے کہ جس حدیث پر ان کے امام نے عمل نہیں کیا وہ حتی المقدور جیسے بھی ممکن ہو، اس کو ضعیف ٹھہرانے کی کوشش کرتے۔ حالانکہ یوں کہنا بہت آسان تھا کہ چونکہ وہ حدیث

ان ضروری شرائط کی حامل نہیں جو امام کے نزدیک لازم تھے۔ اس لیے امام نے اس کو معمول بہ قرار نہیں دیا۔ (تاریخ التشریع الاسلامی للخضری ص ۲۱۰)

امام ابو حنیفہ کی حدیث دانی: امام ابو حنیفہ نے سابق الذکر اصول کی بنا پر بکثرت اخبار احاد پر عمل نہیں کیا۔ آپ احادیث مرسلہ سے احتجاج کرتے تھے۔ بشرطیکہ وہ مشہور ہوں۔ جس ضمن میں کوئی اثر وارد نہ ہوا ہو، آپ اس میں قیاس سے کام لیا کرتے تھے۔ بنابریں بعض متعصب محدثین و فقہا نے آپ پر مندرجہ ذیل الزامات عائد کیے ہیں۔

۱۔ آپ حدیث نبوی میں کم سواد تھے۔

۲۔ حدیث کے مقابلہ میں آپ قیاس کو ترجیح دیتے تھے۔

۳۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری و مسلم نے ان کی کوئی روایت اپنی کتاب میں شامل نہیں کی۔

چونکہ یہ الزامات بعید از انصاف و حق ہیں۔ اس لیے ہم یکے بعد دیگرے ان کی تردید کرتے ہیں۔

۱۔ جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ امام ابو حنیفہ فن حدیث میں قلیل البضاعت تھے یہ زعم باطل ہے۔ جس کی کوئی دلیل نہیں۔ اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ آپ ان ائمہ مجتہدین میں سے تھے جو کتاب و سنت اور ان کے مطالب و معانی سے پوری طرح ماہر تھے۔ محمد بن محمود خوارزمی متوفی ۶۶۵ھ نے مسند ابی حنیفہ مرتب کی ہے۔ یہ مسند ان پندرہ مسانید سے ماخوذ ہے۔ جن کو جید علمائے حدیث نے مسند امام ابو حنیفہ کے نام سے تالیف کیا تھا۔ خوارزمی نے اس مسند کو فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا ہے۔ مگر المعاد پر مشتمل باب کو حذف کر دیا اور اسانید کی تکرار بھی نہیں کی گئی۔

خوارزمی مسند کے خطبہ میں فرماتے ہیں۔
میں نے دیار شام کے بعض جاہلوں کو سنا کہ وہ امام ابوحنیفہؒ کی اس بنا پر تحقیر کر رہے تھے کہ آپ فنِ حدیث میں قلیل البضاعت ہیں۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے تھے کہ امام شافعی نے مسند ترتیب دی۔ امام مالک نے موطّا مرتب کیا۔ مگر امام ابوحنیفہ کی کوئی مسند نہیں۔ آپ معدودے چند احادیث روایت کرتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے دینی غیرت نے آلیا اور میں نے ارادہ کیا کہ مختلف علمائے حدیث نے جو مسانید تالیف کی ہیں، ان کو مسند امام ابی حنیفہ کے نام سے یک جا کر دوں۔ یہاں خوارزمی نے ان پندرہ علماء کے اسمائے گرامی ایک ایک کر کے ذکر کیے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ میں نے اس مسند کو فقہی ابواب کے مطابق مرتّب کیا۔ مگر معاد کے باب کو حذف کر دیا۔ اور اسناد کی تکرار بھی نہیں کی۔
حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی محدّث مصر اپنی کتاب عقود الجمّان میں فرماتے ہیں۔
"امام ابوحنیفہ کبار حفّاظِ حدیث میں سے اور ان کے سرتاج تھے۔ اگر وہ حافظِ حدیث نہ ہوتے تو فقہی مسائل کا استنباط نہ کر سکتے۔ محدّث ذہبی نے طبقات الحفّاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ حافظ حدیث ہونے کے باوجود آپ کے قلیل الروایت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ استنباطِ مسائل میں مشغول رہا کرتے تھے۔ جس طرح امام مالک و شافعی سے بھی کم احادیث روایت کی گئی ہیں حالانکہ دونوں عظیم حافظِ حدیث تھے۔ اس کی وجہ بھی ان کی فقہی مسائل میں مشغولیت ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کبار صحابہ میں سے تھے۔ اور ان کو بکثرت احادیث یاد تھیں مگر ان سے دوسرے صحابہ کی نسبت کم احادیث منقول ہیں۔ اس کی وجہ ان کی سیاسی و انتظامی مصروفیات تھیں۔"

آگے چل کر حافظ محمد بن یوسف صالحی بکثرت روایات نقل کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ نہایت کثیر الحدیث تھے۔ پھر صاحب موصوف امام صاحب کی ان اسانید کا تذکرہ کرتے ہیں، جو سترہ مسانید ابو حنیفہ کے جامعین نے ذکر کی ہیں۔ مذکورہ سترہ مسانید کے علاوہ بعض دیگر علما نے بھی امام صاحب کی مسانید مرتب کی ہیں ان میں مندرجہ قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مسند ابی حنیفہ از دار قطنی۔

۲۔ مسند ابی حنیفہ از ابن شاہین۔

۳۔ مسند ابی حنیفہ از خطیب بغدادی۔

۴۔ مسند ابی حنیفہ از ابن عقدہ۔

علامہ بدرالدین عینی اپنی تاریخ کبیر میں لکھتے ہیں کہ مسند ابی حنیفہ از ابن عقدہ ایک ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل ہے۔ جلال الدین سیوطی "التعقبات" میں لکھتے ہیں کہ "ابن عقدہ کبار محدثین میں سے اور ثقہ راوی تھے۔ ان کو ضعیف راوی وہی شخص کہتا ہے جو متعصب ہو۔" (تانیب الخطیب ص ۱۵۶)

۲۔ جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دیا کرتے تھے تو یہ ایک زعم باطل ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ جناب امام خود اپنے طریق استنباط پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"جب کسی مسئلہ کے بارے میں مجھے کتاب اللہ سے کوئی نص مل جاتی ہے تو اس پر اکتفا کرتا ہوں۔ جب کتاب اللہ کی نص موجود نہ ہو تو حدیث رسول ؐ اور ان آثار صحیحہ پر عمل پیرا ہوتا ہوں جو ثقات میں عموماً رائج ہیں۔ جب کسی مسئلہ کا حل مجھے کتاب وسنت میں نہیں ملتا تو اصحاب رسول ؐ کے اقوال سے استشہاد کرتا ہوں۔ جس صحابی کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کا قول چاہتا ہوں ترک کر دیتا ہوں۔ مگر صحابہ کے مجموعی

اقوال سے باہر نہیں جاتا۔ جب نوبت ابراہیم نخعی، شعبی، حسن بصری، ابن سیرین اور سعید بن المسیّب جیسے تابعین تک آتی ہے تو میں اجتہاد کرتا ہوں جیسے انہوں نے اجتہاد کیا تھا۔" (تاریخ التشریع الاسلامی للخضری)

مندرجہ صدر قول سے واضح ہوتا ہے کہ حدیث کی عدم موجودگی کی صورت میں امام ابو حنیفہ اقوال صحابہ سے اخذ و احتجاج کرتے اور ان کو اپنے قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ پھر آپ کی جانب اس بات کو کیسے منسوب کر سکتے ہیں کہ آپ حدیث کے مقابلے میں اپنے قیاس کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ تمسک بالسنّۃ کے معاملہ میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ آپ ثقہ راویوں کی مرسل روایات کے ساتھ بھی احتجاج کیا کرتے تھے جو علماء کے درمیان مشہور تھیں۔

احادیث آحاد کی قبولیت کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہ نے جو کڑی شرطیں عائد کر رکھی تھیں، اس کی وجہ خدا کے دین میں حزم و احتیاط سے کام لینا تھا۔ آپ کے عصر و عہد میں وضعِ حدیث کا عام چرچا تھا۔ زنادقہ اور ارباب بدعت وضعِ احادیث کے دھندے میں لگے رہتے تھے۔ بنا بریں آپ نے حدیث صحیح کے سلسلہ میں کڑی شرطیں عائد کیں۔ اسی لیے علماء عموماً یہ بات کہتے ہیں کہ

"امام ابو حنیفہ کسی عناد کی بنا پر احادیث کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ قوی دلائل و براہین کے پیش نظر بنا بر اجتہاد آپ نے یہ موقف اختیار کیا تھا۔ اس لیے اگر آپ کا یہ اجتہاد غلط ہے تو ان کو ایک اجر ملے گا۔ اور اگر درست ہے تو دو اجر۔ آپ کو ہدفِ نقد و جرح بنانے والے یا تو حاسد ہیں اور یا اجتہاد کی حقیقت سے بے گانہ اشخاص۔"

ائمہ مجتہدین میں سے کوئی امام بھی ایسا نہیں جس نے متعدد احادیث کو بوجوہ ردّ نہ کر دیا ہو۔ یا تو اس لیے کہ وہ احادیث ان کے نزدیک شرائط صحت کی جامع نہیں

یا منسوخ ہونے کی وجہ سے یا اس لیے کہ ان کی معارض دوسری حدیث موجود ہے۔

امام مالک ہی کو دیکھیے باوجودیکہ آپ امام دارالہجرت اور امیر المؤمنین فی الحدیث تھے تاہم آپ نے ستّر (۷۰) احادیث کی مخالفت کرکے اپنی رائے پر عمل کیا۔ اس لیے کہ وہ احادیث ان کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھیں۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۸، شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۹ نیز مقدمہ ابن خلدون فصل علوم الحدیث ومقدمہ قسطلانی علی البخاری ص ۳۳)۔

۳۔ باقی رہی یہ بات کہ امام بخاری ومسلم نے امام ابوحنیفہ سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ثقہ راوی نہ تھے۔ اس لیے کہ ان دونوں اکابر محدثین نے اپنی کتب میں اس بات کا التزام نہیں کیا کہ وہ تمام احادیث صحیحہ کا استیعاب کریں گے یا تمام قابل اعتماد ائمہ حدیث سے بالضرور روایت کریں گے۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ کثیر صحابہ اور ائمہ مجتہدین مثلاً امام شافعی ضعیف راوی تھے۔ اس لیے کہ بخاری ومسلم میں ان سے کوئی روایت منقول نہیں۔ حالانکہ کوئی مسلمان اس بات کو تسلیم نہیں کرسکتا۔

امام ابوحنیفہ وشافعی سے شیخین (بخاری ومسلم) کے روایت نہ کرنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ ہر دو محدثین اکثر وبیشتر ان علما کی مرویات جمع کرنے میں مشغول تھے کہ اگر ان کی روایات کو کتب حدیث میں جگہ نہ دی جاتی تو ان کی وفات کے ساتھ وہ احادیث صفحۂ کائنات سے نابود ہو جاتیں۔ اس لیے کہ ان کے متبعین یا تو بالکل نہ تھے یا قلیل التعداد تھے۔ جو ان کی مرویات کی جمع وتالیف کا اہتمام کرنے سے قاصر تھے۔ مگر امام ابوحنیفہ وشافعی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان کے اصحاب وتلامذہ بسہولت ان کی مرویات کو جمع کرسکتے تھے۔ اس لیے ان کی روایات کردہ احادیث کے ضائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بخاری و مسلم میں امام ابوحنیفہ و شافعی کی مرویات کو شامل نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان حضرات کا موضوع فقہ الحدیث اور استنباطِ احکام تھا نہ کہ ان کے طرق و اسانید کا یکجا کرنا اور ان کے حفظ و ضبط کے لیے اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کرنا۔ یہ حضرات اپنی فقہی مجالس میں اپنی مرویات اپنے اصحاب و تلامذہ کو سنایا کرتے تھے۔ اس کی تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ امام بخاری و مسلم امام ابوحنیفہ و شافعی سے روایت کرتے تو اسناد میں راویوں کی تعداد بڑھ جانے سے سند نازل ہو جاتی۔ جب کہ وہی حدیث اگر دوسری سند کے ساتھ روایت کی جائے تو وہ عالی ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اس کے وسائط کم ہوتے ہیں اور محدثین ہمیشہ سند عالی کو نازل کے مقابلہ میں ترجیح دیتے رہے ہیں۔ کیونکہ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب پایا جاتا ہے۔

مندرجہ صدر حقائق اس امر کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ حدیث نبوی میں کم سواد نہ تھے۔ مزید برآں وہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح بھی نہیں دیا کرتے تھے۔ آپ عظیم حافظ حدیث تھے اور اس فن میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ آپ پر یہ الزامات وہی شخص عائد کرتا ہے جو یا تو جاہل ہو یا حاسد۔ لہذا ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں جو یہ بات لکھی ہے کہ "تشددفی الروایتہ کی بنا پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک صرف سترہ ۱۷ احادیث صحیح ہیں"۔ اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ اسی طرح خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ بغداد میں امام ابوحنیفہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی کوئی اصل و اساس نہیں ہے عصر حاضر کے ایک عالم شیخ محمد زاہد کوثری نے خطیب کے عائد کردہ الزامات کا جواب دیا ہے۔ ان کی کتاب کا نام "تانیب الخطیب علی ما ساقہ فی ترجمۃ ابی حنیفہ من الاکاذیب" ہے۔ یہ بہت عمدہ اور مفید کتاب ہے۔

دوسری صدی ہجری کے مشہور محدثین کا تعارف

امام مالک: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر جلیل القدر امام تھے۔ آپ کا نسب ذی اصبح تک پہنچ جاتا ہے جو یمن میں ایک قبیلے کا نام ہے۔ آپ کے اجداد میں سے ایک مدینہ آکر آباد ہو گئے۔ آپ کے پردادا ابو عامر اصحاب رسول میں سے تھے اور بدر کے سوا تمام غزوات میں حضور کے ساتھ شرکت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے۔ امام مالک ۹۳ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور علمائے مدینہ سے کسب فیض کیا۔ عرصۂ دراز تک عبدالرحمٰن بن ہرمز سے استفادہ کرتے رہے۔ آپ نے نافع مولیٰ ابن عمر و محمد بن المنکدر و ابوالزبیر و زہری اور کثیر تابعین و اتباع تابعین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آپ کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد نو سو بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے تابعین تین سو اور اتباع تابعین چھ سو تھے۔ یہ سب وہ علماء تھے۔ جن کے علم و فضل اور امانت و دیانت کے امام مالک قائل تھے۔ امام مالک بعض صالح اور متقی لوگوں سے حدیثیں صرف اس لیے روایت نہیں کرتے تھے کہ وہ محدث نہ تھے۔

امام مالک نے یحییٰ انصاری اور امام زہری سے بھی روایت کی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں آپ کے اساتذہ میں شامل تھے۔ امام مالک کے زہری سے روایت کرنے کے سلسلہ ابن عبدالبر نے اختلاف کیا ہے۔ آپ کے تلامذہ میں مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

ابن جُریج۔ یزید بن عبداللہ بن ہادی۔ اوزاعی۔ ثوری۔ ابن عُیَینہ۔ شعبہ۔ لیث۔ ابن المبارک۔ شافعی۔ ابن عُلَیّہ۔ ابن وہب۔ ابویوسف ومحمد شاگردان ابوحنیفہ۔ ابن مہدی۔ معن بن عیسٰی اور بے شمار لوگ۔

آپ کی امامت وجلالت حدیث کے نقد وجرح میں مہارت وبصیرت اور کتاب وسنّت سے استخراجِ احکام میں فراست پر سب علماء کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ آپ کے اقران وا ماثل اور معاصرین سب اس کے معترف ہیں۔

حبیب الورّاق امام مالک کے بارے فرماتے ہیں۔

میں نے امام مالک کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے دریافت کیا کہ آپ نے فلاں تین راویوں سے حدیثیں کیوں نہیں روایت کیں؟ آپ نے یہ سن کر سر جھکا لیا اور کہا "ماشاء اللّٰہ لاقوّۃ اِلاّ باللّٰہ"۔۔۔۔ آپ اکثر یہ جملہ کہا کرتے تھے۔۔۔۔ اے حبیب! میں نے مسجد نبوی میں سترؓ ایسے اصحاب کو دیکھا جو صحابہ کو مل چکے اور تابعین سے روایت بھی کر چکے تھے۔ مگر میں نے ان سے ایک حدیث بھی روایت نہیں کی۔ اس لیے کہ ہم ان لوگوں سے روایت کرتے ہیں جو اس کے اہل ہوتے ہیں"۔

امام مالک روایتِ حدیث میں نہایت ثقہ اور ماہر رُواۃ ورجال تھے۔ اس ضمن میں آپ پر پورا پورا اعتماد کیا جاتا ہے کہ آپ کے اساتذہ اور معاصرین نے بھی آپ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ چونکہ مدینہ منورہ مہبطِ وحی اور حدیث رسولؐ کا مرکز ومحور تھا۔ اس لیے امام مالک طلبِ حدیث کے لیے مدینہ سے باہر نہیں گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی اکثر وبیشتر روایات اہل حجاز سے منقول ہیں اور موطا میں بیرونِ حجاز کے راویوں کا ذکر شاذ ونادر ہی آتا ہے۔ لوگ احادیث نبویہ اور دینی مسائل دریافت کرنے کے لئے دُور دراز سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ آپ کے علم وفضل اور مہارتِ حدیث وفقہ کے بارے میں بہت کچھ سن چکے تھے۔ لوگ

طالب علم کے لیے آپ کے دروازہ پر جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اور کثرت ازدحام کی وجہ سے ان میں باہم ٹکراؤ ہوا کرتی تھی۔

۱۴۷ھ میں امام مالک پر ایک عظیم ابتلا آیا اور آپ کو کوڑوں کے ساتھ پیٹا گیا۔ لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس ابتلاء کی وجہ کیا تھی۔ بعض لوگوں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ امام مالک نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ اگر کسی شخص کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے تو اس کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ان دنوں جب خلیفہ کسی شخص سے بیعت لیتا تھا تو اس کو اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ اگر وہ خلیفہ کی بیعت کو توڑے تو اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔ حکمران طبقہ نے خیال کیا کہ لوگ امام مالک کے فتویٰ کی بنا پر آسانی سے خلیفہ کی بیعت توڑ دیا کریں گے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابن قاسم نے امام مالک سے دریافت کیا کہ کیا حکومت کے باغیوں کے خلاف جنگ کی جاسکتی ہے؟ امام مالک نے فرمایا "اگر عمر بن عبدالعزیز جیسے خلیفہ کے برخلاف بغاوت کی جائے تو بلاشبہ باغیوں کے خلاف جنگ لڑنا درست ہے۔" ابن قاسم نے کہا اگر خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جیسا نہ ہو تو پھر؟ امام مالک نے فرمایا "تو پھر چھوڑ دیجیے ایک ظالم دوسرے ظالم سے بدلہ لے اور اللہ تعالیٰ پھر دونوں سے انتقام لے گا۔" چنانچہ آپ کا یہ فتویٰ ابتلاء کا موجب بنا۔ منصور کے عامل نے جو مدینہ میں متعین تھا، آپ کو ستر کوڑے مارے۔ جب خلیفہ منصور کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے اپنے عامل پر اظہار غیظ و غضب کیا۔ اور اسے معزول کر دیا۔

اگلے سال خلیفہ منصور نے ایام حج میں امام مالک سے مل کر اس کی معذرت چاہی اور آپ سے بہت سے دینی مسائل دریافت کئے۔ خلیفہ منصور نے جناب امام سے درخواست کی کہ جو احادیث و آثار آپ کو معلوم ہیں ان کو ایک کتاب میں جمع کر دیں۔ امام مالک نے معذرت چاہی مگر منصور نے قبول نہ کی۔ چنانچہ آپ نے موطا مرتب فرمائی۔ جب خلیفہ

مہدی اس کے بعد عازم حج ہُوا تو اس نے امام مالک کی خدمت میں حاضر ہو کر موطّا کا سماع کیا۔ امام مالک اس کے بعد خلفاء و علماء کے احترام و اکرام کا محور بنے رہے۔

خلیفہ ہارون اور اس کے دونوں بیٹے امین و مامون نے موسم حج میں امام مالک سے موطّا کا سماع کیا تھا۔ ہارون الرشید نے امام مالک سے کہا کہ میں آپ کی کتاب کو خانہ کعبہ میں آویزاں کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ موطّا کی نقول اطراف ملک میں بھیجی جائیں۔ اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ امام مالک نے فرمایا "یوں نہ کیجیے۔ اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ دُور دراز شہروں میں پھیل گئے تھے۔ انہوں نے جو حدیثیں روایت کیں وہ اہل حجاز کی روایت کردہ احادیث سے مختلف ہیں۔ اور لوگ ان پر عمل بھی کر چکے ہیں۔ لہذا لوگوں کو ان کے حال پر رہنے دیجیے"۔ ہارون نے کہا "ابو عبداللہ! اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

امام مالک نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ آپ حد درجہ شرمیلے اور حیادار تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ شیفتگی رکھتے تھے۔ زندگی بھر مدینہ میں کسی جانور پر اس لیے سوار نہ ہوئے کہ اس زمین میں حضور اکرم مدفون ہیں۔ آپ نے ۱۷۹ھ میں مدینہ میں وفات پائی۔ اور بقیع کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

(تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۷۵۔ مفتاح السنۃ ص ۲۳)

یحییٰ بن سعید القطّان: نام و نسب یحییٰ بن سعید بن فرّوخ تمیمی بصری لقب القطّان اور کنیت ابوسعید ہے۔ آپ اتباع تابعین میں سے امام جلیل اور محدّث کبیر تھے۔ آپ نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

یحییٰ بن سعید انصاری۔ ابن جُریج۔ سعید بن ابی عَروبہ۔ سفیان ثوری۔ ابن عُیینہ۔ مالک۔ شعبہ وغیرہم۔

آپ کے اہم تلامذہ حسب ذیل ہیں۔

سفیان ثوری۔ سفیان بن عُیینہ۔ احمد بن حنبل۔ یحییٰ بن معین۔ علی بن المدینی۔ اسحاق بن راہویہ۔ ابن مہدی۔ ابوعُبید قاسم بن سلام وغیرہم۔

علماء آپ کی امامت وجلالت علم وفضل اور حفظ وضبط کے بارے میں متحد الخیال ہیں۔ اکثر محدثین اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔

"میں نے یحییٰ القطان جیسا شخص نہیں دیکھا۔ بصرہ میں اس پر عدالت وثقاہت ختم ہوگئی۔ یحییٰ بن سعید، وکیع ابن مہدی، ابونعیم اور یزید بن ہارون سے زیادہ ثقہ ہیں۔ یحییٰ ان پچاس شیوخ سے حدیثیں روایت کرچکے ہیں جن سے سفیان نے روایت کی تھی۔ یحییٰ کے زمانے میں ان جیسا دوسرا کوئی شخص نہ تھا۔"

محدث ابوزُرعہ فرماتے ہیں۔

"یحییٰ ثقات اور حفاظِ حدیث میں سے ہیں۔"

ابن مَنجُویہ کہتے ہیں۔

"یحییٰ القطان علم وفضل حفظ وضبط اور ورع وتقویٰ کے اعتبار سے اپنے زمانہ کے سرخیل سمجھے جاتے تھے۔ وہ یحییٰ ہی تھے جس نے اہل عراق کے لیے حدیث نبوی کی راہ ہموار کی اور انہیں حدیث کے نقد وجرح کا سبق دیا۔"

یحییٰ القطان نے ماہ صفر ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ آپ کا سنِ ولادت ۱۲۰ھ ہے۔ (تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۵۴۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۴۴)

وکیع بن الجراح:

نام ونسب وکیع بن الجراح بن ملیح بن عدی اور کنیت ابوسفیان ہے۔ یہ اتباع تابعین میں سے عظیم حافظ حدیث، محدث کبیر اور حدیث میں اہل کوفہ کے امام تھے۔ آپ نے مندرجہ ذیل اصحاب سے کسب فیض کیا۔

اعمش۔ ہشام بن عروہ۔ عبداللہ بن عون۔ حنظلہ بن ابی سفیان۔ ابن جُریج۔ شریک بن عبداللہ۔ اوزاعی۔ سفیان ثوری۔ سفیان بن عُیینہ وغیرہم۔

تمام علماء آپ کی امانت وجلالت کثرت حفظ وعلم اور صلاح وتقویٰ کے بارے میں متفق اللسان ہیں۔ امام احمد بن حنبل جب ان سے روایت کرتے تو فرماتے "یہ حدیث مجھے وکیع نے سنائی ہے۔ تیری آنکھوں نے ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا
آپ فرمایا کرتے تھے۔

"میں نے علم وفضل اور حفظ وضبط میں وکیع جیسا شخص نہیں دیکھا۔ آپ کو حدیثیں بہت اچھی طرح یاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ فقہ میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ آپ نہایت متقی اور صاحبِ اجتہاد ہیں۔ وکیع کسی کی چغلی نہیں کھاتے۔"

محدث ابن معین فرماتے ہیں۔

"وکیع بن الجراح کے سوا میں نے کسی کو رضائے الٰہی کے لیے حدیثیں روایت کرتے نہیں دیکھا۔ وکیع مجھے سفیان ابن مہدی اور ابونعیمؒ سے بھی عزیز تر ہیں۔ میں نے وکیع سے بڑھ کر حافظِ حدیث نہیں دیکھا۔ وکیع اپنے زمانہ میں ایسے ہیں جیسے اپنے عصر وعہد میں اَوزاعی تھے۔"

محدث ابن عمار فرماتے ہیں۔

"وکیع کے زمانہ میں کوفہ میں ان سے بڑھ کر کوئی محدث وفقیہہ نہ تھا۔" وکیع ۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۲۳ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۴۴)۔

سُفیان ثَوری: نام ونسب سفیان بن سعید بن مسروق کنیت ابوعبداللہ اور نسبت ثوری اور کوفی ہے۔ آپ اتباع تابعین میں عظیم حافظِ حدیث تھے۔ آپ نے حدیث نبوی کا درس ابواسحاق سُبیعی، عبدالملک بن عُمیر، عمرو بن مُرّہ اور بے شمار کبار تابعین وغیرہم سے لیا۔ آپ کے تلامذہ میں مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

محمد بن عجلان تابعی۔ اعمش تابعی۔ معمر۔ اوزاعی۔ مالک۔ ابن عیینہ۔ شعبہ۔ فضیل بن عیاض۔ عبداللہ بن مبارک۔ وکیع۔ ابونعیم۔ یحییٰ بن القطان و دیگر ائمہ حدیث ۔

اس بات پر تمام علما کا اتفاق ہے کہ سفیان ثوری عظیم محدث و فقیہہ عابد و زاہد حق گو اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ تمام اخلاق جلیدہ سے متصف تھے۔

ابوعاصم کہتے ہیں۔

"سفیان ثوری امیر المومنین فی الحدیث ہیں"۔

عبداللہ بن مبارک کا قول ہے۔

"میں نے گیارہ صد اساتذہ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان میں سفیان ثوری سے بڑھ کر کوئی نہ تھا"

یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔

"جو شخص بھی سفیان ثوری سے اختلاف کرے گا تو سفیان کی بات پر اعتماد کیا جائے گا"۔

ابن مہدی کا قول ہے۔

"میں نے سفیان ثوری سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا۔"

سفیان ابن عیینہ فرماتے ہیں۔

"ابن عباسؓ اپنے زمانہ میں اور شعبی و ثوری اپنے اپنے عصر و عہد میں یکتائے روزگار تھے۔ جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے، میں سفیان ثوری کا خادم ہوں۔ میں نے حلال و حرام کا ان سے بڑھ کر عالم نہیں دیکھا۔"

امام اوزاعی ارشاد فرماتے ہیں۔

"علماء رخصت ہو چکے ہیں۔ اب سفیان ثوری کے سوا کوئی شخص ایسا موجود نہیں جس کی بات عوام رضا و رغبت سے سنیں اور اس کو صحیح سمجھیں"۔

عباس الدُوری کہتے ہیں۔

"میں نے دیکھا ہے کہ ابن معین سفیان ثوری پر کسی عالم کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔"

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی مدح و توصیف میں علماء کے بے شمار اقوال منقول ہیں۔ چھ فقہی مسالک میں سے ایک مسلک آپ کی جانب منسوب ہے۔ وہ چھ فقہی مسالک مندرجہ ذیل ائمہ مجتہدین کے ہیں۔

امام مالک۔ ابوحنیفہ۔ شافعی۔ احمد۔ اوزاعی۔ ثوری۔

سفیان ثوری ۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور بصرہ میں ۱۶۱ھ میں وفات پائی۔

(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۱۱۔ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۲)

سُفیان بن عُیَینَہ: سفیان بن عُیَیْنَہ بن عمران کی کنیت ابو محمد اور نسبت کُوفی مکّی اور ہلالی ہے۔ یہ تبع تابعین میں سے تھے۔ آپ نے زُہری و عمرو بن دینار، شعبی عبداللہ بن دینار، محمد بن المنکدر اور بے شمار تابعین سے حدیث کا درس لیا۔ آپ کے اصحاب و تلامذہ میں مندرجہ ذیل کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

اعمش۔ ثوری۔ ابن جریج۔ شُعبہ۔ ہمام۔ وکیع۔ عبداللہ بن مبارک۔ ابن مَہدی۔ قطّان۔ شافعی۔ احمد بن حنبل۔ ابن المدینی۔ ابن معین۔ ابن راہُوَیہ۔ حُمَید و دیگر علمائے حدیث و فقہ۔

آپ کی امامت و جلالت اور مہارتِ حدیث و فقہ کا سب علماء اعتراف کرتے ہیں۔

ابوحاتم فرماتے ہیں۔

"عمرو بن دینار سے روایت کرنے میں ابن عُیَینہ ثقہ ترین راوی ہیں۔ بلکہ عمرو بن دینار سے روایت کرنے میں شعبہ سے بھی بڑھ کر ہیں۔"

یحییٰ القطانؒ نے سفیان کی زندگی میں کہا تھا۔

”سفیان چالیس سال سے امامِ حدیث چلے آرہے ہیں۔ میں نے سفیان سے بڑھ کر محدّث نہیں دیکھا“

امام شافعی فرماتے ہیں۔

”میں نے سفیان سے کم فتویٰ دینے والا اور ان سے بڑھ کر حدیث نبوی کی شرح و توضیح کرنے والا نہیں دیکھا“

احمد بن عبداللہ کا قول ہے۔

”ابن عُیَیْنَہ عظیم محدث تھے۔ آپ کو اصحاب الحدیث کے حکماء میں شمار کیا جاتا ہے“

ابن وہب کہتے ہیں۔

”میں نے ابن عُیَیْنَہ سے بڑھ کر کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا“

آپ کے اوصاف و محامد لاتعداد اور مشہور ہیں۔ سفیان ۱۰۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۱۷۔ تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲۴)۔

شعبہ بن الحجّاج: نام ونسب شعبہ بن الحجّاج بن الورد العتکی الازدی الواسطی ثم البصری اور کنیت ابو بسطام ہے۔ آپ دراصل مقام واسط کے رہنے والے تھے۔ پھر بصرہ میں اقامت گزین ہو گئے۔ شعبہ اتباعِ تابعین میں سے عظیم محدث و محقق اور جلیل القدر امام تھے۔ آپ نے انس بن سیرین، عمرو بن دینار، شعبی اور کثیر تابعین وغیرہم سے حدیث نبوی کا درس لیا۔ آپ کے تلامذہ میں حسب ذیل اکابر شامل ہیں۔

اعمش۔ ایوب سختیانی۔ محمد بن اسحاق (یہ تینوں حضرات تابعین میں سے ہیں) ثوری

ابن مہدی۔ وکیع۔ ابن مبارک۔ یحییٰ القطان و دیگر بے شمار اکابر و ائمہ۔

علم حدیث میں آپ کی امامت و جلالت عرق ریزی اور احتیاط و اتقان پر سب علما کا اتفاق ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں۔

"شعبہ کے زمانہ میں ان جیسا اور ان سے بڑھ کر دوسرا کوئی محدث نہ تھا۔ آپ کو علم حدیث سے بہرۂ وافر ملا تھا۔ شعبہ نے کوفہ کے تیس ایسے اشخاص سے حدیثیں روایت کیں جن سے سفیان ثوری نے روایت نہیں کی تھی۔"

امام شافعی کا قول ہے۔

"اگر شعبہ نہ ہوتے تو عراق کے لوگ علم حدیث سے بے گانہ رہتے۔"

حماد بن زید کہتے ہیں۔

"جب کسی حدیث کی روایت کرنے میں شعبہ میرے ہمنوا ہوں تو مجھے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ کون شخص میری مخالفت کر رہا ہے۔ اس لیے کہ شعبہ صرف ایک دفعہ حدیث سننے کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ اور جب شعبہ کسی بات میں مجھ سے اختلاف کرتے ہیں تو میں اس کو ترک کر دیتا ہوں۔"

سفیان ثوری کہتے ہیں۔

"شعبہ امیر المومنین فی الحدیث ہیں جب مسلم بن قتیبہ بصرہ آئے تو سفیان ثوری نے ان سے کہا "ہمارے استاد شعبہ کا کیا حال ہے"؟

صالح بن محمد کہتے ہیں۔

"راویوں پر نقد و جرح سب سے پہلے شعبہ نے کی۔ پھر یحییٰ القطان، احمد بن حنبل اور ابن معین ان کے نقش قدم پر چلنے لگے۔"

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔

"شعبہ علم حدیث اور احوال رُواۃ کے سلسلہ میں تنہا ایک امّت کے برابر تھے۔"

عبد الصمد کہتے ہیں۔

"شعبہ نے حضرت ابن عمرؓ کے پچاس سے زائد تلامذہ سے مل کر کسب فیض کیا۔ شعبہ نے بصرہ میں بعمر ستتر (۷۷) سال ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۳۴۳ وتہذیب الاسماج ۱ ص ۲۴۴)۔

عبد الرحمٰن بن مہدی:

نام ونسب ابو سعید عبد الرحمٰن بن مہدی بن حسان بن عبد الرحمٰن عنبری بصری ہے۔ آپ اپنے عصر وعہد میں حدیث کے قابل اعتماد امام تصور کیے جاتے۔ آپ نے خالد بن دینار و مالک بن مغول و مالک بن انس ہر دو سفیان، ہر دو حماد شعبہ اور دیگر اکابر محدثین سے حدیث کا درس لیا۔ آپ سے مندرجہ ذیل اکابر نے کسب فیض کیا۔

ابن وہب۔ احمد بن حنبل۔ ابن معین۔ ابن المدینی۔ اسحاق بن راہویہ۔ ابو عُبید قاسم بن سلام وغیرہم۔

اس بات پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ آپ حدیث نبوی کے جلیل القدر امام ماہر رُواۃ و رجال نہایت متقی عابد و زاہد اور امین تھے۔ امام احمد کہا کرتے تھے کہ "ابن مہدی گویا علم حدیث ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔"

ابن معین کہتے ہیں۔

"میں نے علم حدیث میں ابن مہدی سے بڑھ کر ثقہ راوی نہیں دیکھا۔"

امام بخاری کے اُستاد ابن المدینی اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"میں رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑے ہو کر حلف اُٹھا سکتا ہوں کہ میں نے عبد الرحمٰن بن مہدی سے بڑھ کر حدیث کا عالم نہیں دیکھا۔"

عبد الرحمٰن بن مہدی کہا کرتے تھے۔

کوئی شخص اس وقت تک حدیث کا امام نہیں ہوسکتا۔ جب تک اسے تمام احادیث صحیحہ وسقیمہ کا علم نہ ہو اور جب تک وہ ہر حدیث سے احتجاج کرنا ترک نہ کر دے اور اسے معلوم ہو کہ علم کے سرچشمے کہاں ہیں۔"

ایک شخص نے ابن مہدی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ آپ کسی حدیث کو صحیح کہتے ہیں اور کسی کو ضعیف، آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ ابن مہدی کہنے لگے "اگر آپ کسی صراف کے پاس جا کر اس کو چند روپے دکھائیں اور وہ کہے کہ فلاں روپیہ کھرا ہے اور فلاں کھوٹا تو کیا آپ صراف سے اس کی دلیل طلب کریں گے؟ یا اس کی بات بلا دلیل مان لیں گے"؟ وہ کہنے لگا "میں صراف کی بات تسلیم کر لوں گا۔" ابن مہدی کہنے لگے "حدیث کا بھی یہی حال ہے۔ یہ مدت دراز تک مغز کھپانے اور طویل مجالسہ ومذاکرہ سے حاصل ہوتی ہے۔" آپ ۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۳۰۴ وتہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۷۹)۔

اوزاعی: نام ونسب عبدالرحمٰن بن عمرو کنیت ابو عمرو اور نسبت شامی دمشقی ہے۔ آپ اپنے زمانہ میں بلا نزاع وجدال اہل شام کے امام تھے۔ اہل شام مالکی مسلک اختیار کرنے سے پہلے امام اوزاعی کے فقہی مسلک پر عامل تھے۔ آپ تبع تابعین میں سے ہیں۔ اوزاعی نے بکثرت تابعین سے استفادہ کیا۔ مثلاً عطاء بن رباح وقتادہ ونافع مولیٰ ابن عمر وزہری ومحمد بن المنکدر وغیرہم۔

اوزاعی کے شیوخ واساتذہ کی ایک جماعت نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مثلاً قتادہ وزہری ویحییٰ بن ابی کثیر اور ان کے معاصرین۔ ائمہ کبار میں سے سفیان امام مالک شعبہ عبداللہ بن مبارک اور دیگر محدثین نے آپ سے کسبِ فیض کیا۔

تمام علماء امام اوزاعی کی امامت وجلالت علوِ مرتبت کمالِ فضل اور مہارتِ حدیث

وفقہ کے بارے میں متفق اللسان ہیں۔ آپ حد درجہ کے متبع سنت اور نصیح وبلیغ تھے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں۔

"ملکِ شام میں اوزاعی سے بڑھ کر حدیث وسنت کا کوئی عالم نہ تھا۔ حدیث کے امام دراصل چار ہیں۔ یعنی اوزاعی۔ مالک ۔سفیان ثوری اور حمّاد بن زید"

ابو حاتم کا قول ہے۔

"اوزاعی ایک لائقِ اتباع امام ہیں"

ھقل جن کو اوزاعی سے روایت کرنے میں ثقہ ترین راوی خیال کیا جاتا ہے فرماتے ہیں۔

"امام اوزاعی نے ستر ہزار کے قریب دینی سوالات کا جواب دیا ہے۔ ان کے معاصر علماء ان کا حد درجہ احترام کرتے اور ان کو امام تسلیم کرتے تھے۔ اوزاعی بڑے عابد وزاہد اور بے باک حق کہنے والے تھے"

جب امیہ بن یزید سے کہا گیا کہ "اوزاعی کو علم میں مکحول سے کیا نسبت تو انہوں نے کہا اوزاعی ہماری رائے میں مکحول سے بڑھ کر عالم ہیں۔ پھر کہا گیا کہ مکحول نے تو صحابِ رسولؐ کو دیکھا تھا" امیہ نے کہا یہ درست ہے مگر اوزاعی اپنی ذات کے اعتبار سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ آپ زاہد وعابد متقی اور بے باک حق گو ہیں"

سفیان ثوری سے منقول ہے کہ جب ان کو اوزاعی کی تشریف آوری کا علم ہوا تو "ذی طویٰ" کے مقام پر پہنچ کر ان کا استقبال کیا۔ سفیان نے اُونٹ کو جس پر وہ سوار تھے، آزاد کر دیا۔ اور امام اوزاعی کو اپنی گردن پر بٹھا لیا۔ اس حالت میں جب ان کا گزر لوگوں کی کسی جماعت کے پاس سے ہوتا تو کہتے "شیخ کے لئے راستہ خالی کر دو"

باقی رہی یہ بات کہ امام احمد اوزاعی کے بارے میں کہتے ہیں "حدیثہ ضعیف"

وہ ضعیف حدیثیں روایت کرتے ہیں) تو امام بیہقی جیسے محققین کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اوزاعی بعض فقہی مسائل کے بارے میں ضعیف احادیث سے احتجاج کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے امام اوزاعی کی شان میں قدح وارد نہیں ہوتی۔ ایک تو اس لیے کہ شرعی احکام پر استدلال کرنے کے بارے میں علماء کے مختلف مسالک ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ علماء احادیث مرسلہ بلکہ منقطع و موقوف احادیث کے ساتھ بھی احتجاج کرتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب احادیث ضعیفہ متعدد طرق و اسانید سے مروی ہوں یا ان کے کچھ شواہد ہوں، جو ان کی تائید کرتے ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ محدثین احادیث صحیحہ کی نقل و روایت پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ موضوع حدیث ذکر کر کے اس کا موضوع ہونا واضح کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ احادیث ضعیفہ بھی روایت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ جب حدیث ضعیف متعدد طرق سے مروی ہو یا اس کا کوئی شاہد موجود ہو۔ تو اس کے ساتھ احتجاج جائز ہے اور اس قسم کے دیگر غایات و مقاصد۔

امام اوزاعی ۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۷ھ میں بمقام بیروت وفات پائی۔ آخری عمر میں آپ بیروت (لبنان) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ (تہذیب الاسماء ج اص ۲۹۸)

لیث بن سعد: لیث بن سعد بن عبدالرحمٰن مصری تبع تابعین میں سے عظیم محدث و فقیہہ اور جلیل القدر امام تھے۔ ان کی کنیت ابوالحارث ہے۔ آپ کے شیوخ و اساتذہ میں مندرجہ ذیل اکابر شامل ہیں۔

عطا بن ابی رباح۔ عبداللہ بن ابی مُلَیکہ۔ نافع مولیٰ بن عمر۔ سعید المقبری۔ زہری یحییٰ انصاری۔ ابوالزبیر و بکثرت تابعین و اتباع تابعین۔

اصحاب و تلامذہ:۔ محمد عجلان۔ ہشام بن سعد (یہ دونوں لیث کے استاد ہیں)۔ قیس بن ربیع۔ عبداللہ بن مبارک۔ ابن وہب۔ ابن لہیعہ۔ لیث کے کاتب

عبداللہ بن صالح ودیگر بکثرت ائمہ۔

تمام علماء آپ کی امامت وجلالت اور حدیث وفقہ میں مہارت وبصیرت پر متفق ہیں۔ لیث اپنے عہد میں اہل مصر کے امام زماں تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں۔

"لیث بن سعد امام مالک سے بھی بڑے فقیہہ تھے۔ مگر آپ کے اصحاب وتلامذہ نے آپ کی قدر نہ کی۔"

محمد بن سعد فرماتے ہیں۔

"لیث قریش کے حلیف تھے۔ آپ نہایت ثقہ راوی اور کثیر الحدیث تھے۔ آپ بڑے رئیس بلند پایہ شخص اور کریم النفس تھے۔"

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔

"لیث کثیر العلم اور صحیح الحدیث ہیں۔ مصری راویوں میں کوئی بھی ان سے ثقہ تر نہیں ہے۔ میں نے لیث جیسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔ آپ دیکھنے میں فقیہہ نظر آتے تھے۔ نہایت عمدہ عربی بولنے والے تھے۔ قرآن کریم اور نحو کے عظیم عالم اور حدیث نبوی واشعار کے حافظ تھے۔ آپ کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ امام احمد نے لیث کی دس صفاتِ حسنہ کا ذکر کیا۔"

لیث بن سعد باختلاف اقوال ۹۳ھ یا ۹۴ھ میں پیدا ہوئے اور بقول ابن سعد ۱۶۵ھ میں وفات پائی۔ (تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۳، وتہذیب التہذیب ج ۸ ص ۴۵۹)۔

امام شافعی: نام ونسب ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عُبید بن عبد یزید بن ہاشم بن المطّلب بن عبد مناف بن قُصی۔ امام شافعی کا شجرۂ نسب عبد مناف پر جا کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل جاتا ہے۔ سائب بن عُبید غزوہ بدر کے دن مشرف باسلام ہوئے تھے۔ سائب کے

بیٹے شافع صغار صحابہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ امام شافعی کی والدہ قبیلہ آزد سے متعلق تھیں۔

امام شافعی مقام غزہ میں ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ ابھی دو ہی سال کے تھے کہ ان کی والدہ ان کو مکہ لے گئیں۔ آپ وہیں پروان چڑھے اور قرآن کریم پڑھا۔ آپ نے ہذیل کے قبیلہ میں دس سال مقیم رہ کر لغت و شعر میں مہارت حاصل کی۔ مسلم بن خالد زنجی مفتی مکہ اور دیگر ائمہ سے حدیث و فقہ پڑھی۔ پھر وارد مدینہ ہو کر امام مالک کے وابستۂ دامن ہو گئے۔ شافعی کے علم و فضل اور ذہانت و فطانت کی وجہ سے امام مالک ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

شافعی موطا زبانی یاد کر کے امام مالک کو سنایا کرتے تھے۔ امام مالک کو ان کی قراءت بہت پسند تھی۔ اس لیے آپ مزید کی خواہش کا اظہار کرتے۔ جب شافعی مدینہ آئے۔ تو اس وقت ان کی عمر صرف تیرہ برس تھی مصعب بن عبداللہ قرشی قاضی یمن نے امام شافعی کی غربت کی وجہ سے خلیفہ ہارون الرشید کے پاس ان کی سفارش کی۔ ہارون نے یمن کے علاقہ نجران میں آپ کو حاکم مقرر کر دیا۔ حاسدوں نے خلیفہ ہارون سے چغلی کھائی کہ شافعی خلیفہ بننا چاہتے ہیں۔ ہارون نے ۱۸۴ھ میں شافعی کو بغداد طلب کیا۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال تھی۔ امام شافعی اور محمد بن حسن شیبانی شاگرد ابوحنیفہ نے ہارون کی موجودگی میں باہم مناظرہ کیا۔ محمد بن حسن نے امام شافعی کی مدح و توصیف کی۔ ہارون نے بھانپ لیا کہ امام شافعی کا دامن اس تہمت سے پاک ہے۔

محمد بن حسن شیبانی نے امام شافعی کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرایا اور حد درجہ اکرام و احترام بجا لائے۔ امام شافعی نے بقدر ایک بار شتر علم محمد بن حسن سے سن کر تحریر کیا امام شافعی پھر مکہ لوٹ گئے۔ ۱۹۵ھ میں بار دیگر امام شافعی وارد عراق ہوئے۔ اس دفعہ بکثرت علماء آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مثلاً احمد بن حنبل و ابو ثور و حسین

بن علی، کرابیسی و زعفرانی و دیگر ائمہ۔ ان لوگوں نے آپ سے خوب استفادہ کیا۔ امام شافعی نے اپنے قدیم مسلک کے مسائل ان کو املا کرائے۔ آپ پھر مکّہ لوٹ گئے۔ ۱۹۸ھ میں تیسری مرتبہ عراق تشریف لاکر تھوڑی مدت وہاں قیام کیا۔ ۱۹۹ھ کے اواخر میں مصر تشریف لے گئے اور وہیں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔ مصر میں آپ کی علمی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور لوگ دُور دراز سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر حدیث و فقہ کا درس لینے لگے۔ آپ نے تلامذہ کو اپنی جدید کتب لکھوائیں جن میں ان کے جدید مسلک سے متعلق نظریات مرقوم تھے۔ مصریوں نے حینِ حیات و بعد از وفات امام شافعی کے اکرام و احترام کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

امام شافعی وہ تنہا امام تھے جس نے بذاتِ خود اپنے مسلک کو پھیلایا اور بڑھایا آپ نے دُور دراز کے سفر کرکے اہل حجاز و عراق کے علوم سیکھے۔ اپنی کتابیں خود لکھیں اور اپنے اصحاب و تلامذہ کو لکھوائیں۔ دیگر کبار ائمہ میں یہ اوصاف موجود نہیں ہیں۔

حدیث نبوی سے امام شافعی کا شغف : امام شافعی اپنے عصر و عہد میں کتاب وسنت کے سب سے بڑے عالم تھے۔ آپ نے اپنے مذہب میں بڑی تحقیق وتدقیق کے ساتھ تمام دلائل کو یکجا کر دیا تھا۔ آپ کے احسانات اہل الحدیث کے بارِ گردن ہیں۔ وہ شافعی ہی تھے، جس نے ان کو سنت کے معانی سے آگاہ کیا۔ روشن دلائل و براہین کی بنا پر ان کے دشمنوں کو نیچا دکھایا اور ان کو غلبہ عطا کیا۔ اہل الحدیث خوابِ غفلت میں محو تھے۔ امام شافعی نے ان کو جگایا۔ وہ گمنام تھے، امام شافعی نے ان کو اوجِ شہرت پر فائز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی کے متبعین کو "اصحاب الحدیث" کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

امام شافعی ہمیشہ اس بات سے منع کیا کرتے تھے کہ کتاب وسنت کو ترک کرکے

لوگوں کے قیاسات و آراء کو معمول بہ بنایا جائے " آپ فرماتے ہیں۔

" اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ علم الکلام میں کیا قباحت ہے تو وہ اس سے ایسے بھاگیں جیسے شیر سے بھاگتے ہیں۔ متکلمین کے بارے میں میرا فیصلہ یہ ہے کہ ان کو چھڑیوں سے پیٹا جائے۔ ان لوگوں کو قریہ قریہ، گاؤں گاؤں لے جایا جائے اور یہ ندا دی جائے کہ "یہ اس شخص کی سزا ہے جو کتاب و سنت کو چھوڑ کر علم الکلام کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔"

محدث البُوَیطی فرماتے ہیں۔

" میں نے امام شافعی کو یہ فرماتے سنا کہ اصحاب الحدیث کا دامن مت چھوڑو۔ اس لئے کہ وہ سب سے زیادہ درست بات کہنے والے ہیں۔"

امام شافعی فرماتے ہیں۔

" جب میں اصحاب الحدیث میں سے کسی شخص کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں معلوم دیتا ہے کہ میں نے اصحاب رسولؐ میں سے کسی کو دیکھ لیا۔ اللہ اہل الحدیث کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے حضورؐ کے ارشادات کو ہمارے لیے محفوظ رکھا۔ اس لیے ہم ان کے زیر بار احسان ہیں۔ اس ضمن میں امام شافعی کے یہ اشعار مشہور ہیں۔ ؎

۱۔ کل العلوم سوی القرآن مشغلۃٌ — الا الحدیث والا الفقه فی الدین

۲۔ العلم ما کان فیه "قال حدثنا" — وما سوی ذاک وسواس الشیاطین

ترجمہ:۔ ۱۔ تمام علوم قرآن کے سوا وقت کٹی سے زیادہ نہیں۔ بجز حدیث نبوی اور دین کی سمجھ حاصل کرنے کے۔

۲۔ اصلی علم تو وہی ہے جس میں "قال حدثنا" ہو۔ اور اس کے جو کچھ بھی ہے شیطان کا وسوسہ ہے۔

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ خبر واحد جب بروایت ثقات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔ تو امام شافعی اس کو حجت قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی نے خبر واحد کا

زبردست دفاع کیا ہے۔ آپ کی اس تائید و حمایت کو اصحاب الحدیث نے بڑی قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ اہل بغداد امام شافعی کو "ناصر السنّۃ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

امام شافعی کے بارے میں چند اکابر ائمہ کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔

محمد بن حسن شیبانی فرماتے ہیں۔

"اصحاب الحدیث آج جو کچھ بھی کہتے ہیں، وہ امام شافعی کا فرمودہ ہے"۔

امام زعفرانی فرماتے ہیں۔

"اصحاب الحدیث سوئے ہوئے تھے امام شافعی نے ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا"۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

"ہر قلم و دوات پکڑنے والا امام شافعی کا ممنونِ احسان ہے"۔

جب مشہور محدث محمد بن مسلم بن وارہ مصر سے آئے تو امام احمد نے ان سے پوچھا کیا آپ نے امام شافعی کی کتابیں تحریر کی ہیں؟ انہوں نے کہا "نہیں"۔ امام احمد یہ سن کر کہنے لگے "آپ سے بہت بڑی فروگزاشت ہوئی۔ ہم کو مجمل و مفسّر اور ناسخ و منسوخ کا پتہ اس وقت چلا جب ہم امام شافعی کی مجلس میں بیٹھے"۔

محدث ابن خزیمہ سے جب دریافت کیا گیا کہ کیا کوئی ایسی حدیث بھی ہے جو امام شافعی تک نہ پہنچی ہو تو انہوں نے کہا نہیں۔

امام داؤد بن علی ظاہری فرماتے ہیں۔

"امام شافعی جن فضائل سے متصف تھے۔ وہ کسی دوسرے میں جمع نہ ہو سکے۔ آپ نہایت شریف النسب صحیح العقیدہ کریم النفس زبردست ناقد حدیث ناسخ و منسوخ کے جید فاضل حافظ کتاب و سنت سیرتِ خلفاء کے عالم اور بہترین مصنف تھے۔ آپ

کے اصحاب و تلامذہ کثیر التعداد اور نہایت لائق تھے۔"

الکرابیسی کہتے ہیں۔

"جب تک ہم امام شافعی سے نہیں ملے تھے ہمیں معلوم نہ تھا کہ کتاب و سنت اور اجماع کیا چیز ہے۔ میں نے شافعی جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ اور نہ ہی خود شافعی نے اپنے جیسا دوسرا کوئی عالم ملاحظہ کیا۔ میں نے امام شافعی سے بڑھ کر فصیح و بلیغ شخص بھی کبھی نہیں دیکھا۔"

اکابر محدثین و ائمہ مجتہدین کے مذکورہ صدر کلماتِ تحسین و توصیف کے باوصف امام شافعی فرمایا کرتے تھے "جب تمہارے نزدیک کسی حدیث کی صحت ثابت ہو جائے تو میرا قول چھوڑ کر اس حدیث کی جانب رجوع کیجیے۔"

اگر علماء یہ بات کہتے ہیں کہ امام شافعی اولین شخص تھے جس نے اصول الفقہ پر کتاب لکھی تو ہم بڑے وثوق کے ساتھ عرض پرداز ہیں کہ جناب امام اولین مصنّف تھے جس نے اصول حدیث کی طرح ڈالی۔ قوانین روایت پر کتاب تحریر کی اور محدثین کے لیے علوم حدیث کی تالیف و تدوین کی راہ ہموار کی۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ امام شافعی کے بعد حدیث نبوی کے قواعد و علوم پر کتابیں تصنیف کرنے والے امام شافعی کے دست نگر اور ان کے بحر علم سے مستفید ہونے والے ہیں۔ امام شافعی نے علم حدیث کے جو اصول و قواعد مرتب کیے تھے متاخرین نے صرف ان کی شرح و توضیح کی ہے یا ان کی فروعات بیان کی ہیں۔ جو شخص امام شافعی کی کتاب "الرسالۃ" میں حدیث و محدثین سے متعلق ان کی تصریحات پڑھتا ہے۔ پھر متاخرین مثلاً ابن الصلاح وغیرہ کی کاوشوں کا جائزہ لیتا ہے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ان فنون میں امام شافعی سب کے استاد اور پیش رو ہیں۔ فجزاہ عن الحدیث واھلہ خیرالجزاء (البدایہ والنہایہ

ج ۱۰ ص ۲۵۱ و تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۴۴۔ تاریخ التشریع الاسلامی للخضری ص ۲۶۴)۔

مستشرقین کی فریب کاری کا ابطال

پہلی اور دوسری صدی ہجری کی تاریخ حدیث ومحدثین آپ کی نگاہ سے گزر چکی۔آپ دیکھ چکے ہیں کہ علمائے صحابہ وتابعین نہایت ضبط وامانت کے ساتھ احادیث نبویہ باہم نقل وروایت کرتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ شیعہ، خوارج زنادقہ اور ان کے ہمنوا دشمن اسلام فرقوں کی وضع کردہ احادیث کو رد کر کے حدیث نبوی کی حمایت ودفاع کا فریضہ ادا کرتے تھے۔خلاصہ یہ کہ سنّت کی ترویج واشاعت کے سلسلہ میں انہوں نے جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔یہاں تک کہ احادیث نبویہ کو بلا کم وکاست بصورت صحت اطمینان بخش اسانید کے ذریعہ تیسری ہجری کے علما تک پہنچا دیا۔پھر تیسری صدی ہجری کے علمانے حدیث نبوی کی نقل وروایت اور تالیف وتدوین سے متعلق مساعی جمیلہ انجام دیں اور اس طرح احادیث نبویہ پاک وصاف ہونے کی حالت میں ہم تک پہنچ گئیں۔

مگر کفر وضلالت کا حامل ایک مختصر گروہ جس کو "مستشرقین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس بات کو گوارا نہ کر سکا کہ دین اسلام کی یہ مبارک دولت وثروت (حدیث نبوی) ایسے وقت میں تبدیل وتحریف سے محفوظ رہے، جبکہ مسلمان کمزور ہو چکے ہیں۔اور کافر قومیں ان پر غالب آچکی ہیں۔بنابریں مستشرقین نے مسلمانوں کو دین اسلام سے بدظن کرنے کے لئے حدیث نبوی کو ہدف طعن وجرح بنایا۔اس کا نام انہوں نے اپنی اصطلاح میں "آزادانہ بحث ونظر" رکھا۔

مستشرقین نے سیاسی اغراض ومقاصد کے تحت جو طریق کار اختیار کیا تھا۔وہ یہ تھا کہ احادیث صحیحہ کو ضعیف ٹھہرایا جائے۔احادیث ضعیفہ وموضوعہ کو صحیح قرار دیا جائے اور دلائل وبراہین سے آنکھیں بند کر کے ہر معمولی چیز کو اہمیت دی جائے اور

اہم اُمور کو معمولی بنا دیا۔ مستشرقین کے اس دجل و فریب کا مقصد یہ تھا کہ کم عقل اور ضعیف الایمان لوگوں کی نگاہ میں جو ان کی مادی چمک دمک سے متاثر ہو چکے تھے، اسلام کے اوصاف ومحاسن کو مسخ کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اسے چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ اسلام کے بارے میں مستشرقین کا موقف شاعر کے اس شعر کا مصداق ہے۔ ؎

اذا رأوا هفوة طاروا بها فرحًا ... مني وما علموا من صالح دفنوا

(جب وہ میری لغزش کو دیکھتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور جب میری کسی خوبی کا علم ہوتا ہے تو اسے دفن کر دیتے ہیں)۔

اب ہم مشہور منکرِ حدیث علی حسن عبد القادر کی کتاب "تاریخ الفقہ الاسلامی" ص۱۲۱ سے مستشرقین کے پیش کردہ شکوک وشبہات پیش کرتے ہیں، جن سے ان کے عزائم قبیحہ منظرِ عام پر آ جائیں گے اور پھر ان کا ابطال کریں گے۔ اگرچہ غور وفکر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ شکوک بالکل بے وزن ہیں۔ اور ان کی اساس فقط دعویٰ بلا دلیل اور مسلّمہ حقائق سے تغافل پر رکھی گئی ہے، اعتراضات حسب ذیل ہیں۔

اوّل:۔ اکثر احادیث ان دینی، سیاسی اور اجتماعی تغیرات کی پیداوار ہیں۔ جو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں رُونما ہوئے تھے۔ یہ بات درست نہیں کہ احادیث آغازِ اسلام کی قابل اعتماد دستاویز ہیں۔ بخلاف ازیں اگلے تاریخی ادوار میں اسلام کے متعلق جو جہود ومساعی انجام دی گئیں، احادیث بھی اسی جہد وکاوش کا نتیجہ ہیں۔"

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں یہ اُن لوگوں کا قول ہے جو مسلّمہ حقائق سے تجاہلِ عارفانہ اختیار کرنے والے ہوں۔ اور حق وباطل کو مخلوط کر کے یہ بات کہنے کے عادی ہوں کہ یہ سب کچھ باطل ہے۔ یہ لوگ احادیث نبویہ پر دو اعتراض کرتے ہیں۔

۱۔ اکثر احادیث نبویہ مسلمانوں کی اپنی ساختہ پرداختہ ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ نہیں ہیں۔

۲- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیث نہایت کم ہیں۔ مزید برآں عہدِ رسالت کے نزدترین دَور اور خلافت راشدہ میں ان سے احتجاج نہیں کیا جاتا تھا۔

مندرجہ صدر ہر دو نکات سے منکرین حدیث یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ حدیث نبوی کسی صحیح اساس پر مبنی نہیں۔ نیز یہ کہ احادیث نبویہ خواہ قلیل ہوں یا کثیر اور خواہ صحیح ہوں جو نہایت کم ہیں یا ضعیف ہوں جن کی بہتات ہے۔ مسلمانوں کے لیے بے کار ہیں۔ سرے سے ان کی افادیت ہے ہی نہیں۔

جہاں تک منکرین حدیث کے اس زعم باطل کا تعلق ہے کہ اکثر احادیث دینی وسیاسی تغیرات وانقلابات کی پیداوار ہیں تو یہ تاریخ اسلام پر ایک عظیم بہتان ہے۔ اس لیے کہ بکثرت احادیث دینی احکام ومسائل کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ جن کو اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم نے اُن سے سُن کر یاد رکھا۔ پھر ثقہ راوی یکے بعد دیگرے ہر عصر وعہد میں ان سے نقل وروایت کرتے چلے آئے۔ یہاں تک کہ حدیثیں صحیح وسالم صحیح الاسناد والمتن ہونے کی صورت میں ہم تک پہنچ گئیں۔ ائمہ حدیث تمام عصور وازمنہ میں احادیثِ نبویہ کو کذب کی آمیزش سے پاک کرنے اور ان کے حفظ وضبط میں مبالغہ کی حد تک اہتمام کرتے رہے ہیں۔ وہ متون واسانید کی نقد وجرح اور چھان پھٹک میں اس لیے سختی سے کام لیا کرتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث متواتر میں ارشاد فرمایا ہے۔

"جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر جہنم میں بنا لے!"

یہ محدثین ہی کی مساعی جمیلہ کا خوش گوار نتیجہ تھا کہ احادیث نبویہ خوارج وزنادقہ اور ان کے ہمنواؤں کی دروغ بافی سے محفوظ رہیں۔ احادیث رسولؐ کے ضمن میں پہلی اور دوسری صدی ہجری کے علماء نے جس جانفشانی وعرق ریزی سے کام لیا تھا قبل ازیں آپ اس کی ایک جھلک ملاحظہ کر چکے ہیں۔

مستشرقین ومنکرین کا یہ دعویٰ کہ حدیث نبوی دین میں قابل اعتماد حجت نہیں ہے، ایک

زعم باطل سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اوران سے پہلے سابقہ عصور وازمنہ کے ارباب بدعت بھی اس بات کی رٹ لگاتے چلے آئے ہیں۔ مزید برآں کتاب وسنت علما کے اجماع اور ازمنہ سابقہ کے جمہور اہل اسلام کے تعامل سے بھی اس بے بنیاد دعویٰ کی تردید ہوتی ہے کتاب ہذا کے مقدمہ میں ہم حدیث نبوی کی حجیت دلائل قاطعہ سے ثابت کرچکے ہیں۔ امام شافعی اور منکر حدیث کے مناظرہ میں بھی کافی مواد موجود ہے۔

دوم :۔ منکرین حدیث کہتے ہیں۔

"عصر اول میں بنو امیہ اوران ارباب تقویٰ علماء کے مابین تنازعات بپا تھے جو احادیث کی جمع وتالیف میں لگے ہوئے تھے۔ جب ان اربابِ علم نے دیکھا کہ جو احادیث قبل ازیں ان کے یہاں موجود ہیں، ان سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تو انہوں نے اہل بیت کی مدح وتوصیف میں ایسی حدیثیں وضع کرنا شروع کردیں جو بظاہر اسلامی روح کے منافی نہ تھیں۔ اس طرح انہوں نے بنو امیہ کی مذمت کا بیڑا اٹھایا۔ اگرچہ وہ براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ تھا۔ انہوں نے اپنے اس فعل کی یہ توجیہ کی کہ وہ ظلم وجور کے خلاف نبرد آزما تھے۔

بنو امیہ کی طرف سے اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ انہوں نے ایسے لوگوں کی تردید کے لیے حدیثیں گھڑنے کا حکم صادر کردیا۔ بنو امیہ کے طرز عمل کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے کہی تھی کہ حضرت علیؓ کو برا بھلا کہنے اور حضرت عثمان کے لیے رحمت طلب کرنے میں کوتاہی سے کام نہ لیجیے۔ حضرت علیؓ کی مدح میں وارد شدہ احادیث کی مخالفت کیجیے اور حضرت عثمان اوران کے رفقا کی مدح و ستائش کیجیے۔ ان کو اپنا مقرب بنائیے اوران کی بات توجہ سے سنیے۔

وضع حدیث کے سلسلہ میں بنو امیہ نے امام زہری جیسے لوگوں سے کام لیا تھا۔ ان خود ساختہ احادیث میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے کہ" اہتمام کے ساتھ سفر صرف تین مسجدوں کی

جانب کیا جائے (۱) مسجد نبوی (۲) مسجد حرام (۳) مسجد اقصیٰ۔ اس حدیث سے بنو اُمیّہ کے سیاسی رجحانات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ بیت المقدس کو خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کا درجہ دینے کے متمنّی تھے۔ چونکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اہل شام کو خانہ کعبہ کا حج کرنے سے روک دیا تھا۔ اس لیے بنو امیہ چاہتے تھے کہ لوگ خانہ کعبہ کی بجائے بیت المقدس کا حج کرنے آیا کریں اسی طرح بنو اُمیّہ نے بیت المقدس اور شام کی مدح میں حدیثیں وضع کی تھیں۔" (منکرین حدیث کا اعتراض ختم ہوا۔

ہم مذکورہ صدر اعتراض کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں کہ بنو امیہ اور شیعہ میں سیاسی تنازعات بپا تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ شیعہ نے حضرت علیؓ کے مناقب میں حدیثیں وضع کیں اور ردِ عمل کے طور پر بنو امیہ نے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہم کی مدح و توصیف میں حدیثیں وضع کرائیں۔ مگر حدیثیں وضع کرنے والے فریقین نہ محدث تھے نہ اہل تقویٰ علما میں سے تھے۔ جس طرح یہ ملمع ساز منکرین کہتے ہیں۔

اصحاب تقویٰ علماء تو امام زہری، سعید بن المسیب، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم جیسے لوگ تھے۔ جو احادیث صحیحہ کی حفاظت وصیانت اور ان کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جو احادیث جھوٹ موٹ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کی گئی ہیں، ان کا راز افشا کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ایسی احادیث کی نقل و روایت شرعاً درست نہیں۔ ایسا کرنے میں وہ نہ کسی کی ملامت کی پروا کرتے تھے اور نہ کسی ظالم سے خائف و ہراساں تھے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مستشرقین حدیثیں وضع کرنے والے شیعہ کو "اصحاب تقویٰ علماؔ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ شیعہ فساد کی جڑ بنیاد تھے۔ وہ اہل بیت کی محبت کا مظاہرہ کرتے اور اس میں اس حد تک غلو کرتے تھے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کو الوہیت کے مقام پر فائز کر دیا تھا۔ اور اس کے اثبات کے لیے حدیثیں وضع کیں۔ یہ دل سے اسلام اور

اہل اسلام کے سخت دشمن تھے۔

حضرت معاویہؓ کی جانب جو بات انہوں نے منسوب کی ہے اور اسی طرح واقعات کی نقل وروایت میں سہل انگاری سے کام لینے والے مورخین ان کی شان میں جو کچھ کہتے ہیں، ہماری نگاہ میں مشکوک ہے۔ اس لیے کہ امیر معاویہؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ وحی کے لیے منتخب کیا تھا اور تینوں خلفائے راشدین نے آپ کو ملک شام کی امارت تفویض کی تھی۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے مابین جو نزاع و جدال برپا ہُوا وہ اجتہاد پر مبنی تھا۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ امیر معاویہؓ حضرت مغیرہ کو حکم دیتے کہ وہ حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہیں اور ان کی مدح میں وارد شدہ احادیث کو چھپائیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ حضرت حسن بن علیؓ بخوشی خاطر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے تھے اور ایک دن بھی ان کے خلاف نبرد آزما نہ ہوئے۔ آپ حضرت علیؓ کے لیے رحمت کی دعا کیا کرتے تھے۔ روایات میں منقول ہے کہ امیر معاویہؓ نے ضرار صدائی سے حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کرنے کو کہا۔ ضرار نے معذرت چاہی جو حضرت معاویہ نے قبول نہ کی۔ ضرار نے تفصیلاً حضرت علیؓ کے اوصاف ومحاسن پر روشنی ڈالی۔ حضرت معاویہ یہ سن کر رو پڑے اور کہا "اللہ تعالیٰ ابوالحسن (حضرت علیؓ کی کنیت) پر رحم فرمائے۔ وہ دراصل ایسے ہی تھے۔" تاریخ اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے کہ حضرت معاویہؓ بڑے بُردبار اور روشن خیال سیاست دان تھے۔ ان تمام اُمور کی موجودگی میں یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ امیر معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ یا کسی اور کو ایسی فتنہ پردازی کا مشورہ دیا ہو جس سے اُمت مسلمہ کی وحدت پارہ پارہ ہوجاتی اور اس کا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔

باقی رہا مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ بنوامیہ نے اپنے سیاسی اغراض کے پیش نظر حدیثیں وضع کرنے کے سلسلہ میں امام زہری جیسے لوگوں کو استعمال کیا تھا۔ تو یہ ائمہ دین پر ایک عظیم

افتراء ہے جس کی کوئی سند موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امام زہری کے زہد و درع اور حفظ و ضبط کے بارے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں جید علما نے شہادت دی ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں۔

"اگر زہری نہ ہوتے تو مدینہ سے حدیثیں رخصت ہو جائیں۔"

احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہَوَیہ کا قول ہے۔

"اصح الاسانید زہری از سالم از والدِ خود ہے"

عمرو بن دینار فرماتے ہیں۔

"میں نے زہری سے بڑھ کر حدیث روایت کرنے والا نہیں دیکھا۔"

ان کا دوسرا قول یہ ہے۔

"میں نے زہری سے بڑھ کر ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس کی نگاہ میں روپیہ پیسہ کی کوئی وقعت نہ ہو۔ زہری درہم و دینار کو اونٹ کی مینگنیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔"

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم چند بے انصاف ائمہ کفر کی باتوں میں آکر امام زہری کے بارے میں مذکورہ صدر شہادتوں کو نظر انداز کر دیں؟

جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ حدیث نبوی "لا تشدوا الرجال الا الیٰ ثلاثۃ مساجد" (تین مسجدوں کے سوا کسی اور طرف اہتمام کے ساتھ سفر نہ کیا جائے) امام زہری نے بنوامیہ کی خوشنودی کے لیے وضع کی تھی، تو یہ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ اس لیے کہ زہری باجماعِ ائمہ کرام ثقہ راوی تھے۔ اگر وہ اس حدیث کے روایت کرنے میں منفرد بھی ہوتے تو بھی اس کی صحت میں کوئی شبہ نہ ہوتا۔ حالانکہ وہ اس کی نقل و روایت میں منفرد نہیں ہیں۔ امام مسلم نے امام زہری کے علاوہ دوسری سند کے ساتھ حضرت

ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سفر صرف تین مسجدوں کی جانب کیا جاتا ہے۔ (۱) مسجد کعبہ (۲) مسجد نبوی (۳) مسجد اقصیٰ"۔ (صحیح مسلم کتاب الحج)۔

امام بخاری ومسلم نے زُہری کے علاوہ دوسری سند کے ساتھ حضرت ابوسعید خُدریؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کوئی عورت دو دن کا سفر اس صورت میں اختیار کرے جب اس کے ساتھ اس کا خاوند یا محرم ہو۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ نہ رکھا جائے نماز فجر کے بعد اس وقت تک کوئی نماز نہ پڑھی جائے جب تک آفتاب طلوع نہ ہو۔ اسی طرح عصر کے بعد قبل از غروب آفتاب کسی نماز کی اجازت نہیں۔ نیز فرمایا اہتمام کے ساتھ سفر صرف تین مسجدوں کی جانب کیا جائے (۱) مسجد الحرام (۲) مسجد نبوی (۳) مسجد اقصیٰ۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۴۶)۔

مزید براں ہم یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ صدر حدیث کا لوگوں کو حج کعبہ سے ہٹا کر بیت المقدس کی جانب متوجہ کرنے سے کیا تعلق ہے؟ اس حدیث سے تو صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے کی نیت سے اس کے لیے سفر کا اہتمام نہ کیا جائے بجز ان تین مساجد کے۔ اس سے ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔ مستشرقین اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ خانہ کعبہ کی جانب رُخ کرنے سے پہلے مسلمان آغاز اسلام میں بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عہد رسالت اور اس وقت سے جب نماز فرض ہوئی، بیت المقدس کا احترام کرتے چلے آئے ہیں۔ مستشرقین مندرجہ ذیل آیت کریمہ کے بارے میں کیا کہیں گے جس میں فرمایا۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ۔ (الاسراء)	اللہ کی ذات پاک ہے جس نے اپنے بندے کو رات میں خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ کی سیر کرائی۔ جس کے گرد و نواح میں ہم نے برکت کی ہے۔

اگر بنو اُمیہ بیت المقدس کی فضیلت کے اثبات کے لیے دلائل کے محتاج ہوتے تو ان کے لیے یہی ایک آیت کافی تھی۔ کیا یہاں بھی مستشرقین یہ بات کہیں گے کہ یہ آیت زہری کی من گھڑت ہے؟ "سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ"

اس بات سے مجال انکار نہیں کہ بنو امیہ اور علویہ اور بعض مقامات کی مدح وستائش میں حدیثیں وضع کی گئیں۔ مگر ہم اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ ان کے وضع کنندگان صاحبِ تقویٰ علماء تھے۔ جیسا کہ مستشرقین کا دعویٰ ہے۔ اسی طرح یہ بھی سفید جھوٹ ہے کہ ائمہ حدیث ان موضوعات کو دیکھ کر خاموش رہے تھے۔ حالانکہ محدثین نے احادیث کی نقد وتمحیص اور چھان پھٹک میں جو جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔

سوم:۔ مستشرقین کہتے ہیں۔

"صرف یہی نہیں کہ سیاسی اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے حدیثیں وضع کی گئیں بلکہ عبادات میں بھی وضع احادیث کا آغاز ہوا۔ جیسا کہ عام طور سے مشہور ہے کہ نماز جمعہ کے دو خطبے ہوا کرتے تھے۔ اور خلفا کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ عید کا خطبہ نماز عید کے بعد دیا جاتا تھا۔ بنو امیہ نے اس میں یہ تبدیلی پیدا کی کہ خلیفہ دوسرا خطبہ بیٹھ کر دینے لگا۔ اسی طرح اموی خلفاء عید کا خطبہ نماز سے پہلے دینے لگے۔ اس کی دلیل میں وہ رجا بن حیوہ کی یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ رسول کریم اور خلفائے راشدین بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب کہ حضرت جابر بن سمرہ روایت کرتے ہیں کہ جو شخص تمہیں یہ بات کہے کہ رسولِ کریم بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ اس نے جھوٹ بولا۔ اسی طرح امیر معاویہؓ نے منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کر دیا۔ اور مسجد کے ساتھ ایک حجرہ تیار کر لیا تھا۔ جس کو بعد میں عباسیوں نے مسمار کیا۔ صرف یہی نہیں کہ سیاسی مقصد براری کے لیے حدیثیں گھڑی گئیں بلکہ جن احادیث سے مخالفین کی تائید ہوتی تھی، ان کو چھپایا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بنو امیہ کی تائید وحمایت اور مدح وستائش سے متعلق جو احادیث تھیں وہ عباسی خلافت میں ناپید ہو گئیں۔"

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وضعِ حدیث کا سلسلہ سیاسی نظریات سے تجاوز کر کے عبادات تک پہنچ گیا تھا۔ مگر وضعِ حدیث کا ارتکاب کرنے والے علمائے ملت اور ائمہ حدیث نہ تھے۔ بخلاف ازیں یا تو وہ زنادقہ تھے جو در پردہ دین اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اور یا ارباب بدعت تھے اور ان کا مقصد گمراہ لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا یا جاہل تھے۔ جن کے دل ایمان و اخلاص سے یکسر عاری تھے۔ جہاں تک علماء کا تعلق ہے وہ بلا خوفِ ملامت اُمّت کی خیر خواہی کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ وہ حق کا بول بالا کرتے تھے اور حق کا بول بالا کرنے کے آرزومند تھے۔

مستشرقین نے جو شواہد و دلائل پیش کیے ان سے ان کا مقصد ثابت نہیں ہوتا۔ تاریخ اسلام اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے کہ بعض خلفاء نے جو مسجد میں حجرہ بنایا تھا یا عید کا خطبہ نماز سے پہلے دیا یا خطبہ جمعہ بیٹھ کر دیا، وہ اس لیے نہ تھا کہ ان امور کے اثبات کے لیے انہوں نے خود حدیثیں وضع کر لی تھیں یا لوگوں سے وضع کروالی تھیں۔ بلکہ یہ امر یا تو ان کے اجتہاد پر مبنی تھا۔ یا کسی عذر کی بنا پر۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا اجتہاد صحیح ہو یا غلط۔

امام شعبی فرماتے ہیں سب سے پہلا شخص جس نے بیٹھ کر خطبہ دیا وہ امیر معاویہ تھے۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ موٹے ہو گئے اور پیٹ بڑھ گیا تھا۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۴۳)۔

ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں "جس شخص نے مسجد میں سب سے پہلے حجرہ بنایا وہ حضرت معاویہؓ تھے اور یہ اس وقت کیا جب ایک خارجی نے آپ پر ایسا وار کیا جس سے آپ بمشکل جانبر ہو سکے۔" (مقدمہ ابن خلدون ص ۲۹۹)

طارق بن شہاب بیان کرتے ہیں کہ اولین شخص جس نے عید کے دن نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، وہ مروان تھا۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا خطبہ سے پہلے نماز پڑھ لیجیے۔

مروان نے کہا "وہ باتیں اب متروک ہو چکی ہیں"۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو سعید خُدری فرمانے لگے اس شخص نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جو شخص بُرا کام ہوتا دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے منع کرے اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں بُرا محسوس کرے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے" (صحیح مسلم کتاب الایمان)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو حجرہ بنایا یا بیٹھ کر خطبہ دیا تھا وہ بنا بر عذر تھا۔ اس لیے نہیں کہ انہوں نے اس ضمن میں احادیث گھڑ لی تھیں یا دوسروں سے وضع کروائی تھیں۔ مروان بن حکم نے بذات خود اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ مسنون طریقہ یہی ہے کہ خطبہ سے پہلے نماز عید ادا کی جائے۔ مگر وہ اپنے اجتہاد کی بنا پر پہلے خطبہ دیتا تھا تاکہ لوگ نماز پڑھ کر خطبہ سننے سے قبل گھروں کو چلے نہ جائیں۔ مروان نے اس ضمن میں کسی حدیث سے استدلال نہیں کیا تھا۔ بخلاف ازیں اس کا استدلال یہ تھا کہ لوگوں کے حالات وہ نہیں رہے جو عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں تھے۔ اس کے باوجود لوگوں نے مروان کے فعل کو ناپسند کیا تھا۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ جس شخص نے مروان کو خطبہ سے پہلے نماز ادا کرنے کی تلقین کی، اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ کیونکہ مروان کو وہ ہاتھ سے نہیں روک سکتا تھا۔ اس لیے اس نے زبان سے منع کیا۔ پھر لوگوں کی موجودگی میں جب کہ مروان بھی سن رہا تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی۔

مستشرقین کا یہ قول کہ رجا بن حیوہ نے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے، ایک ایسا جھوٹا دعویٰ ہے جس کا مستشرقین کے دماغ کے سوا کہیں وجود ہی نہیں۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ رجا بن حیوہ جیسا محدث جلیل صحابہ و تابعین کی رُوبرو ایک ایسا جھوٹ تصنیف

کرے جو واقعہ کے خلاف ہو۔ اور حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ پھر بھی محدثین اس کو ثقہ راوی اور حدیث نبوی کا ایک رکن رکین قرار دیں۔

بنو امیہ اور بنو عباس کے مابین جو سیاسی رقابت پائی جاتی تھی، ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے بعض احادیث کے پوشیدہ رہنے اور بعض کے ظاہر ہونے میں مدد ملی ہو۔ مگر ہم اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کی ذمہ داری کا بوجھ محدثین اور قابل اعتماد حفاظِ حدیث پر ڈالا جائے۔ اس لیے کہ یہی لوگ تھے جنہوں نے حدیث نبوی کی صیانت وحفاظت کے سلسلہ میں خدمات جلیلہ انجام دیں۔ اور اس کے تحفظ و دفاع کے لیے سینہ سپر ہوئے۔ انہوں نے حدیث نبوی سے کذب و دروغ کو دُور کرنے کی مقدور بھر سعی کی۔ اور جو حدیث بھی ان تک پہنچی اس کو ہرگز چھپایا نہیں۔ خواہ ایسا کرنے میں ان کو کس قدر بھی ظلم وجور کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ تاریخ اسلام ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ وہ حق گوئی میں حد درجہ بے باک تھے۔ حکام کے سامنے نہایت جری وشجاع تھے۔ مصائب و آلام میں حد درجہ صابر، خوفِ خدا سے ترساں ولرزاں رہنے والے اور کتاب وسنت کے ساتھ حد درجہ شغف رکھنے والے تھے۔ ان کی جرأت اور حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ جب کسی خلیفہ کے بارے میں پتہ چلتا کہ وہ رسول کریم اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل کی خلاف ورزی کر رہا ہے تو وہ کئی کئی راتیں پاپیادہ چلتے رہتے اور جاکر خلیفہ کو اس سے باز رکھتے۔

چہارم: مستشرقین کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اکثر احادیث پہلی اور دوسری صدی ہجری میں وضع کی گئیں۔ وہ اس کی تائید میں علمائے جرح وتعدیل کے مندرجہ ذیل اقوال پیش کرتے ہیں۔

عاصم بن نبیل متوفی ۲۱۲ھ فرماتے ہیں۔

"صالح لوگ جتنا جھوٹ احادیث روایت کرنے میں بولتے ہیں اور کسی بات میں

نہیں بولتے۔"

یحییٰ بن سعید القطان کا قول بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ یزید بن ہارون کا قول ہے "میرے زمانہ میں کوفہ کے تمام محدثین ایک کے سوا سب مُدلّس ہیں۔ حتیٰ کہ سفیان ثوری اور سفیان عُیینہ کو بھی مدلّسین میں شمار کیا گیا ہے۔"

مستشرقین کہتے ہیں کہ دوسری صدی ہجری کے مسلمان اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ کسی حدیث کی صحت کا انحصار اس کی ظاہری شکل یعنی اسناد پر تھا۔ حالانکہ بعض احادیث سند کے اعتبار سے نہایت صحیح ہوتی ہیں مگر متن کے لحاظ سے موضوع ہیں۔

مستشرقین اس کی تائید میں مندرجہ ذیل حدیث پیش کرتے ہیں۔

"میری طرف سے منقول ہو کر بہت سی احادیث تم تک پہنچیں گی۔ لہذا جو شخص تمہارے پاس حدیث بیان کرے، اسے کتاب اللہ پر پرکھ کر دیکھ لیا کرو۔ اگر اس کے مطابق ہو تو میری ہی فرمودہ سمجھو، خواہ میں نے بیان کی ہو یا نہ کی ہو۔"

جب وضع حدیث کا چرچا ہوا تو اس وقت یہ حدیث عام طور سے پھیلی ہوئی تھی۔

مستشرقین کہتے ہیں کہ قابل اعتماد احادیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ (مثلاً) امام مسلم حضرت عبداللہ بن عمر رض سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شکاری کتے اور مویشیوں کی حفاظت کے لیے پالتو کتے کے سوا تمام کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عمر رض کو پتہ چلا کہ ابوہریرہ رض اس حدیث میں "او کلب زرع" (کھیتی کی حفاظت کے لیے جو کتا ہو اس کو بھی نہ مارا جائے) کے الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت ابن عمر رض نے کہا کہ "اس لیے کہ ابوہریرہ رض کی زمین تھی، جس میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔" ابن عمر رض کے تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راویانِ حدیث ذاتی غرض کی بنا پر احادیث میں اس قسم کا اضافہ کر لیا کرتے تھے۔ (مستشرقین کا اعتراض ختم ہوا)

مستشرقین کے مندرجہ صدر بیان سے ان کے اس دعویٰ کا پتہ چلتا ہے کہ اکثر

احادیث نبویہ پہلی اور دوسری صدی ہجری کے علما کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ وہ اس کے اثبات میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ نیک اور دین دار لوگ حدیث نبوی میں دروغ گوئی کے عادی تھے۔ جیسا کہ عاصم بن نبیل نے کہا۔

۲۔ بقول یزید بن ہارون اکثر محدثین روایت حدیث میں تدلیس سے کام لیتے تھے۔

۳۔ بعض احادیث جید الاسناد ہیں۔ مگر محدثین ان کو موضوع خیال کرتے ہیں۔

۴۔ احادیث کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا جائے۔

۵۔ حضرت ابن عمرؓ کا اعتراف کہ حضرت ابو ہریرہ نے حدیث نبوی میں "او کلب زرع" کا اضافہ کر دیا تھا۔

اب ہم مستشرقین کے مزعومہ دلائل کا جواب دیتے ہیں۔

۱۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ محدثین نے بعض صالح اور دین دار لوگوں کی مرویات کو رد کر دیا تھا تو اس کی وجہ حدیث نبوی میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط اور مصنوعی احادیث کی نفی تھی۔ محدثین کے نزدیک صرف یہ بات کافی نہیں کہ حدیث کا راوی صالح اور نیک چلن ہو۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا حافظ و ضابط اور بیدار مغز ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ صالح شخص جب ناقد حدیث نہ ہو تو وہ ظاہری شکل و صورت سے متاثر ہو کر جھوٹے راویوں کی روایت کردہ احادیث کو قبول کرے گا۔ بعض دفعہ حافظہ کی خرابی بھی حدیث میں غلطی کی موجب ہو جاتی ہے۔

۲۔ تدلیس کو حدیث میں دروغ گوئی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ مستشرقین نے سمجھا ہے۔ تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جو علمائے حدیث تدلیس کیا کرتے تھے۔ وہ حدیث میں دروغ گوئی کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ علمائے حدیث کے

کے نزدیک تدلیس کی دو قسمیں ہیں۔

قسم اول۔ تدلیس الاسناد:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محدث ایک ایسے راوی سے حدیث روایت کرے جس سے وہ مل چکا ہو۔ مگر وہ حدیث اس نے براہ راست اس سے سُنی نہ ہو۔ مگر اس کے الفاظ سے یہ وہم پڑتا ہو کہ اس نے یہ حدیث اس سے سُنی ہے۔ یا ایسے معاصر سے روایت کرے جس سے ملا نہ ہو۔ مگر اس کے الفاظ سے یہ وہم پڑتا ہو کہ وہ اس سے مل کر حدیث کا سماع کر چکا ہے۔ اس قسم کی حدیث روایت کرتے وقت راوی "اخبرنا فلانٌ و حدّثنا فُلانٌ" یا اس سے ملتے جُلتے الفاظ نہیں بولتا اس لیے کہ یہ صریح کذب ہے۔ جب راوی نے اپنے استاد سے حدیث کا سماع بذاتِ خود کیا ہی نہیں تو وہ ایسے الفاظ کیوں کر ادا کر سکتا ہے جو واضح سماع کی صورت میں بولے جاتے ہیں۔ البتہ راوی "قال فلانٌ او عن فلانٍ" یا اس سے ملتے جلتے الفاظ کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے الفاظ میں اس بات کی صراحت نہیں کہ اس استاد سے یہ حدیث سُنی ہے۔

قسم دوم۔ تدلیس الشیوخ:۔ تدلیس کی اس قسم کا مطلب یہ ہے کہ راوی اپنے شیخ سے ایک حدیث روایت کرے جو اس نے بذاتِ خود اس سے سنی ہو۔ مگر وہ اپنے استاد کا ایسا نام یا کنیت یا وصف بیان کرے جس کے ساتھ وہ مشہور نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص ابوداؤد سجستانی صاحب سنن سے روایت کرے اور کہے "حدثنا ابو عبداللہ" حالانکہ ابوداؤد اس کنیت کے ساتھ مشہور نہیں ہے۔

علمائے حدیث تدلیس کی دونوں قسموں کو ناپسند کرتے اور کہتے ہیں کہ ثقہ راوی کو اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ احتراز کرنے سے اس کی مرویات زیادہ قابل اعتماد ہوں گی۔ مگر قسم اول کو محدثین زیادہ ناپسندیدہ خیال کرتے ہیں۔ تاہم ان کے نزدیک تدلیس کی بنا پر ثقہ راوی کو مجروح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ البتہ وہ مدلسین کی

روایات کو احتیاط کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ مدلس راوی مبہم الفاظ کے ساتھ روایت کرے اور سماع و اتصال کی تصریح نہ کرے تو محدثین کے نزدیک اس حدیث کا مرتبہ "منقطع" روایت کے مساوی ہے۔ اور جہاں اتصال کی تصریح کر دے۔ مثلاً کہے "سمعت و حدثنا و اخبرنا" اور اس قسم کے الفاظ استعمال کرے تو وہ حدیث مقبول ہوگی۔ اور اس سے احتجاج کیا جائے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تدلیس کذب نہیں بلکہ اس کے ذریعے دوسرے کو اس وہم میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ راوی نے یہ حدیث اپنے شیخ سے سُنی ہے۔ الفاظ میں بھی اس کی گنجائش ہوتی ہے۔ مُدلِس راوی اگر ایک دفعہ بھی تدلیس کا ارتکاب کرے تو اسے مُدلِس کہا جائے گا۔ امام شافعی کا قول یہی ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح)۔

مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ تدلیس اور کذب میں فرق ہے نیز یہ کہ علما مُدلِس راوی کی روایات کو قبول کرتے ہیں بشرطیکہ ثقہ ہو اور صراحۃً ایسے الفاظ کہے جن سے سماع ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً "حدثنا یا اخبرنا یا سمعتُ" وغیرہ قسم کے الفاظ کہے۔ جب راوی گول مول اور مبہم الفاظ استعمال کرے تو محدثین اس کی روایت کو قبول کرنے میں توقف سے کام لیتے ہیں۔ پھر مستشرقین کی یہ بات کیوں کر درست ہے کہ اکثر احادیث علما کی وضع کردہ ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمودہ نہیں ہیں۔ "ھٰذا بُھتانٌ عظیمٌ"۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ محدثین کرام تدوین حدیث کے ہر دَور میں مُدلِس راویوں کی جانب خصوصی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ چنانچہ تدلیس پیشہ راوی جن دیار و بلاد میں سکونت گزیں تھے وہ ان کا حال بیان کرتے اور ان کا نام و مقام ذکر کرکے ان کو ممیز و ممتاز کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مثلاً امام حاکم فرماتے ہیں۔

"سرزمین حجاز، حرمین، مصر، خراسان، اصبہان اور بلادِ فارس و خوزستان اور

ایشیا ئے کوچک کے رہنے والے روایت میں تدلیس سے کام نہیں لیتے۔ ان کے ائمہ حدیث میں ایک بھی ایسا نہیں جو مُدلّس ہو۔ اہل کوفہ تدلیس میں بہت بدنام ہیں اور اکثر راوی تدلیس پیشہ ہیں۔ اہل بصرہ میں کوئی شاذ و نادر ہی مُدلّس ہو گا۔ بغداد میں بکثرت محدثین تھے۔ یہاں امام حاکم نے ان کے اسمائے گرامی اور ان کے طبقات پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر ان میں سے ابوبکر محمد بن محمد بن سلیمان باغندی واسطی کے سوا کوئی بھی مُدلّس نہیں ہے۔ اگر اہل بغداد نے کسی مُدلّس سے روایت کی ہے۔ تو وہ صرف یہی صاحب ہیں" (معرفۃ علوم الحدیث حاکم ص ۱۱۱)

مندرجہ صدر حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ محدثین نے جملہ بلاد و امصار کے رُواۃ و رجال کی چھان پھٹک اور تلاش و طلب میں کس قدر مساعیٔ جمیلہ انجام دی تھیں اور سعی و کاوش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

۳۔ باقی رہی یہ بات کہ علمائے حدیث بکثرت صحیح الاسناد احادیث کو بھی موضوع قرار دیتے ہیں۔ تو یہ ان کی امانت و دیانت اور حد درجہ حفظ و ضبط اور بیدار مغزی کی دلیل ہے ان سے اس بات کی توقع نہیں کی جاتی کہ وہ جہلا اور گمراہ لوگوں کی طرح ایک حدیث خود وضع کر کے اس کو صحیح سند کے ساتھ چپکا دیں۔ اور لوگوں کو تاثر دینے کی کوشش کریں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اس سے مستشرقین کے دعویٰ کا ابطال ہوتا ہے۔

۴۔ مستشرقین کا یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے کہ محدثین کسی حدیث کی سند کو دیکھے بغیر اس کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر کس کر دیکھتے تھے۔ اور اس کی دلیل میں مذکورہ صدر حدیث پیش کرتے تھے کہ "میری حدیث کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیا کرو"۔ اس سے مستشرقین اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ اکثر و بیشتر احادیث علماء کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ حالانکہ محدثین کرام کے نزدیک احادیث کی مقبولیت کا معروف طریقہ یہ ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہوں اور اس کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ حدیث کا متن بھی شذوذ اور علت سے پاک ہو۔ حدیث کی صحت کے لیے

صرف سند کا جید ہونا کافی نہیں۔ بلکہ متن کی درستی وصحت بھی ضروری ہے۔ اسی طرح متن کی صحت اس وقت تک معتبر نہیں جب تک وہ حدیث صحیح الاسناد نہ ہو۔ باقی رہی حدیث "سیکثر التحدیث عنی فمن حدث تکم بحدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ" تو یہ ائمہ حدیث کے نزدیک اجماعاً باطل ہے۔ اس کو زنادقہ نے وضع کیا تھا تاکہ وہ اپنی وضع کردہ احادیث کو جاہل عوام میں مقبول بنا سکیں۔

۵۔ مستشرقین کی یہ بڑی ڈبل غلطی اور رسوا کن جھوٹ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث نبوی میں "او کلب زرع" کے الفاظ ذاتی مصلحت کی بنا پر اپنی طرف سے بڑھا دیئے تھے۔

صحیح یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول حضرت ابوہریرہؓ کی تائید ہے تردید نہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ ابن عمرؓ بعد ازاں خود بھی اس حدیث کو ابوہریرہؓ کی طرح روایت کیا کرتے تھے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ "او کلب زرع" کے الفاظ روایت کرنے میں حضرت ابوہریرہؓ منفرد نہیں ہیں۔ بخلاف ازیں صحابہ کرام میں سے عبداللہؓ بن مُغَفَّل اور سفیانؓ بن ابی زُہَیر نے اس کو حضرت ابوہریرہؓ کی طرح روایت کیا ہے۔

امام نَوَوِی شرحِ صحیح مسلم میں فرماتے ہیں۔

"حضرت ابن عمرؓ کا یہ ارشاد کہ "ابوہریرہؓ کھیتی باڑی کرتے تھے" ابوہریرہؓ کی توہین نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ابن عمرؓ ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث میں شک وشبہ کا اظہار کرنے چاہتے تھے۔ بخلاف ازیں حضرت ابن عمرؓ یہ کہنا چاہتے تھے کہ چونکہ ابوہریرہ کسان تھے۔ اس لیے انہوں نے "اِلّا کلب زرع" کے الفاظ کو خصوصی طور سے نوٹ کیا اور اچھی طرح ذہن نشین کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کا کسی بات سے عملی تعلق ہوتا ہے۔ جس طرح وہ اس بات کو محفوظ رکھتا ہے دوسرا نہیں رکھ سکتا۔ امام مسلم نے "اِلّا کلب زرع" کا اضافہ بروایت ابن مُغَفَّل وسفیان بن ابی

زہیر از رسول کریمؐ بھی نقل کیا ہے۔ مزید برآں امام مسلم نے یہ زائد الفاظ بروایت ابن الحکم از ابن عمرؓ بھی ذکر کیے ہیں۔ ابن الحکم کا نام عبدالرحمٰن بن ابی نُعیم البجلی ہے۔ ممکن ہے کہ جب حضرت ابن عمرؓ نے یہ زائد الفاظ ابوہریرہ سے سنے ہوں اور ان پر واضح ہو گیا ہو کہ یہ الفاظ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ ہیں تو وہ خود بھی یہ الفاظ روایت کرنے لگے ہوں۔ اور ابن عمرؓ نے اس حدیث میں جو وہ ان الفاظ کے بغیر روایت کیا کرتے تھے، ان الفاظ کا اضافہ بھی کر لیا ہو۔

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو یاد آ گیا ہو کہ انہوں نے یہ الفاظ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے تھے۔ مگر انہیں یاد نہ رہے اور اس لیے انہوں نے ترک کر دیے۔ دوبارہ یاد آنے پر وہ اس اضافہ کو روایت کرنے لگے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس زیادت کی نقل و روایت میں حضرت ابوہریرہ منفرد نہیں ہیں بلکہ صحابہ کی ایک جماعت اس اضافہ کو رسول کریمؐ سے روایت کرنے میں ان کی ہمنوا ہے۔ اگر بفرض محال ابوہریرہؓ تنہا بھی یہ الفاظ روایت کرتے تو ان کی زیادت محدثین کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہوتی"۔ (شرح صحیح مسلم ج ۶ ص ۲۵۴ از حاشیہ قسطلانی)

پانچواں دور

حدیث نبوی تیسری صدی ہجری میں

یہ دَور مندرجہ ذیل چار مباحث پر مشتمل ہے۔

۱۔ محدثین و متکلّمین کے مابین نزاع اور حدیث پر اس کے اثرات۔

۲۔ وضع احادیث میں گمراہ فرقوں کی چابکدستی۔

۳۔ اس دَور کے مشاہیر اہل حدیث کا تعارف۔

۴۔ تدوین حدیث میں محدّثین کی سرگرمی۔

اب ہم یکے بعد مندرجہ مباحث پر اظہار خیال کریں گے۔

محدثین و متکلّمین کے مابین نزاع اور حدیث پر اس کے اثرات:

محدثین اور عقلیت پسند متکلمین کے مابین جو دینی اصول و عقائد کو عقل کی ترازو میں رکھ کر تولنے کے عادی تھے بصرہ میں پہلے پہل اختلافات کا ظہور اس وقت ہُوا جب واصل بن عطا متوفی ۱۳۱ھ اپنے استاد حسن بصری سے الگ ہو گیا اور ایسے اصول وضع کرنے لگا۔ جو حسن بصری اور علمائے سلف کے خلاف تھے۔ اسی وقت سے واصل کے متّبعین کو معتزلہ (الگ ہو جانے والے) کہا جانے لگا۔ واصل کے بعد رؤسائے معتزلہ میں سے مندرجہ ذیل اصحاب ظہور پذیر ہوئے۔

۱۔ عمرو بن عُبید متوفّی ۱۴۳ھ۔

۲۔ ابو الہُذیل علّاف متوفیٰ ۲۳۵ھ

۳- نظام متوفی ۲۲۱ھ۔

۴- بشر مریسی ۲۱۸ھ

۵- عمرو بن بحر الجاحظ ۲۵۵ھ

۶- ثمامہ بن اشرس۔

و دیگر اکابر معتزلہ۔ یہ لوگ متعدد دینی اصول وعقائد میں جمہور کے خلاف تھے۔ ان میں سے اہم دو مسئلے تھے۔

افعال العباد: معتزلہ کا موقف یہ ہے کہ افعال العباد بندوں کے پیدا کردہ ہیں اللہ تعالیٰ کے نہیں۔ اور اسی لیے بندے اپنے افعال کی بنا پر جزا و سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ بخلاف ازیں جمہور اہل اسلام یہ کہتے ہیں کہ افعال العباد اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ البتہ کسب و اختیار سے وہ بندوں کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔

۲- صفات باری تعالیٰ: صفات کے بارے میں معتزلہ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ صفاتِ خداوندی اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہیں۔ مثلاً سمع و بصر و حیات و قدرت اور کلام کی صفات کو اگر ذاتِ الٰہی کے ساتھ قائم مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ خود قدیم ہے۔ اسی طرح یہ صفات بھی قدیم ہوئیں۔ اس طرح قدماء کا تعدّد لازم آئے گا۔

بخلاف ازیں جمہور اہل اسلام کہتے ہیں کہ مذکورہ صفاتِ الٰہی قدیم اور قائم بذاتہٖ ہیں۔ نہ یہ عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات۔

معتزلہ اور جمہور کے مابین صفات الٰہی کے بارے میں جو اختلاف رُونما ہُوا تھا، اس کے بطن سے ایک اور اختلاف نے جنم لیا۔ وہ یہ تھا کہ آیا قرآن کریم جو کہ کلام الٰہی ہے قدیم ہے یا حادث؟ جمہور اہل اسلام قرآن کو اس لیے قدیم کہتے تھے کہ قرآن کلام الٰہی

ہے جو صفت خداوندی ہے اور صفات باری تعالیٰ قدیم ہیں۔ اس کے برخلاف معتزلہ کا انداز فکر یہ تھا کہ باقی مخلوقات کی طرح قرآن کریم بھی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کے حروف و اصوات کو ایک حادث جسم میں پیدا کر دیتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے یہ اصوات سُن لیتے تھے۔

معتزلہ عقلیت کے جذبہ سے مغلوب تھے۔ اور تمام دینی عقائد و احکام میں عقل ہی کو حُکم مانتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی جسارت کا یہ عالم تھا کہ جس حدیث کو بھی اپنے عقائد سے متصادم دیکھتے بڑی آسانی سے اس کو رد کر دیتے۔ اِلّا یہ کہ اس حدیث کی کوئی تاویل ممکن ہو۔ قطع نظر اس سے کہ وہ تاویل حق و انصاف سے کسی قدر بعید ہی کیوں نہ ہو۔ مگر حق یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری سے قبل متکلمین عوام میں اپنے نظریات کا اظہار نہ کر سکے۔ بلکہ وہ عوام کی گرفت سے خائف و ہراساں تھے۔ اسی طرح خلفا میں سے بھی ایسا کوئی نہ تھا جو جمہور اہل اسلام کے خلاف معتزلہ کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ جب تیسری صدی ہجری کا دور آیا اور خلیفہ مامون رشید (۱۹۸ — ۲۱۸ھ) مسند خلافت پر فائز ہُوا تو اس نے متکلمین کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ خلیفہ مامون حریتِ فکر و نظر کا دلدادہ اور مناظرہ کا شائق تھا۔ اس وقت سے عظیم آلام و حوادث رُونما ہونے لگے۔ اور متکلمین و محدثین کے مابین معرکہ کارزار گرم ہو گیا۔

خلیفہ مامون طبعاً علم و فضل کا دلدادہ اور کتاب و سنّت کا جیّد عالم تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ حد درجہ کا ذہین و فطین تھا۔ خلیفہ مامون موطا امام مالک کا سماع کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں خلیفہ منصور اور ہارون الرشید نے جو مختلف فلسفیانہ کتب کا عربی میں ترجمہ کروایا تھا، ان کی مدد سے حکمائے فارس اور فلاسفۂ یونان کے افکار و آراء سے بھی آگاہ ہو چکا تھا۔ جب مامون سریر آرائے خلافت ہُوا۔ تو اس نے روم سے فلسفہ کی کتابیں منگوا کر ان کے عربی ترجمہ کا حکم دیا۔ اور اس پر زرِ کثیر صرف کیا۔

حتیٰ کہ مامون کا دورِ عباسی خلافت میں علم و فضل کے اعتبار سے یکتا و منفرد ہو گیا۔ سب لوگ علم کے دلدادہ اور علمی کتب کے شائق تھے۔ خصوصاً جب کہ ان کا خلیفہ علم کا قدرداں اور علماء کی قدر و منزلت کرتا تھا۔

خلیفہ مامون برسرِ اقتدار آیا تو اس نے دیکھا کہ علماء کے دو فریق باہم نبرد آزما ہیں۔ محدثین و متکلمین کے درمیان خصوصاً معرکہ بپا ہے۔ اس نے چاہا کہ متکلمین اصحاب الحدیث اور اصحابِ فقہ کے علماء کو بلا کر ایک مجلس مناظرہ منعقد کی جائے۔ اس مجلس میں متنازعہ فیہ مسائل پیش کیے جائیں اور جب وہ کسی ایک پر متفق ہو جائیں تو لوگوں کو اس کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس طرح پوری اُمت کا شیرازہ بکھرا ہوا متحد ہو جائے گا۔ خصوصاً عقائد اور امامت کے بارے میں ان کے یہاں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ دُور ہو جائیں گے۔

چنانچہ مامون نے مناظرہ کے لیے علمی مجالس منعقد کرنے کا آغاز کیا۔ مامون کے رُو برو جو گرماگرم علمی بحثیں ہُوا کرتی تھیں، اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس نے بعض اختلافی مسائل میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور بعض اُمور میں معتزلہ کی حمایت کی۔ جن مسائل میں مامون نے معتزلہ کی حمایت کی تھی۔ ان میں سے ایک خلقِ قرآن کا مسئلہ بھی تھا۔ مامون نے ۲۱۲ھ میں کھل کر عقیدہ خلقِ قرآن کا اظہار کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ اس عقیدہ کا علانیہ اظہار کرے گا تو سب علما اس کے ساتھ متفق ہو جائیں گے۔ مگر مامون کی امید بر نہ آئی۔ بخلاف ازیں لوگوں نے اس پر نکتہ چینی کرنا شروع کر دی۔ اور اسے گمراہ قرار دینے لگے۔ بعض لوگ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے اور انھوں نے خلقِ قرآن کا عقیدہ رکھنے والوں کو کافر ٹھہرایا۔ اس وقت سے لے کر اہل الحدیث اور متکلمین کا نزاع شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ۲۱۸ھ میں مامون نے محسوس کیا کہ اگر اس نے اپنے مخالفین کو کیفرِ کردار تک نہ پہنچایا تو اس کی رسوائی ہو گی۔ چنانچہ اس نے اہل الحدیث

کو اپنے رائے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ہدفِ ظلم وجور بنانے کی ٹھانی۔

یاد رہے کہ اولین شخص جس نے خلقِ قرآن کے عقیدے کا اختراع کیا تھا وہ محمد بن درہم تھا جس نے ۱۲۰ھ کے کچھ بعد اس عقیدہ کا اظہار کیا۔ پھر جہم بن صفوان اور بعد ازاں بشر بن غیاث نے اس کی اشاعت کی۔ (تانیب الخطیب ص ۵۳)

خلقِ قرآن کا ابتلا: جب مامون صلح جوئی اور امن پسندی کے طریقہ سے مجالس مناظرہ منعقد کر کے علماء کے نزاع وجدال کو ختم نہ کر سکا تو اس نے جبراً محدثین وفقہا کو خلقِ قرآن کے عقیدے کا قائل کرنا چاہا۔ خصوصاً جب کہ انہوں نے اسے گمراہ قرار دے دیا تھا۔ خلاصہ یہ کہ خلقِ قرآن کے مسئلہ نے مامون کی قوت فکر ونظر اور اس کے نہایت گراں قدر اوقات کے کثیر حصہ کو رائیگاں کر دیا۔ اس کی حد یہ ہے کہ جب وہ رومیوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا، اس وقت بھی اس کا دماغ اسی الجھن میں گرفتار تھا۔

چنانچہ ۲۱۸ھ میں جب کہ مامون رومیوں کے خلاف معرکہ آرا تھا، اپنے عاملِ بغداد اسحاق بن ابراہیم خزاعی کے نام ایک خط میں لکھا جس میں تحریر کیا۔

"امیر المومنین (یعنی خود مامون) اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ عوام کالانعام ہوتے ہیں۔ وہ سوچ بچار اور قوت فکر ونظر سے محروم، بے بصیرت اور علم کی روشنی سے محروم ہیں۔ وہ جاہل اندھے اور گمراہ ہیں۔ دین کا فہم وادراک انہیں حاصل نہیں وہ نہ اللہ تعالیٰ کے قدر شناس ہیں اور نہ ہی اس کی معرفت سے بہرہ ور ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات میں فرق وامتیاز کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کو مساوی قرار دے رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن قدیم ہے اور خدا کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے۔

اور جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے وہ اس کی پیدا کردہ ہے جس طرح فرمایا۔

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ — اس نے تاریکی اور نور کو پیدا کیا۔

نیز فرمایا۔

نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ — ہم آپ کو وہ خبریں سناتے ہیں جو گزر چکی ہیں۔

اس آیت میں بتایا کہ اس نے پہلے چند واقعات کو رونما کیا اور پھر انہیں بیان کیا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ — اس کی آیات محکم اور مفصل ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کو محکم بھی بتاتا ہے اور مفصل بھی۔ اس لیے وہ اس کتاب کا خالق اور موجد ہے۔

یہ لوگ اپنے آپ کو سنت کی طرف منسوب کر کے اپنے آپ کو اہل الحق والجماعۃ اور دوسروں کو اہل باطل و کفر قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ فخر کرتے اور جہلا کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جھوٹے لوگوں کی ایک جماعت ان کی ہمنوا بن گئی ہے۔ یہ اُمت کے بدترین لوگ اور ابلیس کے بھائی ہیں۔

آگے چل کر مامون اپنے خط میں عامل بغداد کو حکم دیتے ہیں کہ تمام قاضیوں کو بلا کر میرا یہ خط سنائیے۔ ان کو بتا دیجئے کہ مجھے کسی کی مدد درکار نہیں۔ جس کے دین پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں بھی اس پر اعتماد نہیں کروں گا۔ اگر وہ اس کا اقرار کر لیں تو گواہوں کی موجودگی میں ان سے اس ضمن میں ایک دستاویز لکھوا لیجیے۔ جو قرآن کو مخلوق نہ کہے، اس کی شہادت قبول نہ کیجیے۔ قاضی جو پہلو بھی اختیار کریں اس سے مجھے مطلع کیجیے۔

بعد ازاں عامل بغداد کو مامون کے متعدد خطوط ملے جن میں اس نے خلق قرآن کے مسئلہ میں اہل الحدیث کا امتحان لینے کا حکم دیا۔ بعض خطوط میں لکھا کہ جو عالم قرآن کو مخلوق نہ کہے، اسے فتویٰ اور روایتِ حدیث سے روک دیجیے۔ اپنے عامل کو مکہ بھیجا کہ

جو شخص قرآن کے مخلوق ہونے سے انکار کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ مامون نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے بھائی معتصم باللہ کو وصیت کی کہ وہ بھی مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں اسی روش پر گامزن رہے۔

اگرچہ معتصم مامون کی طرح صاحب علم نہ تھا۔ مگر اپنے بھائی کی وصیّت کو پورا کرنے اور اہل الحدیث کے خلاف معتزلہ کی نصرت وحمایت کے نکتہ خیال سے اس نے مسئلہ خلق قرآن میں بڑی سختی سے کام لیا۔ اس نے قلمرو ئے خلافت میں یہ حکم صادر کیا کہ خلق قرآن کے مسئلہ میں لوگوں کو آزمایا جائے۔ اس نے معلّمین کو حکم دیا کہ بچوں کو خلق قرآن کے مسئلہ سے آگاہ کریں۔ اس نے بکثرت علما کو قتل کیا اور بے شمار اہل الحدیث کی تذلیل کی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ معتصم کے ظلم وجور کا خصوصی ہدف قرار پائے۔ انہوں نے خلق قرآن کے عقیدہ کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ معتصم کی موت تک امام احمد کی آزمائش کا سلسلہ جاری رہا۔ معتصم ۲۲۷ھ میں فوت ہوا۔ جب اس کے بعد اس کا بیٹا الواثق تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے از سرِنو اس فتنہ کو جگایا۔ ۲۳۱ھ میں اس نے امیر بصرہ کو لکھا کہ خلق قرآن کے مسئلہ میں ائمہ ومؤذنین کو آزمایا جائے۔ جو شخص اس عقیدہ کی مخالفت کرتا، وہ اس کو سزا دیتا بلکہ اس نے بعض اہل الحدیث کو قتل بھی کر دیا۔

عقیدہ خلقِ قرآن سے خلیفہ واثق کا رجوع: خلیفہ واثق نے خلق قرآن کے مسئلہ میں تشدد سے کام لیا۔ اس کے معتزلی وزیر احمد بن ابی دُوَاد نے اس ضمن میں خلیفہ کی مدد کی۔ یہ وزیر کہا کرتا تھا "جو قیدی قرآن کو مخلوق مانے، اسے چھوڑ دو اور اس کو دو دینار دو اور جو نہ مانے، اسے قید خانہ میں رہنے دو۔"

خطیب بغدادی لکھتے ہیں۔

"وزیر احمد بن ابی دُواد خلیفہ واثق پر چھا گیا تھا۔ اور اس کو تشدد پر مجبور کرتا تھا۔ یہ خلق قرآن کی دعوت دیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ سختی کرتے کرتے واثق کا جی اکتا گیا۔ اور عمر کے آخری حصہ میں اس عقیدہ سے توبہ کر لی۔

جب امام ابوداؤد و نسائی کے استاد محترم ابوعبدالرحمٰن بن محمد اذرمی کو لوہے کی بیڑیوں میں جکڑ کر ان کے علاقہ سے لا کر خلیفہ واثق کے سامنے پیش کیا گیا تو وزیر احمد بن ابی داؤد نے واثق کے روبرو ان سے خلقِ قرآن کے بارے میں دریافت کیا۔ شیخ کہنے لگے اے احمد! آپ نے خلق قرآن سے متعلق جو سوال کیا ہے، آیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم اس مسئلہ سے آگاہ تھے یا نہیں؟ وزیر نے جواب دیا "آگاہ تھے۔" شیخ نے کہا "کیا وہ بھی آپ کی طرح لوگوں کو اس عقیدہ کے قبول کرنے کی دعوت دیا کرتے تھے یا خاموش رہتے تھے"؟ وزیر نے کہا "خاموش رہے تھے۔" شیخ نے کہا "جب ان کے لیے خاموش رہنے کی گنجائش موجود تھی تو آپ کیوں خاموش نہیں رہ سکتے"؟ وزیر یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا اور کچھ جواب بن نہ آیا۔ خلیفہ واثق ہنس پڑا اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور بار بار یہ فقرہ دُہراتا رہا کہ "جب ان کے لیے خاموش رہنے کی گنجائش موجود تھی تو آپ کیوں کر خاموش نہیں رہ سکتے"؟ واثق نے حکم دیا کہ شیخ کو تین سو دینار دیئے جائیں اور ان کو وطن پہنچا دیا جائے۔ اس کے بعد کسی سے سختی نہ کی اور احمد بن ابی دُواد سے ناراض ہو گیا۔

خلیفہ متوکل ناصر سنّت: جب معتصم کا بیٹا متوکل باللہ اپنے بھائی واثق کے بعد ۲۳۲ھ میں سریر آرائے خلافت ہوا تو اس نے حدیث نبوی کی تائید و حمایت کا علم بلند کیا۔ اس نے خلقِ قرآن کے ابتلا کا خاتمہ کر دیا۔ محدثین کو دارالخلافہ "سامرہ" میں بلا کر انعامات سے نوازا اور انہیں صفات الٰہی اور رؤیت سے متعلق حدیثیں بیان کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ مشہور محدث ابوبکر بن ابی شیبہ

جامع رصافہ میں بیٹھ کر درسِ حدیث دینے لگے اور تیس ہزار تلامذہ آپ کے درس سے مستفید ہوئے۔ اسی طرح ان کے بھائی جامع منصور میں درس حدیث دینے بیٹھے اور ان کی مجلس میں بھی قریبًا اتنے ہی لوگ حاضر ہوئے۔ سب لوگ خلیفہ متوکل کو دعائیں دینے اور اس کی تعریف کرنے لگے۔ چنانچہ یہ مقولہ مشہور ہو گیا کہ

"اصلی خلفاء تین ہیں۔ (۱) مرتدین سے جنگ کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (۲) مظالم کو دور کرنے کے خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ۔ (۳) احیائے سنت اور جہمیہ کی تردید کے لیے خلیفہ متوکل باللہؒ" (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۷۲۔ تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۳۴۰ و تاریخ الامم الاسلامیہ للخضری ص ۲۷۹۔)

متکلمین کی جانب سے اہل الحدیث کی تحقیر: معتزلہ نے صرف خلفاء کو اہل الحدیث کے خلاف ابھارنے پر ہی بس نہیں کی تھی۔ بلکہ ان کے خلاف زبانوں کو بے لگام کر دیا۔ اور ان پر ہر قسم کی نکتہ چینی کرنے لگے۔ محدثین کی تحقیر کرتے اور ان کو احمق اور کم عقل کہہ کر پکارتے۔ متکلمین اہل الحدیث کی شان میں جو گستاخانہ کلمات استعمال کرتے تھے، تیسری صدی ہجری کے ایک عالم ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" کے مقدمہ میں اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔ ابن قتیبہ لکھتے ہیں۔

"خداوند کریم آپ پر رحمت فرمائے آپ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ متکلمین کس طرح اہل الحدیث کی توہین کرتے۔ اپنی تصنیف میں ان کی مذمت کرتے اور ان کو جھوٹی اور متناقض حدیثیں روایت کرنے والے ٹھہراتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ امت میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ لوگ فرقوں میں بٹ گئے اور باہمی تعلقات منقطع ہو گئے۔ مسلمان ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔ ہر فرقہ اپنے نظریات کے اثبات کے لیے احادیث سے احتجاج کرنے لگا۔ چنانچہ خوارج ان کی روایت کردہ